قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

مارچ 2016، قیمت -/15₹

ماھنامہ
اُردو دُنیَا
دھلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

عالمی اردو کانفرنس کی تصویری جھلکیاں

ماہنامہ
اُردو دُنیا
دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:18، شمارہ:03، مارچ 2016

مدیر : پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)
نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی

ناشر اور طابع
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارتِ ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

مطبع:
ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل
کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/15 روپے سالانہ -/150 روپے
Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025
فون:49539000 شعبۂ ادارت:49539009

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 26109746، فیکس:26108159
ای میل:sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ:110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد-500002
فون:040-24415194

مشمولات

اداریہ
ہماری بات 4

خطوط
آپ کی بات — قارئین کے خطوط 5

انٹرویو
مشرق میں ہم کو تانیثیت کی ضرورت نہیں: ترنم ریاض — شبنم افروز 7

کور اسٹوری
اردو صحافت کے دوسو سال ماضی، حال اور امکانات — شعیب رضا فاطمی 11

زبان و تعلیم
اقلیتی درس گاہوں میں نظامِ تعلیم: نصاب کی جدید کاری کی ضرورت — شاذلی حسن خاں 20

ادبی مباحث
اشاعتی سرگرمیوں کا مرکز: شہر حیدرآباد — مجید بیدار 23
بیسویں صدی کا ایک گمنام شاعر: علیم اختر مظفر نگری — محمد مستمر 27
سعادت حسن منٹو اور وائیکم محمد بشیر: ایک موازنہ — محمد سلیم پلسار کت 30

بابِ خواتین
پروین شاکر اور نسائیت کا نیا مزاج — فرحت یاسمین 32
اردو کا نسائی ادب اور خواتین قلم کار — نینا جوگن 34

مشعل
حضرت مخدوم جہاں شرف الدین یحییٰ منیری اور شہر بنگالہ سنارگاؤں — محمد منصور عالم 36

یادِ رفتگاں
انتظار حسین کی ناسٹلجیائی حسیت کے اجزا — نثار احمد ڈار 40
آہ! عابد سہیل — ریشماں پروین 44
اب راہِ صحافت کا وہ راہی نہیں رہا — احمد سہیل صدیقی 47

سلسلۂ صحافت
اردو صحافت میں خواتین کا حصہ — قمر جہاں 49
ادبی رسائل سے شہر ممبئی کا اٹوٹ رشتہ — مراق مرزا 52

ہماری مطبوعات
کرشن اور ہندوستانی مصوری — زبیر رضوی 54

فلم
بانکا فلمی نغمہ نگار: ساحر لدھیانوی — انیس امروہوی 56

تہذیب و ثقافت
تصوف و بھگتی تحریک: اشتراک و اختلاف کے پہلو — الف ناظم 61

صحت
پپیتا: طبی افادیت سے بھرپور ایک خوش ذائقہ پھل — عبدالناصر فاروقی 63

سائنس
انسانی نفسیات پر نباتات کے اثرات — رفیع الدین ناصر 66
زلزلے: اسباب و تدارک — عظیم اقبال 68

کتابوں کی دنیا
تبصرہ و تعارف 71

عالمی اردو نامہ
اردو نامہ — ادارہ 81

خبرنامہ
اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 82

ہماری بات

گذشتہ دنوں قومی اردو کونسل نے جس عالمی اردو کانفرنس کا اہتمام کیا تھا اس کا ارتکاز گو کہ اردو صحافت پر تھا مگر اردو زبان کے حوالے سے بھی کچھ ایسے نکات سامنے آئے جن پر اردو والوں کو غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ اردو نے جس سرزمین میں جنم لیا ہے وہاں اس کی زندگی کو کوئی خطرہ نہیں ہے کیونکہ اردو ایک ایسی زبان ہے جو صدیوں سے اپنی داخلی قوت اور توانائی کی وجہ سے نہ صرف زندہ ہے بلکہ اپنے علاقے اور دائرے کو وسیع کرتی جارہی ہے۔ اس حقیقت کے باوصف کہ اردو کا کوئی بھی جغرافیائی علاقہ نہیں ہے۔

دوسری بات یہ کہ اردو کی کوئی مستحکم معاشی بنیاد نہیں ہے اور نہ ہی اس کی کاروباری حیثیت ہے۔ اس کے باوجود اس زبان نے ہندوستان سے باہر کی بستیوں میں بھی نہ صرف اپنی موجودگی کا اندراج کرایا ہے بلکہ وہاں اردو اپنا جادو جگا رہی ہے اور اپنے جلوے بکھیر رہی ہے۔

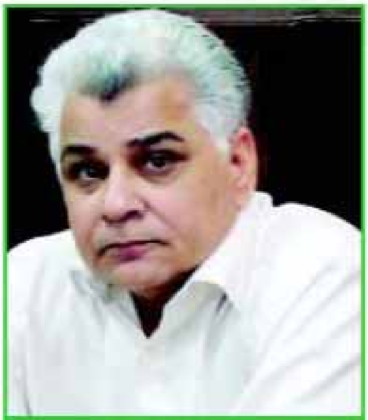

اب یہ بات طے ہے کہ اردو زندہ ہے اور زندہ رہے گی۔ یہ شاعروں اور ادیبوں کی کوئی گمشدہ زبان نہیں ہے بلکہ ایک زندہ زبان ہے اور اس نے ہر سطح پر اپنی زندگی اور زندہ دلی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ یہ کسی نہ کسی شکل میں نامانوس اجنبی علاقوں میں بھی اپنی جگہ بنا رہی ہے۔ پاپولر کلچر میں بھی اردو کو ایک نیا مقام مل چکا ہے۔ میڈیا میں بھی اردو کا استعمال بڑھ رہا ہے۔ ویب سائٹس اور چینلوں پر چلنے والے سیریل اور سوپ اوپیرا کے ذریعے بھی اردو کو فروغ مل رہا ہے۔ مشاعرے، قوالی اور دیگر ثقافتی پروگرام کے ذریعے اردو کا احیا ہو رہا ہے۔ اسے اردو زبان کی خوش بختی سے ہی تعبیر کیا جائے گا کہ پارلیمنٹ کی تاریخ میں سب سے زیادہ اشعار اردو کے ہی پڑھے گئے ہیں۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ اردو کو ہر سطح پر ایک نئی زندگی مل رہی ہے۔ اس کے بولنے والوں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے اور یہ زبان عوامی شعور اور شعار کا حصہ بنتی جارہی ہے اور روزمرہ کی گفتگو میں اردو کے الفاظ خاص طور پر شامل ہوتے جارہے ہیں۔ ہندی کے پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا میں بھی اردو کا استعمال عام ہوگیا ہے جو دونوں زبانوں کی قربت کا واضح ثبوت ہے۔ ماضی میں بھی دونوں زبانوں میں دوریاں نہیں تھیں۔ پہلے ہندی۔ اردو کا کوئی تنازعہ بھی نہیں تھا۔ ایک خاندان کی یہ دونوں زبانیں ایک دوسرے سے الفاظ اور احساس اخذ کرتی تھیں۔ خاص طور پر ہندی صحافت کی تاریخ پر نگاہ ڈالیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ پرانے زمانے میں جو ہندی صحافت ہوتی تھی اس میں زیادہ تر الفاظ فارسی اور ہندوستانی کے ہوا کرتے تھے۔ ہندی کا جو پہلا اخبار تھا اس کے ایڈیٹر جگل کشور کا تھوری ہندی اور سنسکرت کے علاوہ فارسی کے ماہر تھے اور ہندی کے اس پہلے اخبار 'اودنت مارتنڈ' کی خوبی یہ تھی کہ اخبار چھپتا تو دیوناگری میں تھا مگر اس کے الفاظ فارسی اور ہندوستانی کے ہوتے تھے۔ اسی طرح بنارس سے راجہ شیو پرشاد کا 'بنارس اخبار' دیوناگری میں چھپتا تھا مگر اس کے الفاظ فارسی کے ہوا کرتے تھے۔ اس سے یہ حقیقت تو واضح ہوہی جاتی ہے کہ اس زمانے میں اردو اور ہندی کی زندگی کا انحصار ایک دوسرے پر تھا۔ بلکہ پرانے زمانے میں تو ایسا بھی ہوا ہے کہ کچھ ایسے اخبارات شائع ہوئے جن کے ایک کالم میں اردو اور دوسرے میں دیوناگری ہوتی تھی۔ جیسی دھرکا "آب حیات"، پنڈت مکند رام کشمیری کا "گیان پردیپی پتریکا" اور اس طرح کے دوسرے اخبارات اس زمانے میں عام تھے جن میں ہندی اور اردو زبان کی کوئی تفریق نہیں تھی۔

آج کے پاپولر کلچر میں بھی کچھ ایسی ہی صورت حال ہے۔ ہندی فلموں میں بھی اردو اپنا مقام بنائے ہوئے ہے۔ بہت سی ہندی فلموں کے نام اور نغمے اردو میں ہوتے ہیں۔ جن مکالموں میں اردو کی شیرینی ہوتی ہے وہ مکالمے عوام میں زیادہ مقبول ہوتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عوام کے دلوں میں اردو کے لیے نہ صرف جگہ ہے بلکہ اس زبان کا احترام اور وقار بھی ہے۔ اس کے ساتھ ایک اور خاص بات یہ ہورہی ہے کہ اس زبان کے ساتھ جو ایک خاص لیبل لگا ہوا ہے وہ بھی ختم ہو رہا ہے۔ آج دنیا اس حقیقت کو تسلیم کر رہی ہے کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے بلکہ یہ ہمارے ملک کی گنگا جمنی تہذیب کی زبان اور مشترکہ وراثت ہے۔

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

آپ کی بات

■ ماہنامہ 'اردو دنیا' کا فروری کا شمارہ نہایت دیدہ زیب سرورق کے ساتھ پیش نظر ہے۔ اس میں اس بار ریاست پنجاب، بالخصوص یہاں کے اردو افسانوی ادب پر مرکوز تین اعلیٰ پائے کے مضامین ادارے نے قارئین کو بطور ہدیہ عنایت فرمائے ہیں اور آئندہ یہاں کی شاعری اور ناول نگاری جیسے مضامین کی شمولیت کی ضرورت کو نشان زد کرتے ہیں۔

معین الدین عثمانی صاحب نے مشرقی پنجاب کے اردو افسانوں پر ہندوپاک کی تقسیم کے اثرات بخوبی مرتسم کیے ہیں۔ مریم احمد صاحب کا مقالہ تنقید و تحقیق کی ایک بہترین مثال قائم کرتا ہے اور یہ ان ہی کا حصہ ہو سکتا ہے۔ اس مضمون میں منشی پریم چند کی کہانی کا نام 'دو بیل' (جن دونوں بیلوں کے ناموں پر ایک ہندی فلم 'ہیرا موتی' بھی بنی تھی) کا اصل نام 'دو بیلوں کی کتھا' ہی ہے۔ اس میں بھی دو بیلوں کے بہانے سے ہندوپاک کی تقسیم سے قبل انگریزوں کے متعدد مظالم و کسانوں کی اذیت ناک حیات کی عکاسی کی گئی تھی۔ تیسرا مقالہ سالک جمیل براڑ کا ہے۔ اس میں پنجاب میں اردو زبان اور اس کی تعلیم کے مرکز مانے جانے والے شہر مالیرکوٹلہ کے افسانوی ادب کا شاندار احاطہ کیا جا سکتا ہے۔

اگرچہ اختر کاظمی صاحب کا گوپال متل کے ادب پر مختصر مضمون اپنے موضوع سے کماحقہ انصاف کرتا ہے، تاہم ان کی پیدائش 11 جون سنہ 1909 کو مالیرکوٹلہ پنجاب میں ہوئی تھی اور ان کی وفات 15 اپریل سنہ 1993 کو ہوئی تھی، اس امر کا حوالہ دیا درکار تھا۔ اس بلند پایہ و مایہ ناز شاعر کے بطور ایک شاعر مقبولیت کے ضامن اس شعر کے حوالے کی کمی بھی بے طرح کھٹکتی ہے، جس سے کہ ان کی شناخت قائم کی جاتی رہی ہے۔ "مجھے زندگی کی دعا دینے والے ہنسی آ رہی ہے تری سادگی پر"

■ کرشن دیوک: گلی نمبر 20A، گوبند نگر، گلی نمبر 18K، پٹیالہ

■ اردو دنیا کا نئے سال کا پہلا شمارہ یعنی جنوری 2016 کا شمارہ اپنی امتیازی خصوصیتوں کے ساتھ موصول ہوا۔ اس کے حسب ذیل متعدد وجہ معلوماتی اور فکر انگیز مضامین زیادہ پسند آئے: اردو کا سورج کبھی نہیں ڈوبے گا، اردو میں دفتری و انتظامی وضع اصطلاحات کی ضرورت، جموں و کشمیر میں اردو صحافت، حالی کی شاعری میں 'ہندوستانیت'، ادبی تحقیق میں خاکہ تحقیق کی اہمیت، اردو تحقیق کے مسائل، عربی و اردو میں فکشن کا آغاز، نقد و نظر کے تحت: جگت موہن لال رواں کی شاعری، رام لعل کی حقیقت نگاری، صحت کے تحت: حقوق قلب تقاضا کریں۔

بہتر ہوتا اگر ادبی کوئز میں حضرت اکبر الہ آبادی، اردو کے جلیل القدر ادیب اور لافانی طرز نگارش کے مالک مولانا عبدالماجد دریابادی اور مصور غم راشد الخیری کا بھی نام ہوتا۔

■ ڈاکٹر محمد معظم شوالی: سابق ممبر راجیہ سبھا، نئی دہلی

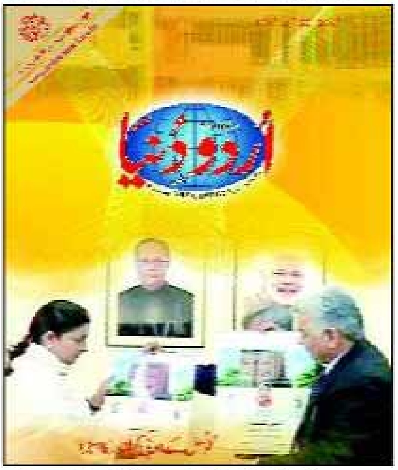

■ اس سال کے دونوں شمارے 'اردو دنیا' کے موصول ہوئے۔ جنوری کے شمارے کے سرورق اور آخری کور صفحے پر 18 ویں قومی اردو کتاب میلے کی تصاویر دیکھ کر آنکھیں روشن ہو گئیں۔ ہر عنوان کے تحت پیش کیے گئے مضامین کا انتخاب مناسب بھی ہے اور معلوماتی بھی۔ ادبی، تحقیقی، تاریخی، تہذیبی و ثقافتی مضامین کو ہم اکثر پڑھتے رہتے ہیں مگر صنعت و حرفت کے عنوان کے تحت 'مرادآباد کی پیتل صنعت' ڈاکٹر لیفی کا مضمون نہایت ہی معلوماتی ہے۔ ایک برتن یا شو پیس کو ہمارے گھروں تک پہنچنے کے لیے کتنے کاریگروں کے ہاتھوں سے گزرنا پڑتا ہے واقعی وہ ہاتھ قابل تعریف اور مبارک باد کے مستحق ہیں مگر اکیسویں صدی میں بھی ان کاریگروں کی طرز زندگی میں کوئی خاطر خواہ اضافہ نہیں ہوا ہے۔

فروری کا شمارہ ایک لحاظ سے اپنی نوعیت کا شمارہ ہے۔ معین الدین عثمانی صاحب کو چھوڑ کر جن قلم کاروں کے مضامین کا آپ نے انتخاب کیا ہے، وہ سب کے سب جوان نسل سے تعلق رکھتے ہیں مگر معین الدین عثمانی اور ان کی تحریر کی پختگی کا جوڑ نہایت ہی مناسب ہے۔ بانو سرتاج کا یہ کہنا کہ "بچوں کے لیے لکھنا بہت مشکل ہے" سچی بات ہے۔ بچوں کی نفسیات کو ایک مدرس سے بہتر کون جان سکتا ہے۔

ہر مضمون نگار نے اپنے اپنے مضمون کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ سالک جمیل براڑ کا مضمون 'مالیرکوٹلہ کا افسانوی سفر' تاریخی نوعیت کا ہے۔ ان کا ایک مضمون 'پنجاب میں اردو ادب بعد تقسیم' 'ہماری زبان' دہلی کے دو شماروں میں نظر سے گزر چکا ہے۔ وہ بھی تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ قمر جہاں کا اس شمارے میں 'برج بانو کا عاشق کنہیا لال کپور' اور جنوری 'آجکل' کے شمارے میں 'اداس نسلیں: ایک تجزیاتی مطالعہ' دونوں مضامین اچھے ہیں۔ ان کے قلم کی روانی اچھی ہے۔ حضور سہسوانی نے سہسوان رام پور گھرانہ کے استاد مشتاق حسین خاںؒ کے جن کمالات کا ذکر کیا ہے انھیں ہم کرشمہ قدرت ہی کہہ سکتے ہیں، بیسویں صدی میں ایسی دوسری مثال نہیں گزری ہوگی۔ ان کی چودہ سال کی عمر کا سنہ 1993 کمپوز ہوا ہے یہ کمپوزر کی غلطی ہو سکتی ہے وہاں 1893 ہونا چاہیے تھا۔ علی عباس نے 'سنت کبیر اور داؤد دیال' کا کلام گیتا اور قرآن کے حوالے سے خوب پیش کیا ہے۔ موجودہ دور میں عالم انسانیت کے لیے ایسے مضامین کی ضرورت ہے۔

ریحس فاطمہ کا مضمون 'دہلی کی اردو صحافت کا محسن وانی اکمل الاخبار' دہلی کو بھی گیا ہے۔ وطن کی آزادی کی خاطر صحافیوں نے کس طرح اپنی جانیں نثار کر دیں۔ آزادی سے قبل صحافیوں کے سامنے تین ہی مقصد تھے: وطن کی آزادی، قومی یکجہتی اور ادب کی خدمت۔ وہ آج کی طرح تجارتی ذہن کے مالک نہیں تھے۔ ہر شمارے کی طرح فروری کے شمارے کے دو عنوان 'عالمی اردو منظر نامہ' اور 'خبر نامہ' اردو کے سرگرمیوں اور معلومات کا خزانہ ہیں۔

■ ڈاکٹر شیدا آر ویشنو: اے 257، اندرا پوری، پرگتی کالونی، محل

■ جنوری 2016 کا تازہ شمارہ ملا۔ زیر نظر شمارے میں محبوب الرحمن فاروقی کی صحافتی خدمات سے متعلق پروفیسر ارتضیٰ کریم نے اپنے گراں قدر تاثرات پیش کیے ہیں۔

مرحوم محبوب الرحمٰن فاروقی کا شمار عہد آفریں شخصیات میں ہوتا ہے۔ موصوف کی عجز و انکساری آسمانی سربلندیوں کو چھوتی ہے۔ ماہنامہ 'آج کل' کی ادارتی تحریروں سے نہ صرف ان کے تبحر علمی کا ادراک بہ آسانی ہو جاتا تھا بلکہ ان کی ان تحریروں کے توسط سے ان کی علمی اور ادبی صلاحیتیں ان کا روشن شناخت نامہ بن کر عالم شہود پر آئی تھیں۔ موصوف گوشہ نشینی اور بوریا نشینی کے ساتھ ساتھ قلندرانہ طبیعت کے مالک تھے۔ 'آجکل' کے ادارتی فرائض سے سبکدوش ہونے کے بعد موصوف نے اپنے آپ کو اور اپنی فکر انگیز تخلیقی بصیرتوں کو اپنے ہی دل کے تہ خانے میں قید کر دیا تھا۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے اپنی التفات کریمانہ ان پر ڈال کر نہ صرف ان کی صحافتی خدمات کا اعتراف کیا ہے بلکہ اپنی علمی اور ادبی دیانت داری کا ثبوت دیا ہے۔

اردو شاعری کی وسیع تر سرسبز اور شاداب دنیا میں مرحوم جمیل الدین عالی کا نام اور کام بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ بالخصوص اردو دوہوں کے ذخیرے میں تاریخی حیثیت کا مالک ہے۔

قومی اردو کونسل میں مرحوم کی رحلت پر تعزیتی جلسے کا انعقاد بھی ایک ناقابل فراموش کارنامہ ہے۔ اپنے بڑے فن کاروں کا احترام کرنا اردو ادب کے شریف لوگوں کا دیرینہ وصف ہے۔ اس نیک وصف کی روشن کرنیں پروفیسر ارتضیٰ کریم کی شخصیت میں نمایاں ہیں۔

▫ **علیم صبا نویدی:** 266 [illegible]، چنئی

اردو دنیا کا جنوری 2016 کا رسالہ بہت اچھا تھا۔ خصوصاً زبان و تعلیم اور ادبی مباحث کے کالم عمدہ ہیں۔ میں ایک ملیالی ہوں لیکن میں اردو پڑھنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ اردو زبان ہماری اپنی زبان ہے۔ آج کل یہ زبان عالمی سطح پر مقبول ہو رہی ہے اور کبھی لوگ اسے اپنا رہے ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ اس زبان کی حفاظت کے لیے ہر ممکن کوشش کریں۔

▫ **محمد شفیق:** [illegible]

اردو دنیا کا نیا شمارہ ماہ جنوری 2016 موصول ہوا۔ گذشتہ کی طرح یہ شمارہ بھی مضامین کا حسین گلدستہ ہے۔ قارئین کے خطوط کا کالم خاص ہے۔ وہ اس لیے کہ یہ آئینہ ہے اردو دنیا کا۔ بہرکیف اداریہ میں بہت اچھے اور ضروری مسائل کا احاطہ ہے جن کا تعلق اردو زبان اور اس کی اشاعت سے ہے۔ بر دست فاروق اعظم قاسمی کا پروفیسر ظفر حبیب سے انٹرویو سامنے ہے۔ یہ انٹرویو اردو زبان کے ایک صاحب تصانیف کی خدمات کا تذکرہ ہے جس میں اردو کے موجودہ حالات پر بھی بحث ہے۔ اس بابت یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہزاروں، لاکھوں اور اطلاعات کے باوجود اردو کے قارئین گم ہوتے جا رہے ہیں۔ پروفیسر موصوف کا یہ کہنا کہ "اردو کا سورج کبھی نہیں ڈوبے گا" بجا اور درست ہے مگر عوامی سطح سے اردو کا سورج ڈوب چکا ہے۔ آندھرا پردیش، مہاراشٹر، کرناٹک اور بہار میں ابھی اس سورج کی کچھ روشنی باقی ہے۔ جموں کشمیر میں یا اردو صحافت، عربی اردو میں فکشن کا آغاز کے علاوہ محترم انیس امروہوی کا مقالہ ہندوستانی سنیما کا آخری مغل پسند آئے۔ اردو دنیا کا صفحہ 67 سے 98 تک ہندوستان بھر میں اردو سرگرمیوں کا شاندار تعارف ہے۔ چنانچہ اردو دنیا کا مہتاب ہے جس کی روشنی سے اہل اردو جلا پاتے ہیں۔

▫ **عبداللہ صلاحی:** 476، گریانہ، [illegible]

جنوری 2016 کا اردو دنیا موصول ہوا۔ ماشاء اللہ اردو دنیا رسالے کے مضامین بہت اچھے ہیں۔ 18ویں قومی اردو کتاب میلے کے بارے میں کور اسٹوری پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ فاروق اعظم قاسمی کا ظفر حبیب سے انٹرویو بہت معلوماتی اور حوصلہ بڑھانے والا ہے۔ ادبی مباحث اور دیگر کالم بھی خوب ہیں۔

▫ **محمد مصطفیٰ احمد:** [illegible]

نئے سال 2016 کا شمارہ اردو دنیا دیکھتے ہی آنکھوں میں چمک اور پُرمسرت ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ اس کی وجہ 'اردو دنیا' کے مدیر کونسل کے ڈائرکٹر جناب ارتضیٰ کریم صاحب کا تحریر کردہ اداریہ ہے۔ اداریے کا پہلا پیراگراف حوصلہ خضر کا پیدا اور اس مقام تک پہنچنے کا بہترین نمونہ کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کامیابی صرف مثبت سوچ و فکر و عمل سے ہی ممکن ہے۔ دوسرے پیراگراف میں موصوف نے بطور انتباہ کہا ہے کہ انسان مثبت و حقیقی قوتوں کی کشش کا شکار ہونے سے پرہیز کرے۔ یقیناً ایسے لوگ جو منفی ذہن رکھتے ہیں انھیں اتنی بڑی دنیا میں اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے۔ اسی بات کو اس طرح بھی کہا جا سکتا ہے کہ زندگی میں مشکلوں کا آنا Part of Life ہے اور ان مشکلوں سے مسکرا کر باہر نکل جانا Art of Life ہے۔

▫ **الحاج جمال اختر:** [illegible]

ماہ دسمبر 2015 کا شمارہ اردو دنیا بروقت موصول ہوا۔ سرورق پر اردو صحافت کی تشکیل و رفتار سے اندازہ ہو گیا کہ اس میں اردو صحافت کی تاریخ شامل ہے۔ ہر زمانہ میں صحافت کی اہمیت رہی ہے۔ مدیر صاحب نے اردو صحافت کے دو سو سال کا تفصیلی جائزہ اداریہ میں لیا ہے۔ قدیم معیاری اخبارات کی بازیافت کرنے اور اردو صحافت کا ایک انسائیکلوپیڈیا ترتیب دینے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔ بہت اچھا خیال ہے۔ اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ابھی سے اقدام کرنا ہوگا۔ پروفیسر اختر عباس کا انٹرویو معلومات سے بھرپور ہے۔ انھوں نے یہ کہا کہ سرسید کی تحریروں کو انگریزی میں ترجمہ کرنے کی شدید ضرورت ہے۔ یہ اس لیے کہ دیگر اہل وطن اس کو پڑھ کر سرسید کی شخصیت و کارناموں کا اعتراف کر سکیں۔ مولانا محمد حسین کے والد اولین شہید صحافی مولانا محمد باقر میں اسعد رضا صاحب نے جزئیات کے ساتھ مولانا محمد باقر کے کردار اور جذبہ حب الوطنی پر روشنی ڈالی ہے۔ گوشہ صحافت میں شامل مضامین صحافت کی تاریخ جاننے کے لیے اہم ہیں اور یہ گوشہ صحافت پر تحقیق کرنے والوں کے لیے نعمت سے کم نہیں۔ باقی مشمولات بھی ادب اور صحافت سے متعلق ہیں جو قاری کو نئی معلومات بہم پہنچاتے ہیں۔

▫ **ڈاکٹر محمد [illegible]:** پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج [illegible] آباد

نومبر 2015 کا شمارہ زیر نظر ہے۔ تمہاری بات محبت خوب اختر الایمان پر اچھا خاصا مواد ہے۔ نظم، نوری، بلاؤ کے اشعار بہترین ہیں۔ اختر الایمان کی نظم ایک لڑکا بہت پسند آئی۔ نئے بچے کھلونے، بستی کی گلیاں، تانگہ، ٹولیاں، پرندوں کی طرح مرا اختر ان موتیوں سونگوں وغیرہ گر کھونے سکے جیسے الفاظ کی تراکیب اس نظم کو پرکشش اور دلنشیں بناتے ہیں۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق پر مقالہ پر مغز ہے۔ 'کھلے کا مضمون ترے ہر شعر کا غالب' پُر لطف ہے۔ لیکن بے بہری معلومات اور مطالعہ میں شبہ ہو۔ مذکورہ مضمون میں مومن خاں مومن کا ایک شعر ہے:

کیوں سنیں عرضِ مضطرِ مومن   بت کسی کا خدا نہیں ہوتا

میں نے تو اپنی زندگی میں اس شعر کو ہر مرتبہ اس طرح لکھا ہوا چھپا ہوا دیکھا ہے اور پڑھا ہے۔ مصرعِ ثانی پر توجہ کی ضرورت ہے:

کیوں سنے عرضِ مضطرِ مومن   صنم آخر خدا نہیں ہوتا

دونوں جگہ مفہوم ایک ہی ادا ہو رہا ہے۔ دراصل شاعر کا اصل مصرع کس طرح ہے، معلوم ہونا چاہیے۔

فی الحال میرے پاس مومن کا دیوان تو نہیں۔ مہاراشٹر ایجوکیشنل بورڈ پونے کے تعلیمی نصاب میں صفحہ نمبر 106 پر مضمون اردو کی نصابی کتاب میں بھی یہ مصرعہ اسی طرح ہے:

صنم آخر خدا نہیں ہوتا

حبیب فارا کا مضمون 'مشترکہ تہذیب کے فروغ میں چشتی صوفیا کا حصہ' پُر مغز اور آج کے دور کی ضرورت ہے۔ 'فارہائے الجھوہ' بھی بہت خوب۔ اس سے منسلک اشعار سونے پہ سہاگہ۔ ہندوستانی فلموں میں اردو غزل کا جادو دلچسپ...

▫ **اشفاق [illegible]:** [illegible]

شبنم افروز

مشرق میں ہم کو تانیثیت کی ضرورت نہیں: ترنم ریاض

نئی نسل کی افسانہ نگار خواتین میں ترنم ریاض کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ وہ بیک وقت افسانہ نگار، ناول نگار، شاعرہ، مترجم اور تحقیق کار کی حیثیت سے جانی و پہچانی جاتی ہیں۔ وہ وسیع فکر رکھنے والی افسانہ نگار خاتون ہیں۔ انہوں نے انسانی رشتوں، میاں بیوی، اولاد والدین، انسان و جانوروں، بچوں اور بزرگوں کے درمیان تعلقات اور وابستگی کے انوکھے انداز اپنی کہانیوں میں پیش کیے ہیں۔ ان کے مسائل اور پریشانیوں سے پردہ اٹھایا ہے۔ اپنی تہذیب اور ثقافت سے ان کا دلی لگاؤ ان کے افسانوی صفحے پر بھی ظاہر ہوتا ہے۔ بچوں اور چڑیوں سے محبت کا بھی پتہ ان کے افسانے دیتے ہیں۔ ان کی تخلیقات میں ایک نرم و گداز آہنگ کی موجودگی دلچسپی کا سامان ہوتی ہے۔ ان کی کہانیاں آہستہ آہستہ بہنے والے پانی کی طرح مضبوطی کے ساتھ آگے بڑھتی ہیں۔ ان کے یہاں نہ مصنوعی رنگ ہے نہ بیکار کی فضا آفرینی، بلکہ فطری فضا میں ان کی کہانیاں تکمیل کی سرحد تک پہونچتی ہیں۔ موڑ بھی، ڈرامائی کش مکش اور تمام افسانوی اصولوں کا وہ مکمل خیال رکھتی ہیں۔ پیش ہے شبنم افروز سے ترنم ریاض کی خصوصی بات چیت:

شبنم افروز: آپ سائنس کی طالبہ تھیں، اردو زبان میں دلچسپی کس طرح پیدا ہوئی؟

ترنم ریاض: میں 6th یا 7th میں تھی، شش ماہی امتحان میں میتھ (ریاضی) میں فیل ہوگئی تھی۔ مجھے میتھ نہیں آتا تھا، میں رو رہی تھی۔ اس دوران ایک بڑا اداس سا شعر خود ہی ہوگیا تھا۔ اس میں بڑی غلطیاں ہوں گی، یہ بچپن کی بات ہے۔

بھول جا انجام شب کی تلخیاں
ہر سویرا ایک نیا آغاز ہے

یہ شعر خود ہی کیسے ہوگیا، مجھے نہیں معلوم۔ کسی طرح ابا جی تک یہ بات پہنچی۔ میری بڑی بہن بڑی ظالم قسم کی بہن تھیں۔ مجھ سے چھ سات سال بڑی تھیں۔ انھوں نے شکایت پہنچائی کہ دیکھیے، فیل نہ ہوں گی تو کیا ہوں گی، یہ دیکھیے شاعری۔ تو ہم نے سوچا، اب مار پڑے گی اور جانے کیا حال ہوگا۔ ان دنوں بچوں کو مارنا کوئی غیر شعوری حرکت نہیں سمجھی جاتی تھی۔ ہمارے ابا تو ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے لیکن امی ہماری کوئی لحاظ نہیں کرتی تھیں اور تھپڑ رسید کر دینا کوئی بڑی بات نہ تھی۔

ش ا: کیا کشمیر میں شاعری لڑکیوں کے لیے معیوب تھی؟

ترنم ریاض: نہیں ایسا نہیں ہے۔ کشمیر میں جو ہماری سب سے بڑی بزرگ صوفی شاعرہ للہ عارفہ جنھیں ہم کہتے ہیں، وہ للہ واکھ (اشلوک کی طرح سے دوہے کی طرح کی ایک قسم ہے) لکھا کرتی تھیں۔ کشمیری ہندو اور مسلمان انھیں للہ عارفہ کہتے ہیں اور ان کو تو ہاں رکھتے ہیں اور دیوی کی طرح پوجتے ہیں۔ رابعہ بصری تھیں اور ہماری دوسری خود مختار بادشاہ کی بیگم حبہ خاتون بہت اچھی شاعرہ تھیں تو اس لحاظ سے شاعری بہت معیوب نہیں مانی جاتی تھی۔ کیونکہ ساری خواتین موزوں طبع تھیں۔ وہاں شادیوں میں خواتین ہاتھ کے ہاتھ گڑھ کے شعر کہتی ہیں اور اس کے ساتھ رقص سا ہوتا ہے (ایک قدم آگے ایک قدم پیچھے) اور مل کے گاتی ہیں۔ ہاں البتہ چھپنا معیوب مانا جاتا تھا۔ عورت ذات کا نام نہیں آنا چاہیے۔ لیکن چونکہ ہمارے ابا پنجابی تھے اور ہماری دادی خود اس زمانے میں پرائمری ٹیچر تھیں۔ ہمارے دادا جان مشہور آدمی تھے۔ چودھری خدا بخش، وہ کشمیر کے وزیر وزارت تھے۔ ہری سنگھ کے دور میں یہاں آئے تھے۔ ان دنوں کشمیریوں میں تعلیم عام نہیں تھی۔ بہت کم تعلیم یافتہ لوگ تھے لیکن کئی سو سال کی غلامی کی وجہ سے اس میں بہت پیچھے ہوگئے تھے۔ اگر غلامی کا یہ دور نہ آیا ہوتا تو کسی ترنم ریاض کو کوئی چھپنے سے منع نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن چونکہ میرے ابا پنجابی تھے، پٹھان تھے۔

ش ا: پنجاب سے آپ کے آباواجداد کشمیر کیسے آگئے؟

ترنم ریاض: کیونکہ کشمیر میں تعلیم کا فقدان ہونے کی وجہ سے کشمیری لوگ اعلیٰ عہدوں پر فائز نہیں ہو سکتے تھے۔ غلامی کی وجہ سے ان میں تعلیم کا رواج بہت بعد میں ہوا۔ انھیں پیچھے دبا کر رکھا جاتا تھا۔ اسی لیے باہر سے پڑھے لکھے لوگ بلوائے جاتے تھے جن میں میرے دادا حضور چودھری خدا بخش بھی شامل تھے۔ ایک پوسٹ ہوا کرتی تھی جسے آپ کہہ لیجیے کمشنر، اسے وزیر وزارت کہا جاتا تھا۔ وہی مقرر ہوئے۔ ہماری والدہ کشمیری تھیں۔ ہمارے خاندان کا باہر آنا جانا لگا رہا۔ وہ لوگ گرمیوں میں یہاں آجاتے تھے اور سردیوں میں سیالکوٹ چلے جاتے تھے۔ انھوں نے اپنے بچوں کی شادیاں کچھ یہاں کیں اور کچھ پنجاب میں۔ ہماری ایک پھپھی تھیں وہ پنجابی تھیں، ان کا انتقال ہوگیا۔ امی ہماری کشمیری ہیں، پھپھیاں ہماری

پنجاب میں بیاہی ہیں، کچھ نیویارک میں ہیں، ایک نیوجرسی میں ہیں، کچھ اسلام آباد میں، لاہور میں ہیں، ہمارے خاندان کے لوگ ایسے بکھرے ہوئے ہیں۔

ش ا: اردو کی کون سی صنف آپ کو زیادہ عزیز ہے.....؟

ترنم ریاض: ایسا ہے جہاں تک کسی صنف کے عزیز ہونے کا تعلق ہے، فن کار کے لیے ساری ہی اصناف عزیز ہوتی ہیں۔ اگر آپ یہ دیکھیں جو بت تراش ہوتا ہے یا سنگ تراش، وہ پینٹنگ بھی پسند کرتا ہے۔ کبھی کبھی شعر بھی کہہ دیتا ہے۔ لیکن موزوں طبع ہونا الگ بات ہے اور فکشن لکھنا الگ بات ہے۔ اگر انسان طبع موزوں لے کر پیدا نہیں ہوتا تو وہ شعر موزوں نہیں کرسکتا۔ وہ پھر نثری نظم کہے گا۔ ہمیں یہ ساری اصناف عزیز ہیں۔ جب ہمارا کوئی پلاٹ بڑا کینوس مانگتا ہے تو ناول ہوجاتا ہے۔ پھر مختصر مانگتا ہے تو افسانہ ہوجاتا ہے اور چھوٹا سا چاہیے ہوتا ہے تو نظم ہوجاتی ہے۔ عزیز تو ہمیں یہ ساری کی ساری چیزیں برابر کی ہیں۔ بلکہ ناول و افسانے اتنی محنت کراتے ہیں پروف ریڈ کرکر کے آنکھیں خراب ہوجاتی ہیں انسان کی۔

ش ا: آپ نے اپنا پہلا افسانہ کب اور کون سا لکھا؟

ترنم ریاض: میرے خیال سے ابھی میں بہت ہی زیادہ چھوٹی تھی جب میں نے اپنا پہلا افسانہ لکھا تھا۔ میرے خیال سے اس وقت میں 7th یا 8th کلاس میں ہوں گی۔ ان دنوں مجھے ترنم فریدہ کہا کرتے تھے۔ یہ میرے مائیکے کا نام تھا اور میں نے اسی نام سے لکھا بھی تھا۔ بہت بعد میں گریجویشن کے بعد میری شادی ہوگئی۔ اس افسانے کا نام میں نے کچھ اور ہی رکھا تھا۔ لیکن جس اخبار میں وہ چھپا تھا (' آفتاب' اخبار نکلا کرتا تھا) اس میں انھوں نے کسی اور نام سے اسے شائع کیا تھا اور وہ میں نے ایک بڑے کنٹروورشیل (متنازع) سے ٹاپک (موضوع) پہ لکھا تھا۔ بچی سی تھی میں۔ میرے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جب کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دے دیتا ہے تو اس کے بعد ایک رسم ہوتی ہے یا پھر اسی شخص سے نکاح کرنے کے لیے ایک ضرورت ہوتی ہے، شرعی ضرورت جسے حلالہ کہا جاتا ہے، یہ سسٹم یا ضرورت میری سمجھ سے باہر تھی۔ میں نے وہ افسانہ اسی کے خلاف لکھا تھا۔ خلاف کیا تھا بلکہ ہم نے لکھا تھا کہ ایسی رسم کچھ اس طرح نہیں ہونی چاہیے تھی۔ لیکن مجھے اتنا معلوم نہیں تھا۔ 7th میں پڑھنے والا بچہ تو بیوقوف ہوتا ہے، میں تو ابھی بھی بیوقوف ہوں۔ تب مولویوں نے اس پر بہت شور شرابہ کیا۔ اخبار میں آیا کہ یہ کیا چھوٹے بچوں سے کہانیاں لکھواتے ہو، انھیں پتہ نہیں ہوتا۔ لیکن اتنی سمجھ ہمیں تھی کہ ہم نے ڈائریکٹ نہیں لکھا تھا۔ ہم نے عورت ہونے کے ناطے صنف نازک کی طرف سے ایک طرح کا احتجاج درج کیا تھا، کہ کیوں ایک معصوم بچی کا ایسا استحصال ہو۔ چھوٹی عمر میں شادیاں ہو جاتی تھیں۔ 17-16 سال کی عمر میں طلاق بھی، اس کے بعد اسے کسی دوسرے کا ہونا ہوگا پھر کہیں پہلا اسے قبول کرے گا۔ تو یہ بات ہمیں اچھی نہیں لگی۔ ابھی بھی نہیں لگتی ہے۔ لیکن ٹھیک ہے کہ یہ مرد کو سزا دی اللہ تعالیٰ نے کہ تم ایسا کرتے ہو تو تمھارے لیے یہ سزا ہے۔ اگر تم نے آنکھیں بند کر کے طلاق طلاق کہہ دیا تو تمھارے لیے یہ سزا ہے کہ وہ کسی اور کی ہوجائے، اس کے بعد وہ تمھاری ہوگی۔ یہ بات ہم کو ان دنوں سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

ش ا: کن افسانہ نگاروں نے آپ کو متاثر کیا؟

ترنم ریاض: مجھے کسی نے نہیں متاثر کیا۔ میرے افسانے میں کسی کا بھی رنگ نظر نہیں آئے گا۔ میں نے جان بوجھ کر کسی کو مسلسل نہیں پڑھا کہ کہیں اس کا اثر نہ مجھ میں آجائے۔ نہ ہی انگریزی کے افسانہ نگاروں اور نہ ہی دوسری لینگویجز کے جو انگریزی میں ترجمے کی صورت میرے پاس آئے۔ میں نے چھوڑ کر، رک رک کر پڑھا، تاکہ کسی کا کوئی رنگ مجھ پر نہ آئے۔ جس شوق سے میں تحریریں پڑھتی ہوں، وہ صرف وکیبلری (ذخائر الفاظ) بڑھانے کے لیے، اپنے املا کے لیے اور کہانی کا لطف لینے کے لیے پڑھتی ہوں۔ انداز و انداز میں مجھے کوئی دلچسپی نہیں اور کبھی نہیں چاہوں گی کہ کسی کا انداز مجھ پر طاری ہو یا خدا نا خواستہ حاوی ہو۔ میں اسے بہت بڑی بددیانتی سمجھتی ہوں، کہ افسانہ نگار نے اپنی ایک روش بنالی ہے اس پہ چل رہا ہے، اس پر ایک نئے افسانہ نگار کو اس کی نقل کر کے اس طرح لکھنا چاہیے، میرے نزدیک یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ اسے میں خالص سرقہ سمجھتی ہوں۔ جیسا کہ لکھا جاتا ہے، ہمارے نقاد لکھتے ہیں، آپ نے کئی بار پڑھا ہوگا کہ فلاں صاحب پر فلاں صاحب کا اثر ہے۔ یہ گناہ ہے میری نظروں میں، بددیانتی ہے، بے ایمانی ہے۔ ہم چاہتے نہیں ہیں کہ کسی کا اثر ہم پر ہو۔ لیکن پسند ہم بہت لوگوں کو کرتے ہیں۔ اردو ادب میں، فکشن میں قرۃ العین حیدر سے بڑا کوئی رائٹر پیدا نہیں ہوا اور جیسا کہ کوشش کی گئی انتظار حسین کو ان کے برابر کا عظیم مانے جانے کی، لیکن آپ پڑھیں گی آگے چل کر یا آپ نے پڑھا بھی ہوگا، ان بلندیوں کو وہ نہیں چھو پائیں گے جو علم قرۃ العین حیدر کے پاس ہے، حالانکہ انتظار حسین خود دانشور ہیں، لیکن فکشن کے تعلق سے ان کی بلندیاں ایک الگ مقام رکھتی ہیں اور قرۃ العین حیدر کی عظمتیں الگ ہیں۔ ان کا ایک الگ طریقہ ہے، ایک الگ فیلڈ ہے، ان کا ایک الگ مقام ہے۔ اردو میں سب سے بڑی رائٹر میں انھیں (قرۃ العین حیدر) کو سمجھتی ہوں۔ انگریزی کے میرے فیورٹ رائٹر جیمس جوائس ہیں اور قرۃ العین حیدر کو اسی لیول

سوانحی کوائف

نام: ترنم فریدہ **قلمی نام:** ترنم ریاض

ولادت: 9 اگست 1963 بمقام سری نگر کشمیر

آبائی وطن: ترنم ریاض کا آبائی وطن سیالکوٹ (پاکستان) تھا۔ ان کے دادا خدا بخش خان ملازمت کی غرض سے کشمیر آئے اور ان کا خاندان یہیں آباد ہوگیا۔

شوہر: پروفیسر ریاض پنجابی (سابق وائس چانسلر یونیورسٹی آف کشمیر)

تعلیم: ایم اے (اردو)، ایم اے (ایجوکیشن)، پی ایچ ڈی (ایجوکیشن)

مشاغل: برقی میڈیا سے وابستگی، درس و تدریس، تحقیق

کتابیں: افسانوی مجموعے: یہ تنگ زمین (1998)، ابابیلیں لوٹ آئیں گی (2000)، یمبرزل (2004)، میرا رخت سفر (2008)، ناول: مورتی (2004)، برف آشنا پرندے (2009)، شاعری: پرانی کتابوں کی خوشبو، بھادوں کے چاند تلے (2015)، زیر سبزہ محو خواب (2015)

تنقیدی مضامین کا مجموعہ: چشم نقش قدم (2006)، اجنبی جزیروں میں (2015)

تحقیق: بیسویں صدی میں خواتین کا اردو ادب

ترجمہ: گوسائیں باغ کا بھوت (ہندی سے ترجمہ۔ سنو کہانی (ہندی سے ترجمہ)۔ ہاؤس بوٹ پر بلی (انگریزی زبان سے ترجمہ)

اعزازات و انعامات: ترنم ریاض کو ان کی ادبی و تخلیقی کاوشوں پر بہت سے انعامات و اکرام سے نوازا جا چکا ہے: افسانوی مجموعہ 'یہ تنگ زمین' پر اتر پردیش اردو اکادمی ایوارڈ (1998)، ادیب انٹرنیشنل ایوارڈ ساحر لدھیانوی (2005)، افسانوی مجموعہ 'یمبرزل' پر اردو اکادمی ایوارڈ، دہلی (2005)، فکشن ایوارڈ، اردو اکادمی، دہلی (2006)، افسانوی مجموعہ 'میرا رخت سفر' پر "Best book" اعزاز، کشمیر کلچرا اکاڈمی، سارک لٹریچر ایوارڈ برائے سال 2014

اس کے علاوہ ترنم ریاض کی کہانیوں اور شاعری کے مختلف ملکی و غیر ملکی زبانوں میں ترجمے ہوئے ہیں۔ مثلاً عربی، چینی، فرنچ، جرمن، پنجابی، ہندی، کشمیری، تامل، تلگو اور گجراتی وغیرہ۔ ان کی ادبی خدمات پر مختلف یونیورسٹیوں میں تحقیقی کام ہوئے ہیں اور بدستور ہو رہے ہیں۔

مستقل پتہ: C-11، جنگ پورہ ایکسٹینشن، نئی دہلی 14

پر رکھتی ہوں۔

ش ا: آپ کا معاصر خواتین افسانہ نگاروں کے بارے میں کیا خیال ہے؟

ترنم ریاض: ہم سے سینئر ہیں ذکیہ مشہدی صاحبہ، ان کی کہانیاں میں بہت پسند کرتی ہوں، بیلنسڈ لکھتی ہیں۔ ان کی کئی کہانیاں مجھ کو بہت اچھی لگتی ہیں اور کوئی مجھے لگتا نہیں ہے، جنھیں کوٹ (Qoute) کیا جائے۔ ہم سے پہلے کی جنریشن میں بہت بڑی بڑی افسانہ نگار پیدا ہوئی ہیں۔ عصمت چغتائی تھیں، واجدہ تبسم تھیں، یہ بڑے اہم نام ہیں۔ کچھ نام کمزور بھی ہیں اس میں، جسے میں کمزور نہیں کہہ سکتی، لیکن ٹھیک ہیں جیسے جیلانی بانو صاحبہ ہیں، وہ ٹھیک ہیں۔ آمنہ ابوالحسن ہیں، وہ بھی ٹھیک ٹھاک ہیں۔ لیکن جو فنی بلندیاں قرۃ العین حیدر نے حاصل کیں ان کے بعد عصمت چغتائی کو لایا جا سکتا ہے۔ واجدہ صاحبہ کے بعد ہم سے سینئر ذکیہ مشہدی صاحبہ یا کراچی میں زاہدہ حنا اور ایسے کچھ چند ہی نام ہیں، جو واقعی قابل ذکر ہیں اور جن کی کہانیاں کو نیبل نکل آئیں گی۔ ان کے پیراگرافس، ان کے پاس ایسے اقتباسات، ایسے پلاٹ، ایسی چیزیں ہیں جن پر آپ فخر سے کہہ سکیں گی کہ یہ اردو کے رائٹرس ہیں۔ باقی جو لوگ ہیں ان کے یہاں کچھ ایسی زبان ہے اور نہ ہی پلاٹ ہیں۔ اگر ہیں تو ادھر ادھر سے اڑائے ہوئے اور اٹھائے ہوئے ہیں۔ یا اچھی کہانیوں کی خراب سے خراب تخلیق قسم کے معاملے ہیں۔

ش ا: افسانہ لکھتے وقت آپ کن لوازمات کا خیال رکھتی ہیں؟

ترنم ریاض: اگر موضوع آپ کو Inspire نہ کرے تو آپ کیوں لکھیں گی۔ سب سے پہلی اہمیت تو موضوع کی ہے کہ آپ جس ٹاپک پہ لکھ رہے ہیں، آپ کیوں لکھ رہے ہیں؟ اس کے بعد آپ کو زبان کا خیال رکھنا ہے۔ آپ کو اس ماحول کا خیال رکھنا ہے۔ ان جزئیات کا خیال رکھنا ہے جہاں یہ افسانہ ہو رہا ہے۔ تاکہ آپ کا جو ریڈر ہے اسے یہ محسوس ہو کہ میں پڑھ رہا ہوں اور ان حالات کو میں دیکھ رہا ہوں۔ اور ایک اہم چیز جو ہے، جسے ہم اہم جانتے ہیں اور اپنی تحریروں میں اہمیت دیتے ہیں، وہ یہ ہے کہ آپ اپنے ریڈر کو بے وقوف مت سمجھیے۔ آپ کا ریڈر ذہین ہے، جو آپ کے افسانے پڑھ رہا ہے۔ میں گھسے پٹے مضامین کو کبھی نہیں لکھتی ہوں۔ میرا یہ دعویٰ ہے کہ جن موضوعات پر میں نے لکھا ہے ان موضوعات پر پہلے ایسے نہیں لکھا گیا ہے۔ کسی بھی لینگویج میں۔ ایک اہم بات یہ کہ کہانی آپ وہاں چھوڑ دیجیے جہاں سے آپ کا ریڈر، اپنے اندر ایک دوسری کہانی خود بنے۔ جیسے ہمارا ایک ناول 'مورتی' ہے۔ اس کا جو اختتام ہے وہاں ایک سنگ تراش آرٹسٹ خاتون ہے، جو پاگل ہو جاتی ہے۔ اس کا ایک فین (مداح) ہے اور اس کا شوہر ہے۔ شوہر اسے پاگل خانے بھیجنا چاہتا ہے اور فین اس کی بہت عزت کرتا ہے۔ اس سے عمر میں بہت چھوٹا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انھیں مجھے دے دیجیے، انھیں پاگل خانے مت بھیجیے۔ تو کیا کوئی شوہر اپنی بیگم کو کسی اور کو دے دے گا، چاہے بھلے ہی وہ پاگل ہے؟ کہ ہاں بھائی تم اس کی خدمت کرو تم اس کی نرسنگ کرو تم اسے ٹھیک کرو۔ یا کیا کسی شوہر کو اسے پاگل خانے بھیجنا چاہیے، جہاں استحصال ہوتا ہے اور یہ تو سب جانتے ہیں کہ وہاں خواتین محفوظ نہیں ہیں۔ یوروپ، امریکہ میں تو خدا جانے لیکن ہم نے تو انڈیا میں ہی دیکھا ہے کہ بہت بری طرح ٹریٹ کیا جاتا ہے۔ خاص طور سے خواتین کا استحصال کئی کئی طرح سے ہوتا ہے۔ تو یہ ایک سوال ہے جو میرا ریڈر سوچے گا کہ کیا اس آدمی کو اپنی بیوی کو گھر کے بجائے پاگل خانے بھیج دینا چاہیے، یہ نہیں سوچے گا کہ اس کا کیا حال ہوگا؟ اور اگر نہیں بھیجے گا تو گھر میں رکھ کر اس مرد کو دے دینا چاہیے؟ ہے تو وہ ایک نامحرم مرد۔ تو پھر یہاں سے ایک اور کہانی شروع ہوتی ہے، پنپتی ہے وقتی طور سے۔ تو ہم اس پر یقین رکھتے ہیں۔ یہ نہیں کہ راجہ رانی ملے، شادی ہو گئی، بچے نہیں ہو رہا تھا، درگاہوں پر گئے، مندروں پہ گئے، یاترا پہ گئے، اللہ نے انھیں بچہ دیا پھر اسے شہزادے سے عشق ہوا پھر شادی ہو گئی۔ اللہ اللہ خیر صلیٰ، معاملہ ختم۔

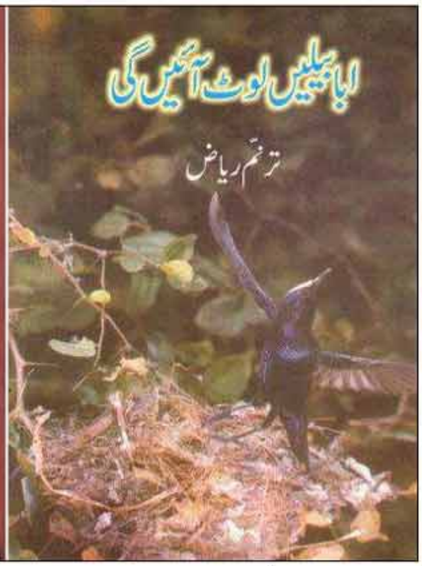

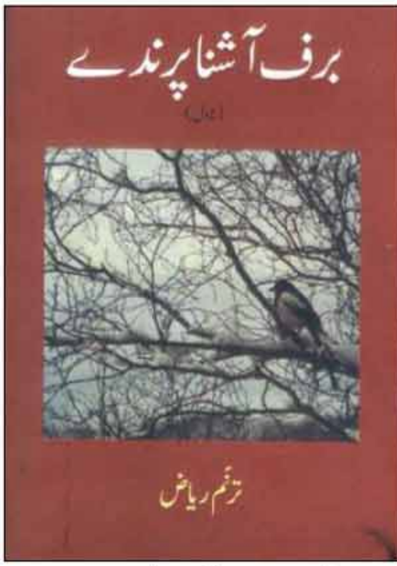

ش ا: اردو ادب میں تانیثی رویے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ترنم ریاض: دیکھیں جو ہماری مغرب کی تانیثیت ہے اس کی ابتدا اٹھارہویں صدی کے اخیر میں ہوئی۔ سنیکا فال میں وہ تحریک شروع ہوئی۔ پھر ان کو Right af Vote چاہیے تھا۔ ان دنوں خواتین ووٹ نہیں دے سکتی تھیں۔ اس کے بعد ان کو چرچ میں داخل ہونے دیا گیا۔ انھوں نے کہا کہ ہاں ٹھیک ہے۔ 80 سال کے بعد انھیں حق رائے دہندگی ملا۔ انھیں دنوں اردو میں بھی خواتین نے دھیرے دھیرے لکھنا شروع کیا۔ کسی نے والد کے نام سے ولد فلاں یا بنت فلاں صاحب یا ہماری ایک رائٹر تھیں، عابد حسین صاحب کی بیگم، صالحہ عابد حسین۔ تو وہ کئی تھیں، جیسے ہمشیرہ غلام سیدین وغیرہ۔ تو ایسے ناموں سے کئی اور بھی ہیں جو والدہ Something Something کے نام سے لکھتی تھیں۔ مگر تانیثیت بعد میں نعرہ بن گئی مغرب میں۔ جیسے سیمون دی بوار وغیرہ کو آپ دیکھیں، عجیب عجیب چیزیں ہیں اور Strange (عجیب) قسم کے نام سے عجیب عجیب چیزیں پیش کیں۔ وہی شروع کر دیا ہماری خواتین نے۔ فہمیدہ ریاض، کشور ناہید نے ایسی باتیں اور ایسی چیزیں لکھیں جو نہ عورت کے قلم سے اچھی لگیں نہ زبان سے اور اس برہنگی کو تانیثیت سمجھا۔ محض ان دو کا نام نہیں لے رہی کہ انھوں نے ایسا کیا بلکہ یہ تانیثائیں مانی جاتی ہیں۔ ان کے یہاں اچھی چیزیں ہیں۔ ایسا نہیں ہے، لیکن یہ تانیثائیں مانی جاتی ہیں۔ لیکن آس پاس کچھ اس طرح کی کوششیں ہونے لگیں کہ تانیثیت نعرہ بن کے رہ گئی۔ جبکہ مشرق میں ہم کو تانیثیت کی ضرورت نہیں۔ خدا نے، مذہب نے، ہماری مشرقی تہذیب نے، عورت کو بلند درجہ دیا ہے۔ جیسے یورپ امریکہ میں اولادیں 16-18 سال کے بعد گھروں سے نکل جاتی ہیں، وہاں ماؤں کی وہ عزت نہیں جو ہمارے یہاں ہمارے

معاشرے کی ہزاروں سال پرانی تاریخ یعنی اسلام آنے سے بھی پہلے ہماری قدیم ہندوستانی سنسکرتی جسے کہا جاتا ہے اس کی تہذیب نے ماں کو دیوی کا درجہ دیا۔ ہمارے یہاں تو عورت کا درجہ ہمیشہ اونچا رہا ہے۔ ہمیں تو ذرا سا سانس لینے کی جگہ چاہیے تھی۔ اس کو اگر آپ تانیثیت کہتی ہیں تو ٹھیک ہے یعنی کہ لڑکیوں نے لکھنا پڑھنا چاہا، انھوں نے اپنی خوشی سے Job کرنا چاہا، اتنی حد تک تانیثیت کو میں خوشی سے قبول کرتی ہوں۔ جس میں ہماری لڑکیاں آگے بڑھیں، کچھ کریں۔ اس لیے نہیں کہ انھوں نے پتلون ماکن لی، وہ مرد بن گئیں تو اس لیے وہ تانیثیت ہو گئی، یہ ہمارا نعرہ بن گیا۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔ آپ اپنی مشرقی تہذیب اور لباس میں رہ کر ابھی خاصی جدید ہیں اور ہمارا معاشرہ تو خود ہی عورت کو بہت عزت دیتا ہے۔ البتہ جہالت کی وجہ سے کچھ لوگوں نے اس کو غلط طریقے سے روا رکھا ہے۔ عورت کی عزت کرنا نہیں جانتے۔ اس کے لیے حضرات کو تعلیم دینے کی ضرورت ہے۔

ش ا : اپنی ازدواجی زندگی کے بارے میں کچھ بتائیں؟

ترنم ریاض: میری ازدواجی زندگی، اللہ کا شکر ہے کہ مجھے میرے میاں اتنے اچھے مل گئے کہ انھوں نے میری حوصلہ افزائی کی۔ میں ان سے اس وقت ملی تھی جب میں نے بی اے کیا تھا اور میں ایل بی کرنا چاہتی تھی۔ میں یونیورسٹی گئی ہوئی تھی۔ ان دنوں چھوٹی چیزیں میری اخبار میں آیا کرتی تھیں۔ ان دنوں میں ڈی ڈی میں نیوز پڑھتی تھی۔ انھوں نے کہیں دیکھا تھا مجھے، وہاں پھر دیکھا کہ ہم آئے ہیں تو ہمیں پہچان لیا اور کہنے لگے کہ آپ خبریں پڑھتی ہیں ریڈیو سے دوردرشن سے؟ میں نے کہا ہاں۔ باتوں باتوں میں میں نے تذکرہ کیا کہ لا (Law) کرنا چاہتی ہوں۔ کہنے لگے نہیں نہیں، آپ بی ایڈ کیجیے۔ تو میں نے کہا کیوں؟ کہنے لگے آپ ٹیچر بنیے۔ آپ کہاں عدالتوں میں دھکے کھاتی پھریں گی۔ بڑے لچے سے کاؤنسلنگ کی۔ مجھے نہیں پتہ تھا ان کی اندر سے نیت خراب ہے یا ٹھیک ہے (ہنستے ہوئے)۔ انھوں نے ہم سے کچھ نہیں کہا اور ہمارے یہاں بڑے شریفانہ انداز سے رشتہ بھیجا، اور شادی ہو گئی۔ لیکن ہم ان سے بہت خوش ہیں کہ اتنا اچھا شریک حیات ہمیں ملا۔ شاید، ہماری قسمت اچھی تھی۔ انھوں نے مجھے ابھارا۔ اگر وہ میری ہمت توڑتے تو تانیثیت کے سارے کے سارے نعرے دھرے کے دھرے رہ جاتے اور ہماری زندگی جہنم بن جاتی۔ لیکن انھوں نے ہر موڑ پر میرا ساتھ دیا۔ شادی کے بعد ہم نے پڑھائی کی۔ بی ایڈ کیا ایم ایڈ کیا اور اب پی ایچ ڈی کر رہی ہوں۔ اس کے بعد بہت لکھا۔ ہمارے دو بیٹے ہیں۔ ماشاء اللہ دونوں آرٹسٹ ہیں۔ ایک موسیقار ہے اور ایک فوٹوگرافر ہے۔ ہم نے اچھی اسکولنگ دی۔ اچھا کالج ہو، دونوں دہلی کالج آف آرٹ اینڈ کا مرس میں ہیں۔ ان پر کوئی بندشیں نہیں۔ ہم نے انھیں کھلا چھوڑ دیا۔ انھوں نے چاہا کہ ہم آرٹ لیں تو ہم نے ان کو آزاد چھوڑ دیا۔ میرے میاں حالانکہ خود اکیڈمیشین ہیں تو شاید یہ چاہتے ہوں گے کہ ہمارے بچے بھی اسی لائن میں آ ئیں مگر انھوں نے فن کی قدر کی جیسے انھوں نے میرے فن کی قدر کی۔

ان دنوں چھوٹی چھوٹی چیزیں میری اخبار میں آیا کرتی تھیں۔ ان دنوں میں ڈی ڈی میں نیوز پڑھتی تھی۔ انھوں نے کہیں دیکھا تھا مجھے ،وہاں پھر دیکھا کہ ہم آئے ہیں تو ہمیں پہچان لیا اور کہنے لگے کہ آپ خبریں پڑھتی ہیں ریڈیو سے دوردرشن سے؟میں نے کہا ہاں۔باتوں باتوں میں میں نے تذکرہ کیا کہ لا (Law) کرنا چاہتی ہوں۔کہنے لگے نہیں نہیں ،آپ بی ایڈ کیجیے۔ تو میں نے کہا کیوں؟کہنے لگے آپ ٹیچر بنیے۔ آپ کہاں عدالتوں میں دھکے کھاتی پھریں گی۔بڑے اچھے سے کاؤنسلنگ کی۔ مجھے نہیں پتہ تھا ان کی اندر سے نیت خراب ہے یا صحیح ہے (ہنستے ہوئے)۔ انھوں نے ہم سے کچھ نہیں کہا اور ہمارے یہاں بڑے شریفانہ انداز سے رشتہ بھیجا ،اور شادی ہوگئی۔

ش ا : خواتین فکشن نگار کی حیثیت مرد فکشن نگار کے سامنے کیا ہے؟ وہ خواتین فکشن نگار کے بارے میں کیا سوچتے ہیں؟

ترنم ریاض: وہ کیا سمجھ رہے ہیں، انھیں کہیے تا کہ ایک قرۃ العین حیدر پیدا کر کے دکھا دیں مردوں میں۔ آپ کے سوال کا بالکل آسان جواب ہے۔ پہلے تو آپ یہ بتائیے کہ کیا خواتین کم عاقل ہوتی ہیں۔ آپ نے نہیں دیکھا کہ گھروں میں مرد اکثر کچھ غلط ہونے کے بعد کہتے ہیں کہ تم نے کہا تھا میں نے نہیں مانا۔ بھائی کیوں نہیں مانے؟ کیونکہ اللہ میاں نے کیا تم کو کم عقل دی ہے خواتین سے؟ تو مرد بڑے معصوم ہوتے ہیں۔ جو میرا مشاہدہ ہے اللہ تعالی نے عورت کو بہت ذہین بنایا ہے۔ عورت قلم، ہو قلم اٹھائے یا چاہے چھینی ہتھوڑا اٹھا کے بت تراشے، وہ مرد سے کسی طرح کم نہیں ہے، اور بعض اوقات مرد سے آگے ہی ہوتی ہے۔ ایسے کئی نام آپ کو مل جائیں گے، پاپولر لٹریچر میں بھی اور کلاسیک لٹریچر میں بھی۔ جے کے رالنگ کا نام آپ نے سنا ہے، ابھی جو ہیری پاٹر کی اتنی کتابیں بکی ہیں، اس کی مصنف ایک خاتون ہیں۔ حالانکہ بیسٹ سیلر بک کو میں ادب کے زمرے سے تھوڑا سا یعنی بہت زیادہ کم تو نہیں لیکن وہ اہمیت نہیں دیتی ہوں۔ لیکن بہرحال انھوں نے جاسوسی کہانیاں لکھیں، ایک مرد کے نام سے وہ بھی کسی فکشن سے کم نہیں۔ تو دنیا میں دیکھیے، فنون لطیفہ کے کسی بھی زمرے کو دیکھیے، مردوں کا ایک معاملہ ہے کہ وہ دوستوں کے لیے لکھتے ہیں، کبھی تو وہ ان کے خلاف لکھتے ہیں، کبھی ان کے لیے لکھتے ہیں۔ عورتوں کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا۔ ابھی آپ آ ئیں، ہم نے آپ کے ساتھ کباب وغیرہ کھائے، آپ نے ہماری مدد کی کیونکہ ہماری کوک (Cook) چھٹی پر ہے لیکن ہمارے میاں ہوتے ان سے کوئی ملنے آتا تو وہ تو کچن میں نہیں جاتے۔ وہ کچھ منگوا لیتے یا آفس سے ڈرکر بلوا لیتے، کہ بھائی یہاں ایسے انتظام کر لینا ہمارا کوک نہیں ہے۔ لیکن خواتین کے کئی شعبے ہیں۔ انھیں محبت ہے رسوئی گھر سے، انھیں محبت ہے گھر کی سجاوٹ سے، انھیں محبت ہے خوشبوؤں سے، امن سے اور Peace سے۔ انھیں صرف اپنے قلم یا اپنے سے ہی محبت نہیں ہے۔ ان کے پاس سارے میدان ہیں۔ اس لیے ان کی تحریروں میں ان کی تخلیقات میں زندگی کے سارے تجربات نکھر جاتے ہیں۔ اسی لیے میں خواتین کو مرد سے بہت زیادہ ذہین سمجھتی ہوں اور ممتا ہونے کے ناطے ان کو قدرت نے اپنی ایک خوبی، ایک تخلیق کرنے کا جذبہ عطا کیا ہے۔ انھیں مائیں بناتے ہیں اللہ میاں۔ تو ماں بننا خود میں ایک اتنا بڑا تجربہ ہے، ایک ننھی سی جان کو پال پوس کر بڑا ہوتے دیکھتے ہیں۔ وہ آپ کو کتنا علم سکھا دیتا ہے۔ خود پالنا پوسنا اس لحاظ سے بھی خواتین آگے ہیں۔ اب آپ کہیں گی کہ اس کا مطلب ہے کہ سارے مرد بیوقوف ہیں اور ساری خواتین عقلمند، نہیں ایسا نہیں ہے۔ جو مرد فنکار ہیں وہ بھی بہت ذہین ہیں، وہ ممتا بھرے ہیں وہ بم نہیں بناتے، گولیاں نہیں بناتے وہ جنگ نہیں کرتے وہ امن کے خواہاں ہیں اور انھی کی وجہ سے دنیا قائم ہے۔

■

Shabnam Afroz, 232, Chandrabhaga Hostel, Jawaharlal Nehru University, New Delhi,110067
mob.7838306791
Email.afrozsonaljnu@gmail.com
Tarannum Reyaz, C-11, Jangpura Ext. New Delhi - 110014

شعیب رضا فاطمی

عالمی اردو کانفرنس

اردو صحافت کے دو سو سال

ماضی، حال اور امکانات

مرکزی وزیر برائے اقلیتی امور محترمہ نجمہ ہبت اللہ کے ساتھ ملکی وغیر ملکی مندوبین

کلکتہ سے بات شروع کروں، پٹنہ سے یا پھر کشمیر سے جہاں اردو صحافت کے دو سو سالہ جشن منائے جا چکے ہیں یا پھر گذشتہ ہفتے دہلی میں جس عالمی جشن صحافت کا اہتمام کیا گیا اس سے آغاز کروں... خوف یہ ہے کہ اگر دہلی سے قبل کلکتہ، پٹنہ یا کشمیر کی بات کروں گا تو بار بار دہلی میں منعقد کیے گئے سہ روزہ عالمی کانفرنس کے مناظر توجہ مبذول کرائیں گے اس لیے آیئے دہلی کی عالمی اردو کانفرنس کی بات پہلے کرلیتا ہوں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دنیا کا سب سے بڑا ادارہ اس لیے ہے کہ اس ادارے نے ہم عصر چیلنجز کا مقابلہ کرنے کے لیے خود کو تیار کیا ہے۔ اور تصنیف وتالیف کا کام ہو یا تحقیق وترتیب کا، پرنٹ میڈیا ہو یا الیکٹرانک میڈیا، کمپیوٹر ہو یا انفارمیشن ٹیکنالوجی یا پھر سوشل میڈیا۔ ہر سطح پر قومی کونسل اپنی موجودگی درج کراتی رہی ہے۔ دنیائے ادب میں ہر روز کے بدلتے منظرنامے سے خود آگاہی اور پھر اس کا پروگرام اور پالیسی کے طور پر نفاذ آسان مرحلہ نہیں ہے۔ لیکن قومی اردو کونسل کے وائس چیئرمین پدم شری جناب مظفر حسین جو وزیر برائے فروغ انسانی وسائل کی نمائندگی کرتے ہیں اور ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم جو تمام کارکنان کونسل کی سربراہی کرتے ہوئے نہایت خوش اسلوبی سے کشمیر سے کنیا کماری اور گجرات سے آسام تک اردو برادری کو حکومت ہند کی نوازشات سے روبرو کرارہے ہیں۔

'اردو صحافت کے دو سو سال' بھی اسی سلسلے کی ایک

کانفرنس کے دوران شائقین کا جم غفیر

ایم جے اکبر خطاب کرتے ہوئے

کڑی ہے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم جن کا سروکار کلاسیکل ادب سے غیر معمولی رہا ہے، اور دہلی سے شائع ہونے والے پہلے اخبار 'دہلی اخبار' کو ترتیب دینے کا کام بھی انھوں نے نہایت عرق ریزی سے کیا ہے ایسے میں آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اردو صحافت کے اس دو سو سالہ جشن کا محرک کیا رہا ہوگا۔

بات طویل ہوجائے گی لہٰذا آیئے ہم دہلی یونیورسٹی چلتے ہیں جہاں آرٹ فیکلٹی کے سامنے واقع سائنس بلاک کے آغاز میں ہی گیٹ نمبر 4 سے داخل ہوتے ہی بیس قدم کی دوری پر دائیں جانب ایک نیلے رنگ کا خوبصورت بورڈ آپ کو آویزاں نظر آئے گا جس پر سفید رنگ سے 'کانفرنس سینٹر' لکھا ہوا ہے۔ آپ جیسے ہی گیٹ کی طرف مڑیں گے تو آپ کو دو گارڈ ایک عورت اور ایک مرد یونیورسٹی گارڈ کی وردی میں چاق و چوبند کھڑے نظر آئیں گے۔ جب ان کی اجازت سے اندر داخل ہوں گے تو دونوں جانب نہایت نزاکت سے آراستہ کیا ہوا پائیں باغ ہے جس میں موسمی پھولوں کے گملے سبز گھاس کے حاشیے پر اس طرح سجائے گئے ہیں جیسے کسی دولہن کی ساڑی کا بارڈر ہو... لیکن آپ یہاں نہ ٹھہریں سامنے لابی کی طرف نظر ڈالیں تو ایلومینیم کے فریم میں جڑا شیشے کا دروازہ اپنی بانہیں کھولے مہمانوں کا خیر مقدم کرتا نظر آرہا ہے۔ لوگ جوق در جوق داخل ہو رہے ہیں۔ تل رکھنے کی جگہ نہیں۔ شائقین اردو کا جم غفیر ہے۔ لابی میں داخل ہوتے ہی سامنے کاؤنٹر ہے جہاں کونسل میں کام کرنے والی لڑکیاں نہایت تندہی سے ملک اور بیرونِ ملک سے آنے والے مہمانوں کا رجسٹریشن کرنے میں مصروف ہیں اور انھیں شناختی کارڈ دے رہی ہیں۔ دائیں جانب کتابوں کا کاؤنٹر ہے جہاں کونسل کی کتابیں بھی ہیں اور دہلی کے دیگر پبلشرز نے بھی اپنی اپنی کتابیں بطورِ نمائش رکھی ہوئی ہیں۔ بائیں جانب کانفرنس ہال ہے جس کے دونوں دروازوں سے لوگ آجا رہے ہیں۔ اندر 30x40 فٹ کا ڈھائی فٹ اونچا اسٹیج اور اس پر نہایت باوقار طریقے سے رکھی ہوئی چھ کرسیاں اور میز۔ کرسیوں کے پیچھے 20x16 کا ایک بیک ڈراپ جس پر جلی حرفوں میں 'عالمی اردو کانفرنس' تحریر ہے۔ اسٹیج کے دائیں اور بائیں دو پوڈیم، سامنے تقریباً آٹھ سے دس نفیس صوفے اور اس کے پیچھے ساڑھے تین سو کرسیاں۔

ابھی صرف دن کے ڈھائی بجے ہیں۔ افتتاحی پروگرام کا وقت تین بجے ہے لیکن زیادہ تر نشستیں پر ہوچکی ہیں۔ ہال کے داخلی دروازے کے سامنے کونسل کے وائس چیئرمین پدم شری مظفر حسین، ڈائرکٹر ارتضیٰ کریم، پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال، سیمینار کے کنوینر ڈاکٹر کلیم اللہ، شاہنواز محمد خرم، انتخاب عالم اور محمد عصیم خوش گوار موڈ میں گفتگو کررہے ہیں۔ یکایک پروفیسر ارتضیٰ کریم کے کسی جملے پر سب لوگ قہقہہ لگاتے ہیں اور لابی میں موجود زیادہ تر لوگ اس جانب متوجہ ہوجاتے ہیں۔

سامعین کا ایک منظر

احمد سہیل (امریکہ) نے اپنا مقالہ اردو کے دو عہد ساز ادبی جرائد 'ادب لطیف' لاہور، اور 'شاعر' ممبئی کے عنوان سے اپنا پیش کرتے ہوئے اپنے مقالے میں آزادی کے قبل سے شائع ہونے والے ان دونوں رسائل کا تفصیلی جائزہ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ان ادبی جرائد کے مشمولات اور ان کے ذریعے اردو زبان و ادب پر پڑنے والے اثرات کا بھرپور جائزہ لیا۔

ڈاکٹر ضامن جعفری (کناڈا)، نے اپنے طویل مقالے میں نہایت بے باکی سے اردو صحافت کی خامیوں کے ساتھ اس کی خوبیوں کا بھی ذکر کیا اور کہا کہ وسائل کی کمی اور مشکل حالات کے باوجود اردو صحافت کو اپنا جائز مقام حاصل کرنے اور برقرار رکھنے کے لیے اپنے سراپا کا ازسرنو جائزہ لینا ہوگا کہ کہیں اصل مقاصد کو پس پشت تو نہیں ڈال دیا گیا ہے۔

ڈاکٹر آصف علی عادل علی محمد، صدر شعبۂ اردو مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ ماریشس نے 'صحافت اور اردو صحافت کا جائزہ' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا اور کہا کہ ماریشس میں اردو صحافت انیسویں صدی سے لے کر آج تک جاری ہے۔ فی الوقت وہاں سے ایک رسالہ 'مہتاب' اور ایک اخبار 'صدائے اردو' شائع ہو رہا ہے۔

ماریشس سے آئی اردو صحافی تاشیانہ شمتالی نے 'اردو صحافت پر ایک طائرانہ نظر' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا اور کہا کہ صحافت کسی بھی ملک، قوم اور معاشرے کا عکاس ہوتی ہے۔ نیز اردو صحافت، قومی یکجہتی، باہمی اتحاد اور اخوت و بھائی چارے کے لیے وقف ہے اور یہ وہ اہم وجہ ہے جس کی وجہ سے اردو صحافت آج بھی وسائل کی کمی کے باوجود زندہ و تابندہ ہے۔

کچھ لوگ آگے بڑھتے ہیں اور پھر پانچ لوگوں کا یہ حلقہ بڑا ہوجاتا ہے۔ ایک نظر لابی پر ڈالیں ڈاکٹر زاہدالحق نظر آرہے ہیں جو سینٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد میں استاد ہیں۔ ان کے ساتھ پٹنہ سے تشریف لائے صفدر امام قادری اور پروفیسر علیم اللہ حالی بھی ہیں۔ ایک اور بڑا حلقہ ہے جس میں پٹنہ انقلاب کے ریزیڈنٹ ایڈیٹر احمد جاوید، ڈاکٹر قمر جہاں، سید احمد قادری اور جناب قاسم خورشید نظر آرہے ہیں۔ روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' کے گروپ ایڈیٹر فیصل علی بھی نظر آرہے ہیں اور ان کے ساتھ فیروز بخت، پروفیسر عین الحسن، ڈاکٹر ابرار رحمانی، ڈاکٹر عبدالرشید اور قمر تبریز کھڑے ہیں۔ تقریباً 10 ممالک سے تشریف لائے مندوبین میں زیادہ تر لوگ ہال کے اندر ہیں۔ ایک نظر ڈالیے وہ سامنے بنگلہ دیش سے تشریف لائے غلام ربانی ہیں اور ان کے ساتھ آصف علی عادل ہیں جو ماریشس سے آئے ہیں۔ ان کے ساتھ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پروفیسر شافع قدوائی ہیں اور وہیں آپ کو دو اور لوگ بیٹھے نظر آرہے ہیں۔ وہ کناڈا کے مہمان ضامن جعفری اور قطر کے مہمان عزیز نبیل ہیں۔ جاوید دانش بھی دور سے نظر آرہے ہیں۔ یکایک افراتفری ہوئی اور ڈائرکٹر سمیت تمام میزبان ہال کے صدر دروازے کی طرف تیزی سے بڑھنے لگے۔ معلوم ہوا کہ افتتاحی تقریب کے مہمان خصوصی اور ممبر آف پارلیمنٹ جناب ایم جے اکبر تشریف لا رہے ہیں۔ تین بجنے میں صرف پانچ منٹ باقی ہیں اور مہمانِ خصوصی آچکے ہیں۔ ان کے ساتھ ہال میں داخل ہو رہے ہیں قومی کونسل کے سابق ڈائرکٹر ڈاکٹر حمیداللہ بھٹ، پروفیسر ارتضیٰ کریم نے آگے بڑھ کر ان کا والہانہ استقبال کیا اور ہال کے اندر لے گئے۔ یکایک پوڈیم کا مائک جاگ پڑا اور مترنم آواز ہوا کے دوش پر سوار ہوکر چاروں طرف پھیل گئی اور لابی سمیت چاروں طرف بکھرے لوگ ہال میں جمع ہونے لگے۔

خواتین وحضرات! ایک بار اور آواز گونجی۔ یہ آواز پروفیسر چترا گپتا کی ہے جو افتتاحی تقریب کی نقابت

حیدر آباد سے تشریف لائے ڈاکٹر مختار احمد فردین نے 'اردو جرنلزم In the Present' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اخبار کا کام غیر جانب داری سے عوام کو حقائق سے آگاہ کرنا ہے اور آگاہی میں شدت پسندی پیدا کرنے والے الفاظ سے پرہیز کرنا چاہیے۔

ماریشس سے ہی تشریف لائیں محترمہ مہرین قادر حسین نے اپنا مقالہ 'ادبی رسائل اور خواتین کی خدمات' کے عنوان سے پیش کیا اور فرمایا کہ خواتین کے مسائل پر بیسویں صدی میں کئی اہم رسالے منظر عام پر آئے اور حقوقِ نسواں کے حصول میں معاون ثابت ہوئے۔ تانیثیت کی ابتدائی شکل بھی کہیں نہ کہیں ان رسائل میں ہی نظر آتی ہے۔

کناڈا سے تشریف لائے معروف ڈراما نویس اور شاعر جاوید دانش نے اپنا مقالہ '1913 میں شمالی امریکہ کا پہلا اردو اخبار 'غدر' پیش کیا اور کہا کہ امریکہ اور کناڈا میں اردو کا پہلا ہفت روزہ اخبار 'غدر' تھا۔ اور اس کی پیشانی پر آویزاں یہ نعرہ برطانوی راج کے خلاف کھلی بغاوت کا اعلان تھا۔ 'انگریز راج کا دشمن... بندے ماترم... ہندی جوانو! جلدی لو ہتھیار'، انھوں نے اپنے مقالے میں مزید فرمایا کہ اردو میں شائع ہونے والے اس اخبار کی آئیڈیالوجی خالص سیکولر تھی۔ بقول سوہن سنگھ بھکنا جو بعد کے دنوں میں پنجاب کا معروف کسان لیڈر بنا۔ ہم سکھ یا پنجابی نہیں ہمارا مذہب حب الوطنی ہے۔

شیخ منظور احمد نے اپنا مقالہ 'اردو صحافت کے دو سو سال' میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ دوسری جنگ آزادی کے درمیان درجنوں اخبارات نے اپنی موت پسند کی۔ ان کے ایڈیٹروں نے جیل میں رہنا گوارا کیا لیکن برطانوی حکومت کے سامنے جھکنا قبول نہ کیا۔ انھوں نے زور دے کر کہا کہ آزادی سے قبل اردو کے صحافیوں نے آزادی کی لڑائی لڑی تھی اور بعد از آزادی آزادی کو باقی رکھنے کے لیے لڑائی لڑ رہے ہیں۔

'ماضی کی اردو صحافت میں علما کا حصہ' اس عنوان سے مقالہ پیش کیا سہیل انجم نے اور نہایت وثوق سے کہا کہ اردو اخباروں کی پہلی غیر سرکاری ڈائرکٹری اختر شاہنشاہی کے مطابق اردو کا پہلا اخبار 1810 سے کلکتہ سے نکلا تھا۔ 'اردو اخبار' کے نام سے اسے ایک عالم دین اکرام علی نے نکالا تھا۔

مدراس سے تشریف لائے پروفیسر سید سجاد حسین نے 'تمل ناڈو میں اردو صحافت: ماضی و حال کے آئینے میں' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا اور کہا کہ تمل ناڈو میں اردو صحافت کا ماضی بے حد شاندار رہا ہے لیکن حال کو تابناک نہیں کہا جاسکتا۔ انھوں نے کہا کہ 1927 میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے ہاتھوں روزنامہ 'مسلمان' کا اجرا ہوا تھا اور وہ اخبار آج بھی مدراس میں اردو صحافت کی نمائندگی کرتا ہے جس کے مدیر سید عارف اللہ ہیں۔

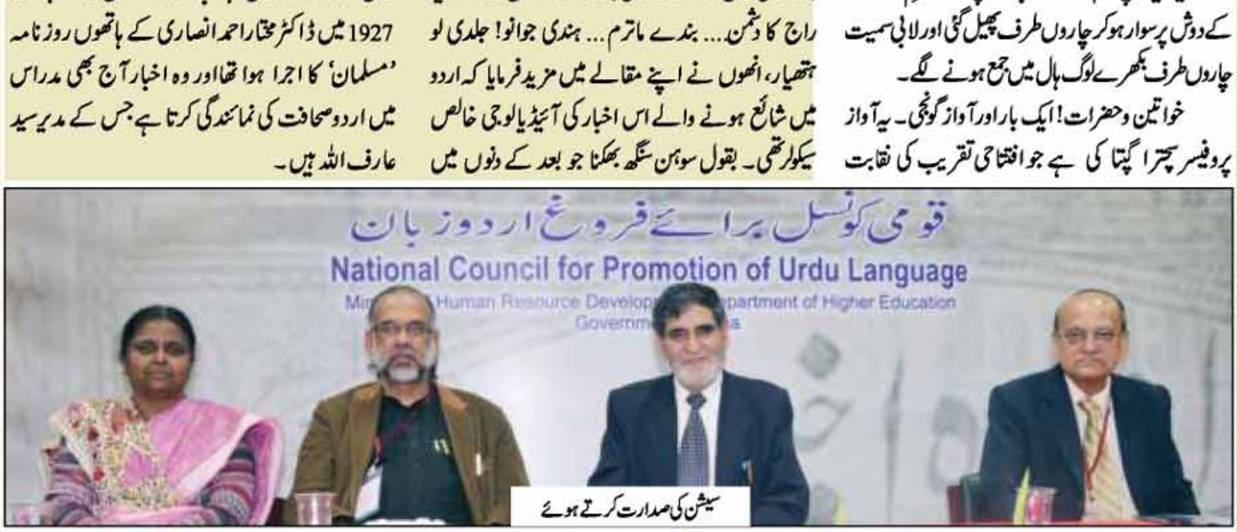

سیشن کی صدارت کرتے ہوئے

کررہی ہیں۔ دیکھتے دیکھتے عالمی کانفرنس کا اسٹیج معروف صحافی ایم جے اکبر، جناب پی اے انعامدار، کونسل کے وائس چیئرمین پدم شری مظفر حسین، ڈائرکٹر قومی کونسل پروفیسر ارتضیٰ کریم کے نشست سنبھالنے کے بعد بارونق نظر آنے لگا۔ پوڈیم پر موجود پروفیسر چترا گپتا نے اپنی مسحور کن آواز میں شمع افروزی کا اعلان کیا اور ڈائس پر موجود تمام مہمانان نے ایک ساتھ شمع افروزی کی رسم ادا کی۔ بعدازاں کانفرنس کے سووینیر کا اجرا بھی کیا گیا اور محترم ایم جے اکبر اور پی اے انعامدار کی خدمت میں قومی کونسل کا خوبصورت تھری ڈی مومنٹو پیش کیا گیا جس میں ان حضرات کی تصویریں نقش تھیں۔ مہمانوں کا استقبال کرنے کے لیے پوڈیم پر پروفیسر ارتضیٰ کریم تشریف لائے اور گویا ہوئے:

خواتین و حضرات!

عالمی اردو کانفرنس میں تمام مندوبین اور حاضرین کو خوش آمدید کہتے ہوئے مجھے بے حد مسرت ہورہی ہے۔ اردو کائنات کی یہ کہکشاں دیکھ کر آپ بھی یقیناً خوش ہورہے ہوں گے۔ مختلف ملکوں کے ماہتاب و آفتاب یہاں جمع ہیں۔ ستاروں کا جمگھٹا ہے۔ اپنے اپنے ذہنی موسموں اور بہاروں کے ساتھ تمام حضرات ایک ایسے رشتے کی بنیاد پر یہاں جمع ہوئے ہیں جو تمام سرحدوں کو مٹا دیتا ہے۔ یہ رشتہ زبان سے محبت کا ہے جس نے فاصلوں کو قربتوں میں بدل دیا ہے۔

ہم سب کو اس خوب صورت بزم میں اس زبان کی وجہ سے مل جل کر بیٹھنے کا موقع ملا ہے جس کی خوشبو صرف ہندوستان ہی نہیں پوری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے اور جس کی شیرینی اور مٹھاس نے پوری دنیا کو اپنا اسیر بنالیا ہے۔ یہ اردو زبان ہی ہے جس کی مقناطیسی کشش امریکہ، کناڈا، قطر، لندن، ڈنمارک، مصر، سعودی عرب، ایران، تاجکستان اور دیگر ملکوں سے تعلق رکھنے والوں کو یہاں کھینچ لائی ہے۔

کہتے ہیں کہ محبت کی زبان سب سے خوب صورت

پروفیسر شافع قدوائی نے اپنا مقالہ بعنوان 'نیا ترسیلی بیانیہ اور اردو صحافت' پیش کیا اور دلائل قائم کرتے ہوئے فرمایا کہ زبان، تصاویر اور دیگر بصری مواد کی اشاعت کی سطح پر اردو اخبارات نئے ترسیلی بیانیہ سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں اور جو اردو اخبارات کے خوش آئند مستقبل کا اشاریہ ہے۔

عبدالسلام عاصم نے 'اردو صحافت کا دو صدیوں پر محیط عہد بہ عہد سفر' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اردو اخبارات کی نمایاں تعداد اب خبر و نظر کے معیار پر ملک کی دوسری زبانوں سے کسی طرح پیچھے نہیں۔ تقریباً ہر اردو اخبار کی آن لائن اشاعت بھی موجود ہے۔

ممبئی سے تشریف لائے محمد وجیہ الدین جو ٹائمز آف انڈیا کے سینئر اسسٹنٹ ایڈیٹر ہیں نے 'موجودہ عہد میں اردو صحافت' پر اپنا مقالہ بہ زبانِ انگریزی پیش کیا۔

کوپن ہیگن ڈنمارک سے تشریف لائے نصر ملک نے اپنا مقالہ 'ماضی کے آئینے میں اردو صحافت کا موجودہ عکس' پیش کیا جس میں زیادہ تر توجہ پاکستان میں موجودہ صحافت کے تجزیے پر مبنی تھا۔ انھوں نے کہا کہ تجارتی مفادات و اقتدار صحافتی اخلاقیات اور پیشہ ورانہ رپورٹنگ کو برقرار رکھنے میں رکاوٹ بنی ہوئی

ہیں اور پاکستانی صحافی ان زنجیروں کو توڑنے کی سرتوڑ کوشش کررہے ہیں۔ اور اس میں بہت حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔

تمل ناڈو سے تشریف لائے ڈاکٹر امان اللہ ایم بی نے اپنا مقالہ 'تمل ناڈو میں مذہبی صحافت: ماضی و حال کی روشنی میں' پیش کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' کے گروپ ایڈیٹر شاہد لطیف جو ممبئی سے تشریف لائے تھے انھوں نے 'اردو صحافت اور امکانات' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا اور کہا کہ جدید ٹیکنالوجی کی فراہم کردہ سہولیات نہ صرف یہ کہ اہل اردو کو بھی میسر ہیں بلکہ انھیں جدید تر بنانے کی کوشش بھی جاری ہے۔ اردو اخبارات کو زبان کی صحت کے معیار اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ایجنسی کی خبروں کے بجائے اپنی خبروں پر انحصار انھی کی جستجو اور ان کو فوقیت دینا ایسے تقاضے ہیں جن کی تکمیل اردو صحافت کو مقبولیت کی نئی بلندیوں تک لے جاسکتی ہے۔ چونکہ اپنی خبروں کی جانب توجہ ہونے لگی ہے اور کئی اردو اخبارات اپنے نمائندوں کی خبروں کو اہتمام کے ساتھ شائع کرنے لگے ہیں اس لیے اردو صحافت کے امکانات وسیع ہوتے جارہے ہیں۔ اس سے یہ امید بھی پیدا ہورہی ہے کہ جلد ہی وہ دور بھی آئے گا جب اردو صحافت تحقیق و تفتیش کو خاص طور پر اہمیت دے گی جس کی کمی عرصہ دراز سے کھٹکتی رہی ہے۔

قطر سے تشریف لائے عزیز نبیل نے 'اردو کی ادبی صحافت کا تدریجی ارتقا' کے عنوان سے اپنا

سامعین مقالہ سماعت فرماتے ہوئے

ہوتی ہے اور اردو زبان کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ وہ محبت کی زبان ہے جس کے جادو نے دوسری زبانوں کے بڑے بڑے ذہنوں کو بھی متاثر کیا ہے۔ گارساں دتاسی ہوں یا جان گلکرسٹ، اشپرنگر ہوں یا ماسٹر رام چندر، رام بابو سکسینہ ہوں یا پنڈت دتاتریہ کیفی، پریم چند ہوں یا کرشن چندر، بیدی ہوں یا بلونت سنگھ۔ یہ سب اس زبان کے عاشق والہ وشیدا تھے۔

پروفیسر ارتضیٰ کریم خطاب کر رہے تھے اور ہال میں نشستیں پر ہوجانے کے بعد آنے والے شائقین زبان و ادب دیواروں کے ساتھ ساتھ کھڑے ہونے لگے تھے۔ جلسے میں شرکا کی تعداد توقع سے زیادہ تھی اور اس وجہ سے قومی کونسل کے ایک ایک فرد کے چہرے پر جو تھوڑی دیر پہلے تھکن کے آثار تھے وہ کافور ہوچکے تھے اور وہ پرجوش نظر آرہے تھے۔ ڈائرکٹر کا خطاب جاری تھا۔ وہ اس عالمی کانفرنس کی غرض وغایت بتاتے ہوئے فرمارہے تھے:

حضرات! اس سیمینار کا موضوع ہے 'اردو صحافت کے دوسو سال'۔ اس میں مختلف ملکوں کے دانشوران اپنے زرّیں خیالات کا اظہار کریں گے جن سے ہمیں اردو صحافت کے نشیب وفراز اور سمت و رفتار کو سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی۔

صحافت پر اس کانفرنس کو مرکوز کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہمارے ادبی بیانیے میں ایک مؤثر بیانیہ صحافت بھی ہے جس نے بڑے بڑے تخلیق کاروں کو صرف جنم نہیں دیا بلکہ شناخت بھی عطا کی ہے۔ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ اردو زبان وادب کے فروغ میں کلیدی کردار اردو صحافت کا ہی رہا ہے اور یہ بات کسی سے چھپی ہوئی نہیں ہے کیونکہ صحافت صرف ہمارے خیالات، تاثرات کا رشتہ عوام سے نہیں جوڑتی ہے بلکہ زبان کو نئے نئے پیرائے بھی عطا کرتی ہے۔ آج کی اس کانفرنس میں صحافت کے اسی کردار کے حوالے سے گفتگو ہوگی۔ گذشتہ دوسو سال سے اردو صحافت کن مسائل و مشکلات سے گزری ہے اور ٹکنالوجی کے نئے دور میں اردو صحافت نے مقالہ پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ ماضی کی ادبی صحافت کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ ان کے رسائل کے مدیران اعلیٰ درجے کے مصنف، شاعر، ادیب اور انشاپرداز کی حیثیت سے اپنی علاحدہ شناخت اور ادب کی دنیا میں نمایاں مقام رکھتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ ان باکمال اور قابل مدیران کی سرپرستی میں ادبی رسائل وجرائد نے اردو کی ادبی صحافت کو آسمان بنادیا۔

معروف ایڈوکیٹ اور سابق ایڈیشنل لیجسلیٹو کونسل و ڈائرکٹر حکومت ہند خواجہ عبدالمنتقم نے 'قانونی صحافت کی پیچیدگیاں' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا اور زور دے کہا کہ قومی کونسل جیسے اداروں کا فرض ہے کہ وہ اردو صحافیوں کو عدالتی کارروائیوں کے دوران قانونی اصطلاحات جو اکثر فارسی اور اردو میں ہوتے ہیں پر مشتمل ایک 'فرہنگِ اصطلاحات' فراہم کرائے تاکہ موجودہ صحافت کے لیے آسانی ہوسکے۔

بنگلہ دیش سے تشریف لائے ایسوسی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر محمد نصیرالدین نے 'اردو صحافت کا آغاز اور ارتقا' کے عنوان پر اپنا مقالہ پیش کیا۔

اردو کے معروف نقاد پروفیسر ابوالکلام قاسمی کے مقالے کا عنوان تھا 'ادبی رجحان سازی کے حوالے سے ادبی صحافت کے مسائل'۔ موصوف نے ادبی صحافت کے موجودہ منظرنامے کو غیراطمینان بخش قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ اردو کی ادبی صحافت کی عام صورتِ حال کو سائنٹفک اور منطقی بنیادوں پر نئے سرے سے تشکیل دینے، زبان وادب کے بڑے اداروں کو ادبی صحافت کے خدوخال کو درست کرنے، ادبی جرائد کو موثر بنانے اور زندہ ومتحرک ادبی اظہار کا رسائل کو پوری طرح وسیلہ بنانے پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

'آجکل' کے ایڈیٹر ڈاکٹر ابرار رحمانی نے 'اردو صحافت اور حکومت ہند' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا اور حکومت ہند کے ذریعے شائع سات رسائل ماہنامہ اردو دنیا، ماہنامہ بچوں کی دنیا، سہ ماہی فکر وتحقیق، ماہنامہ 'آجکل'، ماہنامہ یوجنا، ہفت روزہ روزگار سماچار اور پندرہ روزہ سینک سماچار' کا تجزیہ پیش کیا۔

ابوالکلام آزاد کا 'الہلال پہلی جنگ عظیم کے دنوں میں: ایک مطالعہ' کے عنوان سے مقالہ فرانس کے ایلین ڈی سولرس نے پیش کیا اور مولانا آزاد کے اسلوب، ان کے طنزیہ فقروں اور ان کی زبان دانی پر نہایت عالمانہ گفتگو بھی کی۔

ڈاکٹر سید محمد زین الحق شمسی (زین شمسی) نے اپنا مقالہ 'مسائل اور وسائل کے بھنور میں پھنسی اردو صحافت' کے عنوان سے پیش کرتے ہوئے کہا کہ نامساعد حالات کے باوجود آج بھی اردو صحافت اپنی شان وشوکت کے ساتھ رواں دواں ہے۔ اردو صحافت کا مستقبل اردو کے ساتھ منسلک ہے اس لیے اردو کو بچایئے، صحافت بچی رہے گی۔

سامعین مقالہ سماعت فرماتے ہوئے

کس طرح عصری چیلنجز کا مقابلہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ اردو صحافت کے اور بھی موضوعات ہیں جن کے حوالے سے اس کانفرنس میں مبسوط گفتگو ہوگی۔ ہمیں امید ہے کہ اردو صحافت کے دو سو سالہ سفر کا جائزہ لیتے ہوئے ہمارے سامنے بہت سے نئے نکات آئیں گے کیونکہ اس کانفرنس میں جو دانشوران ادب و صحافت اپنے مقالات پڑھیں گے ان میں سے بیشتر کا اپنا وژن ہے، اپنا زاویہ نظر ہے۔ مسائل کو دیکھنے اور پرکھنے کا اپنا انداز ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ان مقالات کی روشنی میں ہم اردو صحافت کی پوری تاریخ سے نہ صرف آگاہ ہوں گے بلکہ اردو صحافت کی مشکلات کے ساتھ ساتھ موجودہ عہد میں اس کی قدر و قیمت کا بھی صحیح طور پر اندازہ ہوگا۔

تالیوں کی آواز کے درمیان ڈائرکٹر کا استقبالیہ خطبہ ختم ہوا اور پوڈیم سے پروفیسر چترا گپتا نے مہمان خصوصی جناب ایم جے اکبر کو آواز دی۔ ایم جے اکبر نے اپنے خطاب میں فرمایا کہ:

اردو صحافت ہمیشہ عوام کے ساتھ جڑی رہی ہے۔ اس کا سروکار عام لوگوں کے دکھ درد سے رہا ہے۔ تحریک آزادی اور تحریک خلافت دونوں ہی میں اردو صحافت کا بہت ہی اہم رول رہا ہے۔ اردو صحافت مختلف نشیب و فراز سے گزری ہے۔ یہ کبھی جذبات کو بڑھانے کا ذریعہ بھی بنی تو کبھی جذباتیت کا شکار بھی ہوئی ہے۔ انھوں نے اردو صحافت کو درپیش مسائل پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اردو اخبار کی کوئی اکنامی نہیں ہے، کوئی اشتہار نہیں ہے۔ اردو کا اکنامک فاؤنڈیشن ہندی سنیما ہے جہاں اردو والوں کے لیے روزگار کے مواقع ہیں۔ ہمارا اکیسویں صدی کا ملک زبان کو تلاش کر رہا ہے۔ جس زبان کی اکانومی ہوتی ہے اس زبان کے لیے بہت ہی زمینیں ہیں۔ اس لیے اردو کو بھی اب مارکیٹ پالیسی کی ضرورت ہے۔ انھوں نے اردو زبان کی بقا اور تحفظ کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ جہاں پر اردو کی پیدائش ہوئی ہے وہاں اردو کا خاتمہ نہیں ہوسکتا۔ ایم جے اکبر نے اردو ہندی تنازعے کے

جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے معروف پروفیسر شاہد حسین

نے 'صحافیان صف شکن اور آزمائش دار و رسن' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا اور صحافت کی راہ پرخار کا نہایت خونچکاں منظر پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ دار و رسن کی تمام آزمائشوں کے باوجود صحافیان اردو 'لکھتے رہے جنوں کی حکایات خونچکاں' گو کہ اب انھیں بھلا دیا گیا لیکن جب بھی کوئی منصف مزاج تاریخ نویس، جنگ آزادی کی تاریخ لکھے گا تو اردو کے صحافیوں کو نظرانداز نہیں کرسکتا۔

'بنگلہ دیش میں اردو صحافت: ماضی اور حال' عنوان

تھا، بنگلہ دیش سے تشریف لائے ڈھاکہ یونیورسٹی کے پروفیسر محمد غلام ربانی کے مقالے کا۔ انھوں نے بنگلہ دیش میں اردو زبان و ادب کے ساتھ اردو صحافت کے نئے بال و پر نکلنے کا مژدہ بھی سنایا اور یہ یقین دلایا کہ آنے والے چند برسوں میں بنگلہ دیش کی اردو صحافت میں پھر ماضی کی رونق لوٹ آئے گی۔

'اردو صحافت اور صحافت نسواں' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا ڈاکٹر جمیل اختر نے۔

عالمی اردو کانفرنس میں بحرین سے تشریف لائے

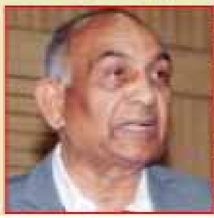

تھے ڈاکٹر شکیل احمد صبرحدی۔ موصوف کے مقالے کا عنوان تھا 'یوپی میں اردو روزنامے عصری منظرنامہ' جس میں انھوں نے اردو صحافت کو نامساعد حالات کا شکار بتایا اور کہا کہ صحافت اب خالص مشن نہ ہو کر تجارت ہوگئی ہے اور اردو والوں کو معاصر حالات کو اپنے قابو میں کرنا ہوگا۔

بنگلہ دیش کے ایک اور مقالہ نگار ڈاکٹر رشید احمد نے 'صحافت اور علمائے کرام' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا۔

قطر سے تشریف لائے احمد اشفاق نے 'اردو صحافت

کا عصری منظرنامہ' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ اردو اخبارات کے متعلق عوام کو ہمیشہ ایسا لگتا ہے کہ اردو اخبارات معیاری نہیں ہوتے یا ان میں اطلاعات ناقص ہوتی ہیں۔ حالانکہ ان چیزوں سے دوسری زبانوں کے اخبارات بھی بھرے پڑے ہیں مگر ہمارے اندر غیروں سے مرعوب ہونے کا رواج بھی عام ہے۔

گجرات سے آئے مقالہ نگار پروفیسر انور ظہیر کے

مقالے کا عنوان ہی نہایت بلیغ تھا 'اردو صحافت: بے انتہا مسائل، بے شمار امکانات' موصوف نے اس حوالے سے دلائل کے ساتھ نہایت اعلیٰ پائے کا مبسوط مقالہ پیش کیا۔

پاکستان کی صائمہ ارم نے اپنا مقالہ 'پاکستان میں اردو صحافت: مسائل اور امکانات' کے عنوان سے پیش کیا۔

دائیں سے پدم شری مظفر حسین، زبیر رضوی، اطہر فاروقی، ایلس

طلعت عزیز غزل سرائی کرتے ہوئے

حوالے سے کہا کہ یہ جھگڑا انگریزوں کا پیدا کردہ ہے۔ انھوں نے دو قوموں کے درمیان جھگڑے کی بنیاد ڈالنے کے لیے زبان کا سہارا لیا کیونکہ زبان جذبے سے جڑی ہوتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس وقت ہمارے سامنے سب سے بڑا چیلنج ماڈرنٹی کا ہے۔ ہمیں جمہوریت، صنفی مساوات اور معاشی مساوات کو مستحکم کرنا ہوگا تبھی ہم ملک کو مضبوط کر پائیں گے۔

عالمی کانفرنس کے افتتاحی اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے ایم اے آر کالج پونے کے چیئرمین جناب پی اے انعامدار نے کہا کہ ہمیں ٹیکنالوجی کی مدد سے اردو کو مزید آگے لے جانے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ آئین ہند میں مذہبی اور لسانی اقلیتوں کو صرف برابر کے حقوق ہی نہیں دیے گئے بلکہ کچھ اضافی حقوق بھی دیے گئے ہیں۔ بنگلہ دیش کی محترمہ کلثوم ابوالبشر نے ڈھاکہ کی اردو صحافت پر مختصراً روشنی ڈالی اور کہا کہ ہمارے ملک میں اردو صحافت کا آغاز 'المشرق' نامی اخبار سے 1906 میں ہوا تھا۔ افتتاحی سیشن میں شکریے کی رسم کونسل کے وائس چیئرمین پدم شری مظفر حسین نے انجام دی۔ انھوں نے کہا کہ اردو کا دوسرا نام ہندوستان ہے۔ اردو زبان کی اصل روح اس کا رسم الخط ہے جو حلیۂ خداوندی ہے۔ ڈائرکٹر قومی اردو کونسل پروفیسر ارتضیٰ کریم کو 'تمغۂ کونسل' کے عنوان سے لکھی نظم پر مشتمل ایک سپاس نامہ بھی پیش کیا گیا۔ پروفیسر چترا گپتا نے بہت ہی خوب صورت انداز میں نظامت کے فرائض انجام دیے۔ افتتاحی سیشن

پروفیسر محسن فراقی پاکستان نے 'عبدالماجد دریابادی باصول صحافت صاحب اسلوب طنز نگار' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا۔

پروفیسر مصطفی حسین ڈنمارک نے 'اردو صحافت کے چند ناخوشگوار پہلو' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا۔

ڈاکٹر سراج الدین نورمتوف نے 'ازبکستان میں اردو' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا۔

ملک محمد کامران یونس کا تعلق پاکستان سے ہے۔

موصوف نے اپنا مقالہ 'اردو صحافت ماضی میں' کے عنوان سے پیش کیا اور کہا کہ اردو صحافت کو اپنے آغاز سے لے کر عصر حاضر تک ایک معاشرتی ضرورت کا درجہ حاصل رہا ہے۔ ہر شعبۂ زندگی خواہ وہ حکومت ہو یا سیاست، تجارت ہو معیشت، طب ہو یا تعلیم، تاریخ ہو یا ادب، مذہب ہو یا معاشرت، تہذیب ہو یا ثقافت، اردو صحافت نے اس پر گہرے اور دور رس اثرات مرتب کیے ہیں۔ قومی و ادبی تحریکوں کی تشکیل، ترویج اور ان کی اثر پذیری نے بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ برصغیر پاک و ہند کی وہ شخصیات جن کا تذکرہ کیے بغیر ہندوستان کی تاریخ ادھوری رہے گی اردو صحافت سے وابستہ نظر آتی ہیں۔ اردو صحافت کی بدولت ان شخصیات کے معاشرتی رسوخ میں قابل ذکر اضافہ ہوا اور ان کی نادر صلاحیتوں کے باعث اردو صحافت تاریخ کے ماتھے کا جھومر بنی۔

ازبکستان سے تشریف لائے تاش مرزا خالمرزائف

نے 'اردو صحافت میں ہندی الفاظ کا مقام' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا، جس میں انھوں نے کہ کہا کہ اردو صحافت میں ہندی لفظوں کا استعمال عام سی بات ہے۔ اردو ایک فراخ دل زبان ہے جو دوسری زبانوں کے الفاظ کو اپنے اندر جذب کرنے میں کوئی قباحت نہیں محسوس کرتی۔ اردو کے اخبارات اس کی گواہی دیتے ہیں کہ ان اخبارات نے نہ صرف اردو بلکہ دوسری زبانوں کے ستی خیز الفاظ کو خود ہی اپنے دامن میں پناہ دی ہے۔

شائقین غزل سرائی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے

اسٹیج پر تشریف فرما شعرائے کرام

میں غیر ملکی مندوبین اور ہندوستان سے تشریف لائے مہمانان، دہلی کی تینوں یونیورسٹیوں کے اساتذہ وطلبا کے علاوہ معززین اور عمائدین شہر کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔

افتتاحی سیشن کے بعد شامِ غزل کا انعقاد کیا گیا جس میں مندوبین اور مہمانان مشہور غزل گلوکار طلعت عزیز کی دل پذیر گلوکاری اور منتخب غزلوں و نظموں سے محظوظ ہوئے۔

قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام اردو صحافت کے دو سو سال پر منعقدہ عالمی اردو کانفرنس کے دوسرے دن کے پہلے سیشن میں مرکزی وزیر برائے اقلیتی امور ڈاکٹر نجمہ ہپت اللہ نے کہا کہ زبان کو کسی بھی مذہب کے ساتھ جوڑنا زبان کے ساتھ ناانصافی ہے۔ انھوں نے اردو صحافت کی ذمے داریوں کے حوالے سے بھی گفتگو کی اور کہا کہ اردو کی اب کاروباری حیثیت نہیں رہی۔ اردو اخبارات کے پاس انڈسٹریل ہاؤس بھی نہیں ہے اسی لیے اس کی بقا کا مسئلہ بڑا اہم ہے۔ محترمہ نجمہ ہپت اللہ نے قلم اور زبان کی آزادی پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ہمیں ایک ایسا انٹرنل میکانزم تیار کرنے کی ضرورت ہے جس سے ہمیں اندازہ ہو کہ ہم صحیح یا غلط راستے پر جارہے ہیں۔ ایک غلط خبر بہت سے لوگوں پر اثر انداز ہوسکتی ہے۔ اس لیے اخبار والوں کی ذمے داری ہوتی ہے کہ خبر دیتے وقت وہ اس بات کا ضرور خیال رکھیں۔ انھوں نے دہلی یونیورسٹی کے کانفرنس ہال میں منعقدہ صحافتی عالمی اردو کانفرنس میں اردو زبان کے مسائل ومشکلات پر بھی روشنی ڈالی اور کہا کہ یہ بڑی عجیب بات لگتی ہے کہ کسی زبان کو اپنی بقا کے لیے جنگ لڑنا پڑے۔ انھوں نے کہا کہ اردو آج اس لیے زندہ ہے کہ وہ عوام کی زبان ہے۔ وہ عوام سے قلعۂ معلّٰی تک گئی تھی۔ جتنی وسعت اس زبان میں ہے کسی اور زبان میں نہیں ہے۔ محترمہ نجمہ ہپت اللہ نے یہ بھی اعتراف کیا کہ اردو زبان میں بڑی طاقت ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافتی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اردو صحافت کو مولانا نے نیا موڑ دیا اور 'الہلال' اور 'البلاغ' کے ذریعے اس جمود کو توڑنے کی کوشش کی جو اس وقت مسلمانوں پر طاری تھا۔

اس موقعے پر تعارفی کلمات ادا کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ اردو والوں میں بڑی صلاحیت ہے مگر وہ اپنی صلاحیتوں کا استعمال نہیں کر پارہے ہیں۔ ہم مثبت انداز میں اردو کے فروغ کے لیے کام کریں تو ہمیں اپنے خوابوں کی منزل ضرور مل جائے گی۔

تقریباً ساڑھے گیارہ بجے سے باضابطہ سیمینار کا سلسلہ شروع ہوا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ 6 اور 7 فروری کو پڑھے گئے تمام 37 مقالوں کے عنوانات سمیت ان کے اقتباسات آپ کے سامنے پیش کردیے جائیں تاکہ اس عالمی سیمینار کی ایک مکمل رپورٹ سامنے آجائے۔

واضح ہو کہ اس سہ روزہ سیمینار کے پہلے دن شام 6 بجے سے طلعت عزیز نے غزل سرائی فرمائی۔ جبکہ 6 فروری کی شام میں ایک عالمی مشاعرہ برپا کیا گیا جس میں جناب گلزار دہلوی، جناب جاوید دانش، جناب ضامن جعفری، جناب تحسین فراقی، جناب عزیز نبیل، ڈاکٹر زبیر فاروق، جناب اشفاق احمد، جناب اشفاق حسین، جناب راجیش ریڈی، جناب نواز دیوبندی، جناب حسن کاظمی، جناب پاپولر میرٹھی، جناب اقبال اشہر، جناب ذکی طارق، جناب حسن فیض آبادی، جناب ملک زادہ جاوید، جناب افضل منگلوری، جناب حنیف ترین، محترمہ نصرت مہدی، جناب شمس رمزی اور شعیب رضا فاطمی شریک ہوئے۔ نظامت کے فرائض جناب معین شاداب نے انجام دیے۔

7 فروری کی شام میں معروف ڈراما ڈائرکٹر اطہر نبی کی سرپرستی میں 'میں اردو ہوں' ڈراما پیش کیا گیا۔ اس ڈرامے کی خاص بات یہ ہے کہ 'اردو' اس میں خود اپنا کردار پیش کررہی ہے اور اپنے ماضی کی خوش حالی اور حال کے ہندوستان میں درد اور اردو کے ساتھ کی گئی ناانصافی کو بیان کررہی ہے۔ جبکہ اردو زبان کا درد بانٹنے کے لیے اس کے ہی خاندان والے اس کے ساتھ ہیں جس میں سنسکرت (امی جان)، فارسی (ابا جان)، ہمشیرہ (ہندی)، دادی جان (ترکی)، ماموں جان (پنجابی) اور اودھی بھی ہیں۔ یہ تمام زبانیں بھی ایک زندہ کردار کی شکل میں ہیں جو اپنی زبانی ہندوستان میں اپنی کسمپرسی بیان کررہی ہیں اور اردو کے ساتھ ہندوستان میں ہونے والے ناروا سلوک پر افسوس ظاہر کررہی ہیں۔ ڈراما میں

مہمان اردو مشاعرے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے

ڈرامہ ''میں اردو ہوں''

استعمال ہوئی نظم 'نرم شیریں بیاں، نازشِ گلستاں، یہ ہے اردو زباں یہ ہے اردو زباں' کو ایک صوفی کے کردار کے ساتھ درمیان میں ڈالا گیا ہے جو اردو کو اپنا ماضی و حال بیان کرنے میں مدد کرتا ہے۔ ڈراما کی پیش کش اور کرداروں کی اداکاری نے سامعین کو مسحور کردیا۔

'اردو صحافت کے دو سو سال: ماضی حال اور امکانات' کے عنوان سے منعقد عالمی سیمینار کا اختتام ہوا۔ یہ عالمی سیمینار 'دنیا ایک گاؤں' کی حقیقی تصویر پیش کرتا نظر آیا اور دارالسلطنت دہلی میں پوری دنیا سے آئے سفیرانِ اردو نے جس جوش و جذبے کے ساتھ شمولیت کی اس سے زیادہ محبت کے ساتھ اہالیانِ دہلی نے ان کا استقبال بھی کیا۔

صحافت کے جلو میں پروان چڑھنے والی زبان، اس کی قربانی اور ہندوستان میں جمہوری قدروں کی آبیاری کے لیے ہمہ تن مصروف اکابرینِ زبان کو مسلسل تین دنوں تک جس شد و مد کے ساتھ یاد کیا گیا اس کے لیے قومی کونسل کے ڈائرکٹر، وائس چیئرمین اور ان کے تمام رفقا قابلِ مبارک باد ہیں۔

ملک کے طول و عرض میں اردو صحافت کے تعلق سے سیمینار ہوتے رہے ہیں مگر قومی اردو کونسل نے پہلی بار مطلقائی، ملکی اور عالمی سطح پر اردو صحافت کو وسیع تر تناظر میں پیش کیا ہے اور جشن کی صورت دے کر اس کی معنویت کے دائرے کو وسیع کیا ہے۔ اس کانفرنس کا یہ پہلو اردو کی صحافتی برادری کے لیے قابلِ رشک ہے کہ اردو صحافت کے ماضی، حال اور مستقبل کے امکانات کے حوالے سے اس کے مجموعی کردار سے عوام و خواص کو نہ صرف روشناس کرایا گیا بلکہ صحافت سے جڑے ہوئے مسائل اور متعلقات کو بہت ہی گہرائی اور گیرائی کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی گئی۔

وائس چیئرمین مظفر حسین قومی کونسل کے ڈائرکٹر کو سپاسنامہ پیش کرتے ہوئے

صبیح بخاری کا استقبال کرتے ہوئے کونسل کے پرنسپل پبلیکشن آفیسر

■

Shoaib Raza Fatmi 1/135, CPJ Block, New Seelampur, Delhi - 110053
Mob.:9968778671
Email.:razashoaib57@gmail.com

ڈرامہ کا ایک دلکش منظر

شاذلی حسن خان

اقلیتی درس گاہوں میں نظامِ تعلیم
نصاب کی جدید کاری کی ضرورت

ہمارے ملک کے اخباروں میں اکثر ایسے اشخاص کی فہرستیں چھپتی رہتی ہیں جنھوں نے کسی نہ کسی میدان میں غیر معمولی کارنامہ انجام دیا ہو یا کسی خاص ہنر میں انوکھی مہارت حاصل کی ہو۔ مثلاً بڑی بڑی کمپنیوں کے بڑے افسران (CEOs) کی فہرست، سول سروسیز (Civil Services) میں کامیاب امیدواروں کی فہرست، صوبائی مسابقتی امتحانوں میں امتیاز حاصل کرنے والے امیدواروں کی لسٹ وغیرہ۔ ان فہرستوں میں مسلم طلبا کی تعداد مایوس کن رہتی ہے۔ مسلم اداروں میں بھی جہاں اچھے کورسیز (Courses) میں داخلے مسابقتی امتحانوں کے ذریعے ہی کیے جاتے ہیں وہاں بھی مسلم طلبا کی شرح کامیابی اطمینان بخش نہیں ہے۔

بے شک مسلم بچوں میں تعلیم کی کمی ہے۔ ایک طرف تو بڑی تعداد ایسے بچوں کی ہے جو کسی نہ کسی وجہ سے رسمی تعلیم سے محروم ہیں۔ دوسری طرف مسلم درسگاہوں میں درس و تدریس اور بچوں میں علمی استعداد کا وہ معیار نہیں ہے جس کا آج ہمارا سماج متقاضی ہے۔ ایک بڑی پریشانی یہ ہے کہ اکثر بچے اپنی مادری زبان اردو سے ہی ناواقف ہیں۔ دوسرے علوم میں مہارت بھی جب ہی ممکن ہوتی ہے جب اپنی مادری زبان پر اچھی دسترس ہو۔ مسلمانوں کی پوری تہذیب اردو زبان سے وابستہ ہے۔ اس تہذیب کی بقا و فروغ کے لیے یہ لازم ہے کہ حال اور آئندہ کی نسلیں اردو سے بخوبی واقف ہوں۔ بچے قوم و ملک کے مستقبل ہوتے ہیں۔ والدین اور درس گاہوں کے منتظمین کی لاپرواہی اور غفلت سے قوم کا عظیم نقصان ہو رہا ہے۔

راقم الحروف کچھ عرصے تک مقامی اسکولوں کا آفیسر آن اسپشل ڈیوٹی (OSD) رہا ہے جس سے وہاں کے نصابات، اساتذہ کا طرز تدریس اور عام ماحول کے مشاہدے اور مطالعے کا موقع ملا۔ اپنے ان تجربات و مشاہدے کی بنیاد پر ذیل میں چند سفارشات پیش ہیں۔ ان کی کامیابی کا انحصار انتظامیہ، اساتذہ اور والدین کے آپسی تعاون اور فراست پر ہے۔

(1) اسکولوں میں بیشتر اساتذہ تربیت یافتہ تو ہوتے ہیں لیکن تربیت میں سکھائے گئے اصول، تکنیک اور حکمت عملی وغیرہ کو یا تو اپنی سہل پسندی یا اسکول کے ماحول اور وسائل کی کمی کی وجہ سے وہ ان پر عمل درآمد کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ نہ تو وہ سبق کی پہلے سے منصوبہ بندی کرتے ہیں اور نہ مسائل و موضوعات کی مناسب تشریح اور وضاحت کرتے ہیں۔ صرف نصاب کو مکمل کرنا ہی ان کا مطمح نظر ہوتا ہے۔ یہی ایک بڑی وجہ ہے کہ طلبا میں وہ علمی استعداد نہیں آتی جس کی ضرورت ہے۔ طریقۂ تدریس ہمیشہ بچہ مرکوز (Child Centred) ہونا چاہیے نہ کہ نصاب مرکوز (Syllabus Centred)۔ درس و تدریس سبق کے مقاصد (Objectives) کو ہی مدنظر رکھنا چاہیے۔ بچوں کا عملی اشتراک، ان کا زبانی اور تحریری مشق کرنا بہت مفید ہوتا ہے۔

اساتذہ کو اپنی پیشہ ورانہ لیاقت اور حسن کارکردگی

(Professional skill and capacity building) میں مستقل اضافہ کرتے رہنا چاہیے۔ تازہ ترین اور نوایجاد تصورات (Latest, Innovative concepts) سے باخبر رہنے کی ضرورت ہے۔ مثلاً ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ من وعن سکھانا (Precision teaching) اور منظم نقل پذیری (Systematic replication) کیا ہوتے ہیں اور ان تصورات سے تدریس و تفہیم کو کیسے مزید بامعنی اور موثر بنایا جاسکتا ہے۔ اسی قسم کے اور بھی جدید تصورات ہیں جن کا تدریس میں اطلاق انتہائی مفید اور بارآور ہوسکتا ہے۔[1] ان کے علاوہ اساتذہ کو تازہ کاری کے کورسز (Refresher courses) میں بھی شرکت کرنا چاہیے۔

اساتذہ کرام قوم کے معمار کہے جاتے ہیں۔ اچھی اور معیاری تعلیم کی فراہمی فرض منصبی کے ساتھ ساتھ اخلاقی اور قومی فرض بھی ہے۔

(2) اساتذہ کا اخلاق اور نظم وضبط کا معیار: اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ استاد کے چال چلن، انداز گفتگو، اپنے رفقائے کار اور دیگر افراد سے برتاؤ: ان سب کا بچوں پر براہ راست اثر پڑتا ہے۔ بچے فطری طور سے استاد کی ہر حرکت پر نظر رکھتے ہیں۔ استاد کو ان کے لیے ایک مثالی کردار (Role model) ہونا چاہیے۔ محض درس گاہوں میں جہاں انتظامیہ ہوشیار اور باخبر نہیں ہے، اساتذہ اکثر مذموم حرکتیں، فضول بحث اور رکیک جملے بازی کرکے غیر شائستہ ماحول پیدا کرتے ہیں۔

(3) استاد کو احساس ہونا چاہیے کہ سب ہی بچے یکساں ذہین اور ایک جیسی صلاحیتوں کے حامل نہیں ہوتے۔ بچوں کا معاشی اور سماجی پس منظر مختلف ہوتا ہے اس لیے ان کا معیار کارکردگی اور صلاحیتیں بھی منفرد ہوتی ہیں۔ بچوں کو مکمل طور پر، خوبیوں اور خامیوں دونوں کے تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ بچوں کے مخصوص دلچسپی کے موضوع اور میدان اور ان کی انوکھی لیاقت کی پہچان کرکے اسی میدان میں گامزن ہونے میں رہنمائی کرنا چاہیے۔ آج ہماری معیشت میں کامیابی کے متنوع اور وسیع امکانات ہیں۔

(4) استاد کو طلبا کا معاون ومددگار ہونا چاہیے۔ پڑھائی میں کمزور بچوں کو اضافی وقت دینا چاہیے۔ نظم وضبط کی خلاف ورزی پر یا گھر کے کام (Homework) نہ کرنے پر جسمانی سزا دینے اور حوصلہ شکن تنقید سے پرہیز کرنا ضروری ہے کیونکہ ان چیزوں سے بچوں میں منفی جذبات، خوف، احساس کمتری اور یاسیت (Depression) فروغ پاتے ہیں۔

بچوں کے والدین سے بھی باقاعدگی سے صلاح و مشورہ کرنا مفید ہوتا ہے۔

اکثر مقابلہ جاتی امتحانوں میں علاوہ تحریری پرچو ں کے آمنے سامنے کا مکالمہ (Interview) بھی شامل ہوتا ہے۔ طلبا کو اردو ہندی اور انگریزی تینوں زبانوں اچھی دسترس ہونا چاہیے۔ وسیع لفظیات، محاوروں اور فقروں کی مناسب روانی (Fluencey) سے ادائگی ایسے ہنر ہیں جن پر قدرت حاصل کرنے کے لیے طویل المیعاد لائحہ عمل اور منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بعض طلبا زبان پر عبور نہ ہونے کی وجہ سے اپنے خیالات کا مناسب اور وضاحت سے اظہار کرنے سے قاصر ہوتے ہیں بلکہ بعض تو پریشانی اور گھبراہٹ کی وجہ سے مہر بہ لب (Tongue tied) ہوجاتے ہیں۔

(5) بچوں میں محنت پیہم کا جذبہ: ہمارے طلبا میں اعلیٰ و ارفع درجہ حاصل کرنے کی وہ شدید خواہش وشوق نہیں ہے جس سے غیر معمولی اور نمایاں کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ ایک مشہور ادیب کا کہنا ہے کہ "ہم محنت سے جی چرانے والے لوگ ہیں۔"[2]

اگر ہم نامور اور کامیاب لوگوں کی سوانح حیات کا مطالعہ کریں تو یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ محنت شاقہ اور پتہ ماری کے بنا غیر معمولی کامیابی حاصل نہیں کی جاسکتی۔

علامہ اقبال نے اس بات کو بار بار دہرایا ہے۔ فرماتے ہیں:

نقش ہیں سب ناتمام خون جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر
بے محنت پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا
روشن شرر تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد

والدین اور اساتذہ کا فرض ہے کہ بچوں کو بنا ذہنی دباؤ میں لائے، کڑی محنت اور منظم اوقات نامہ کا عادی بنائیں۔

(6) زائد از نصاب مشاغل (Extracurricular activities): ہر درسگاہ میں جسمانی ورزش، کھیل کود اور تفریحی مشاغل مناسب پیمانے پر اور مستقل ٹائم ٹیبل میں شامل ہونا چاہیے۔ جو طلبا کسی مخصوص کھیل میں فطری صلاحیت رکھتے ہوں ان کو اس میں مزید مہارت حاصل کرنے کی آسانی فراہم کرنا چاہیے۔

(7) طلبا میں ابتدائی جماعت سے ہی ماحولیات کے بنیادی مسائل کے تئیں آگاہی کو فروغ دیا جانا ضروری ہے۔ ان کو قومی مسائل کا علم ہو اور وہ اپنی انفرادی واجتماعی ذمے داری کو سمجھیں۔ ہفتہ یا عشرہ میں طلبا کے لیے اپنی درس گاہ یا گردونواح میں رضاکارانہ طور پر صفائی، شجرکاری وغیرہ کے لیے کچھ وقت وقف کیا جانا چاہیے۔

(8) نصاب میں حیات بخش مہارتوں (Life skills) کی شمولیت: ماہرین تعلیم نے آج کے مسابقتی اور آزمائشی دور کے مدنظر نصاب میں حیات بخش مہارتوں کی شمولیت کو نہایت ضروری اور اہم تسلیم کیا ہے۔ بڑے اسکولوں میں جہاں وسائل کی کمی نہیں ہے۔ ان مہارتوں کو تعلیم کا لازمی جزو بنا لیا گیا ہے۔ لیکن اقلیتی اداروں میں یا تو ان کی اہمیت کا اندازہ نہیں ہے یا اپنے محدود وسائل کی وجہ سے، اس پہلو کو نظرانداز کیا گیا ہے۔ ذیل میں چند بنیادی حیات بخش مہارتوں کی تفصیل پیش ہے۔

(الف) مؤثر بات چیت کرنے کا ہنر (Effective commmication skill) اپنے خیالات اور رائے کا

اظہار واضح اور مربوط طریقے سے کرنا نہایت لازمی ہے۔ اکثر مقابلہ جاتی امتحانوں میں علاوہ تحریری پرچوں کے آمنے سامنے کا مکالمہ (Interview) بھی شامل ہوتا ہے۔ طلبا کو اردو ہندی اور انگریزی تینوں زبانوں اچھی دسترس ہونا چاہیے۔ وسیع لفظیات، محاوروں اور فقروں کی مناسب روانی (Fluencey) سے ادائگی ایسے ہنر ہیں جن پر قدرت حاصل کرنے کے لیے طویل المیعاد لائحہ عمل اور منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بعض طلبا زبان پر عبور نہ ہونے کی وجہ سے اپنے خیالات کا مناسب اور وضاحت سے اظہار کرنے سے قاصر ہوتے ہیں بلکہ بعض تو پریشانی اور گھبراہٹ کی وجہ سے مہر بہ لب (Tongue tied) ہو جاتے ہیں۔ موثر بات چیت سے خود اعتمادی بھی بڑھتی ہے اور شخصیت (Personality) اور چال ڈھال (Body language) میں بھی نکھار آتا ہے۔ بچوں میں کتابیں پڑھنے اور فرہنگ (Dictionary) سے رجوع کرنے کی عادت کو فروغ دیا جائے اور وقتاً فوقتاً تقریری مقابلے اور بحث و مباحثے (Deleates) کا انعقاد کیا جائے تاکہ ان کے اندر سے سامعین سے بالمشافہ گفتگو کرنے میں شرم خوف و گھبراہٹ وغیرہ (Audience shy) دور ہو جائے۔

(ب): ذہنی دباؤ (Stress) سے نپٹنا، روپے پیسے اور وقت کی اہمیت کو سمجھنا اور اس کا معقول استعمال (Time, money management): اکثر طلبا کسی فکر و پریشانی کی وجہ سے ذہنی دباؤ میں رہتے ہیں۔ کبھی آنے والے امتحان کی گھبراہٹ، معاشی تنگی یا گھریلو مسائل وغیرہ طالب علم کو ذہنی کوفت میں مبتلا رکھتے ہیں۔ وہ پڑھائی پر توجہ نہیں دیتے اور کلاس میں بھی حواس باختہ اور ذہنی کشمکش میں رہتے ہیں۔

اگر طلبا اپنی درسی تیاری باقاعدگی سے تا بہ امروز (Upto date) رکھیں اور کام کو اکٹھانہ ہونے دیں تو کافی حد تک امتحان کا دباؤ کم ہو سکتا ہے۔ ایسے میں اساتذہ اور والدین کا بھی فرض ہے کہ طلبا کو مناسب صلاح دیں، ان کی حوصلہ افزائی کریں اور ان کے مسائل کو حل کرنے میں پورا اور مکمل تعاون دیں۔ صبح کی سیر، جسمانی ورزش اور یوگا وغیرہ بھی ذہنی دباؤ کے کم کرنے میں مددگار ہوتے ہیں۔

بچوں کو وقت اور روپے پیسے کی اہمیت اور اس کا صحیح استعمال سمجھنا چاہیے۔ عام طور سے والدین کی آمدنی محدود ہوتی ہے۔ ہر انسان کے لیے 'وقت' بھی قلیل ہی ہوتا ہے۔ طلبا کو کفایت شعاری اپنانا چاہیے۔ اپنی ضرورتوں اور مصروفیتوں کو فوقیت (Priority) اور ترجیحات (Preference) کے لحاظ سے ترتیب دیں اور ان کی فہرست تیار کریں۔ ان تمام معاملات میں والدین اور اساتذہ کی ذمے داری اور ان کی رہ نمائی انتہائی اہم ہے۔

(ج): افراد سے باہمی رابطہ و تعلقات، اخلاقی آداب (Interpersonal relationships, etiquettes and manners): طلبا کے سماجی اور خاندانی پس منظر مختلف ہوتے ہیں۔ ان کی زبان و لفظیات محدود ہوتی ہیں۔ ان کو اپنے سے بڑوں اور بزرگوں سے موزوں الفاظ میں خطاب کرنا سکھایا جائے۔ اساتذہ سے،

والدین سے اور حکام سے کیسے گفتگو کی جانی چاہیے۔ عوام سے اور اپنے ہم جماعت بچوں سے کیسے برتاؤ کیا جائے۔ اپنے لباس، وضع قطع سے اور بات چیت سے تعلیم یافتہ اور مہذب معلوم ہوں۔ آمنے سامنے کا مکالمہ (Interview) ہو تو طلبا کمرے میں داخل ہوتے وقت اور وہاں سے نکلتے وقت کے آداب (Entry and exit manners) کا لحاظ رکھیں۔ گھر کے اندر صاف ستھرا اور تہذیب کا ماحول ہو۔ محلّہ اور قرب و جوار میں مذموم اور بے غیرتی کے ماحول سے اجتناب رکھیں۔ بچوں کے حرکات و سکنات ان کے مہذب ہونے کا مظہر ہوں۔

(د): فیصلہ لینے کی اہلیت (Decision making ability): زندگی کے سفر میں اکثر ایسے مقام آتے ہیں جہاں انسان اپنے کو دوراہے پر کھڑا ہوا پاتا ہے۔ اسے فیصلہ لینا پڑتا ہے کہ کون سی راہ اختیار کرے۔ لیکن کبھی کبھی وہ تذبذب اور تخیلک خیالات میں گھرا رہتا ہے اور وہ صحیح فیصلہ لینے سے قاصر معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً ہائی اسکول کے بعد کون سے مضامین لیے جائیں، کون سے پیشہ یا مسابقت کے لیے تیاری کی جائے وغیرہ۔ انسان کی کامیابی یا ناکامیابی ان ہی فیصلوں سے عبارت ہے۔ ایک غلط فیصلہ ساری زندگی کو تلخ بنا دیتا۔ لیکن بعد میں کفِ افسوس ملنا بے سود ہوتا ہے۔

طلبا کو چاہیے اپنی شخصیت اور اپنے طبعی رجحان کو پہچانیں۔ ہر متبادل کے موافق اور مخالف (Pros and Cons) پہلوؤں اور دلائل کو سمجھیں۔ اپنے خیر خواہوں، والدین اور اساتذہ سے صلاح و مشورہ کریں لیکن فیصلہ خود اپنا ہو۔

حیات بخش مہارتیں (Life skills) اور بھی ہیں لیکن ثانوی درجے اور زیریں ڈگری یافتہ طلبا کے لیے مندرجہ بالا مہارتیں ضروری اور کافی ہیں۔

مختصر یہ کہ اگر (i) طلبا کی فطری صلاحیت اور طبعی رجحان کو پہچان کر اس کی آبیاری کی جائے۔ (ii) ان میں آگے بڑھنے اور کارکردگی میں غیر معمولی کامیابی حاصل کرنے کا جوش و جذبہ بیدار ہو جائے۔ اور (iii) منصوبہ بند اور پیہم محنت کرنے کی، ان کی عادت بن جائے کڑی تو بلندیوں پر پہنچنے سے انھیں کوئی نہیں روک سکتا۔ بقول علامہ اقبال کے:

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے ان کو منزل اپنی آسمانوں میں

حواشی:

(1) جدید تدریسی تحقیق میں دوسرے اہم تصورات یہ ہیں: کم مقداری تدریس (Micro-teaching)، تفویض کیے ہوئے کام کا تجزیہ (Task analysis)، تصوری نقشہ کشی (Concept mapping) وغیرہ۔ طریقۂ تدریس کی کسی بھی جدید کتاب میں یہ سب اصطلاحیں مل جائیں گی۔

(2) عبداللہ حسین: اردو دنیا، جلد 17، شمارہ 9، ستمبر 2015، ص 31

Dr. Shazli Hasan Khan
Assit. Prof. Dept. of Education & Training
MANUU, Hydrabad

پروفیسر مجید بیدار

اشاعتی سرگرمیوں کا مرکز حیدرآباد

قطب شاہی دور سے ہی شہر حیدرآباد کو ادبی، مذہبی اور ثقافتی شہر کی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ ایک اہم پایۂ تخت کا موقف حاصل رہا ہے۔ قطب شاہی سلطنت کے پانچویں بادشاہ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے دور میں گولکنڈہ کے بجائے حیدرآباد کی شہرت میں اضافہ ہوا۔ قطب شاہی بادشاہوں نے گولکنڈے کو پایۂ تخت بنا کر حکمرانی کا آغاز کیا، لیکن رفتہ رفتہ گولکنڈہ کی مرکزی حیثیت ختم ہوگئی اور حیدرآباد کا مقام بلند ہونے لگا۔ کئی یورپی سیاحوں نے شہر حیدرآباد کے چار مینار اور اس کے قریب گلزار حوض اور اس کے چاروں طرف بنی ہوئی چار کمانوں پر ریشم کے لٹکے ہوئے پردوں کی حد درجہ تعریف کی ہے۔ سولھویں صدی میں چار مینار سے لے کر پتھرگٹی تک دونوں جانب بنائے ہوئے سہ منزلہ مسافر خانوں کی اس وقت کے مورّخین نے بڑی تعریف و توصیف کی ہے۔ مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے قطب شاہی سلطنت کا خاتمہ کردیا، جس کے بعد طویل عرصے تک یہ علاقہ مغل شہنشاہ کے قبضے و تصرف میں رہا۔ اُس وقت حیدرآباد سے پایہ تخت کی تبدیلی کی وجہ سے شہر اورنگ آباد کو ادب و ثقافت کے مرکز کا درجہ حاصل ہوگیا۔ اس طرح 1689 سے 1771 تک شہر حیدرآباد پایۂ تخت کی سرفرازی سے محروم رہا۔ آصف جاہی سلطنت کے تیسرے بادشاہ نے اورنگ آباد کے بجائے دوبارہ حیدرآباد کو پایۂ تخت قرار دیا تو سو سال بعد حیدرآباد کی ادبی اور ثقافتی رونق میں دوبارہ اضافہ ہوگیا۔ اس طرح چار صدیوں سے شہر حیدرآباد اپنی سرگرمیوں کی وجہ سے اہمیت کا حامل ہے اور اس شہر نے اپنی تاریخ کے چار سو سال مکمل کرلیے ہیں۔

بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی شہر حیدرآباد کے باشندوں کو ایک بڑے صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔ اس صدمے کے ساتھ ایک اہم خوشخبری بھی حیدرآباد کے باشندوں کو ملی۔ 1908 میں موسیٰ ندی کی طغیانی کی وجہ سے شہر کی آبادی تباہ و تاراج ہوگئی اور عام انسان کی زندگی پریشانی کا شکار ہوئی۔ اس وقت میر محبوب علی خان چھٹے نظام، ریاست حیدرآباد کے بادشاہ تھے، جنھیں عوام دوستی اور رعایا پروری کی وجہ سے شہرت حاصل رہی۔ انھوں نے عوامی تکالیف کا مداوا کیا اور اسی دَور میں انگریزی سیاح نے اجنتا کے غاروں کی نشاندہی کی اور نظام نے ہزاروں سال قدیم تہذیب کی حفاظت کا بیڑا اٹھایا۔ اس ثقافتی ورثے کی حفاظت کے ساتھ ساتھ ملک گیر سطح پر نامور عالم، فاضل اور اہل فکر و فن کو نظام نے حیدرآباد کی سرزمین میں مدعو کیا۔ حیدرآبادی بادشاہوں کی فیاضی، دریا دلی اور علم دوستی کی وجہ سے اس ریاست کو سارے ہندوستان میں شہرت حاصل ہوگئی۔ قدیم دور سے ہی شہر حیدرآباد کو تصنیف و تالیف کی سرگرمیوں کی وجہ سے اہم مقام حاصل رہا ہے۔ سرسید کے عہد سے پہلے نواب شمس الامراء نے اپنے دارالترجمہ کے ذریعے سائنسی کتابوں کو اردو میں منتقل کرکے پہلے تصنیفی ادارے کی بنیاد رکھی، جہاں اہم سائنسی کتابوں کے اردو میں ترجمے کیے جاتے تھے۔ ان کتابوں کی اشاعت کے لیے شمس الامراء نے سنگی چھاپہ خانہ قائم کیا تھا۔ اس طرح شہر حیدرآباد کو سب سے پہلے اشاعتی مرکز کا درجہ حاصل ہوگیا۔ اس 'دارالترجمہ' کے ذریعے صرف اور صرف سائنسی کتابوں کی اشاعت عمل میں لائی جاتی تھی۔ اس عہد میں داستانوی ادب کو فروغ حاصل ہوا تھا۔ علمی اور فنی کتابیں تحریر کرنے پر توجہ نہیں دی جاتی تھی۔ انگریز قوم اور ان کے ترقیاتی کارنامے عالمی سطح پر اہمیت کے حامل ہوچکے تھے، اس لیے ضرورت یہ محسوس کی گئی کہ انگریزی کتابوں کے اردو میں ترجمے پیش کیے جائیں۔ غرض سب سے پہلے نواب شمس الامرا کے دارالترجمہ کے توسط سے اردو میں کتابوں کی طباعت اور اشاعت کا سلسلہ فروغ پانے لگا۔ غرض اٹھارھویں صدی کی تیسری دہائی سے ہی شہر حیدرآباد کو طباعتی مرکز کا درجہ حاصل رہا۔

امیر کبیر محمد فخر الدین خان شمس الامراء حیدرآباد کی نامور شخصیت کے حامل تھے۔ ان کے خاندان سے تعلق رکھنے والے بہت سے افراد حیدرآبادی حکومت کے وزراء میں شامل رہے۔ شمالی ہند میں فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا اور کلکتہ سے 1803 میں گلکرسٹ کے ہندوستانی چھاپہ خانے سے کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا۔ فورٹ سینٹ جارج کالج مدراس کے توسط سے قصہ کہانی کی کتابوں کے ترجمے اور کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ فروغ پانے لگا تو حیدرآباد میں امیر کبیر نواب شمس الامرا نے اشاعت کے سلسلے کو اردو زبان میں فروغ دینے کے لیے ایک سنگی چھاپہ خانہ قائم کیا اور سائنس کی انگریزی کتابوں کے ترجمے کرنے اور ان کی اشاعت کا کام شروع کیا۔ شمس الامرا کے دارالترجمہ میں اس دور کے عالم اور فاضل افراد نے سائنسی کتابوں کے ترجمے کا آغاز کیا۔ ان کے سنگی چھاپہ خانہ کے قیام کی تفصیلات عدم دستیاب ہیں۔ اس چھاپہ خانے سے شائع ہونے والی چند اہم کتابوں اور ان کے موضوعات کے بارے میں تفصیلات درج ہیں۔

1824 میں دلی کالج قائم ہوا، جس کے توسط سے علمی کتابوں کے ترجمے کی روایت کو ترقی حاصل ہوئی۔ قیام دلی کالج کے زائد از دس سال بعد حیدرآباد کے نواب شمس الامرا کے نجی چھاپہ خانے سے کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا۔ شمس الامرا کے چھاپہ خانے سے شائع ہونے والی اوّلین کتاب 'رسالہ علم ہیئت' ہے جس کی اشاعت 1250ھ مطابق 1834 قرار پاتی ہے۔ دلی میں انگریزوں کی جانب سے قائم کردہ دہلی کالج کی کارکردگی کے دس سال کے اندر ہی حیدرآباد کے شمس الامراء نے علمی و فنی ترجمہ اور اشاعت کی خصوصیات کو عام کرنا شروع کردیا تھا۔ شمس الامرا علم سائنس کے چاہنے والے اور اس کے توسط سے اردو داں طبقے میں سائنسی علوم کو فروغ دینے کا خصوصی جذبہ رکھتے ہیں، اس لیے 1255ھ مطابق 1839 میں 'علم اصطرلاب کرویٰ' کے نام سے رتن لال کی کتاب شائع کی گئی، جس کے بعد میر شمس الدین محمد فیض کی ترجمہ کردہ "شمس الہندسہ" اسی عہد میں شائع ہوئی۔ شاہ علی نامی مترجم نے 1258ھ مطابق 1842 میں 'رسالہ علم حساب' کا ترجمہ کیا۔ یہ کتاب بھی شمس الامرا حیدرآباد کے نجی چھاپہ خانے سے اشاعت پذیر ہوئی۔ 1261ھ مطابق 1845 میں شمس الامراء کے نجی چھاپہ خانے سے شائع ہونے والی کتاب 'رسالہ نظام شمسی و آلۂ اُریری' بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ انگریزی کے پروفیسر گرونن نے 1845 میں 'علم ہیئت' پر ایک کتاب تحریر کی تھی، جسے سید محمد عبدالرحمن نے شمس الامرا کے دارالترجمہ کے ذریعے 1267ھ مطابق 1850 میں 'تحفۂ گرونانؔ' کے نام سے پیش کیا، جو اسی دور میں شائع ہوئی۔ غرض دلی کالج کے قیام کے دور میں یعنی اٹھارھویں صدی کی تیسری دہائی میں شہر حیدرآباد کو تصنیفی و تالیفی ادارے کی حیثیت سے سرپرستی حاصل ہوچکی تھی۔ اس کی ایک اہم وجہ یہ بھی تھی کہ ہندوستان پر قبضہ کرنے کے بعد انگریزوں نے پہلی مرتبہ 1832 میں ملک کی عدالتوں کی زبان اردو قرار دی تھی اور ہندوستان کے مختلف خطوں میں اردو زبان کی ترقی و ترویج کے سلسلے کا آغاز ہونے لگا تھا۔ اس طرح ریاست حیدرآباد کے شمس الامراء کے دارالترجمہ کو پہلی بار سائنسی کتابوں کی اشاعت کا موقع حاصل ہوگیا۔

مختلف کتابوں میں شمس الامراء کے کارناموں کا ذکر موجود ہے، چنانچہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے اپنی کتاب 'داستانِ ادبِ حیدرآباد' میں ان کی تفصیلات درج کی ہیں، جس کے مطابق نواب شمس الامراء کی وفات 1279ھ مطابق 1862 میں ہوئی۔ غرض سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی کے قیام سے قبل ہی سائنسی کتابوں کی اشاعت کا کام نواب شمس الامراء کے ذریعے سرزمین دکن میں فروغ پانے لگا۔ اٹھارھویں صدی کی تیسری دہائی کے دوران ہی حیدرآباد کو سائنسی کتب کی تصنیف و تالیف اور ان کی اشاعت کے مرکز کا موقف حاصل ہوگیا۔ 1967 کے بعد جب انجمن پنجاب کا قیام عمل میں آیا اور اصلاحی طرز کے امتحانات کی روایت کا آغاز ہوا تو انجمن پنجاب نے اپنے اشاعت گھر سے منشی، عالم، فاضل اور ادیب و کامل کے امتحانات کی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا، جس کے نتیجے میں جنوبی ہند کے علاوہ شمالی ہند میں بھی نصابی کتابوں کی ترسیل کے مواقع حاصل ہوگئے۔ ریاست حیدرآباد ہندوستان کی واحد ایسی ریاست تھی جس نے شعر و ادب ہی نہیں بلکہ تصنیف و تالیف کا کام انجام دینے

> اٹھارھویں صدی کی تیسری دہائی کے دوران ہی حیدرآباد کو سائنسی کتب کی تصنیف و تالیف اور ان کی اشاعت کے مرکز کا موقف حاصل ہوگیا 1967 کے بعد جب انجمن پنجاب کا قیام عمل میں آیا اور اصلاحی طرز کے امتحانات کی روایت کا آغاز ہوا تو انجمن پنجاب نے اپنے اشاعت گھر سے منشی، عالم، فاضل اور ادیب و کامل کے امتحانات کی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا، جس کے نتیجے میں جنوبی ہند کے علاوہ شمالی ہند میں بھی نصابی کتابوں کی ترسیل کے مواقع حاصل ہوگئے۔

والے ادیبوں کی سرپرستی پر توجہ دی۔ اس خصوص میں دو اہم کتابیں 'بیرونی مشاہیر حیدرآباد میں' اور 'مملکتِ آصفیہ کی فیض رسانیاں' کے مطالعے سے حیدرآباد کے بادشاہوں کی علمی و ادبی فیاضی کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ شہر حیدرآباد کو تعلیمی اور تدریسی مرکز کا درجہ دینے کے لیے نواب انوار اللہ خان فضیلت جنگ کی جانب سے مذہبی علوم و فنون کی تدریس کے لیے دینی تعلیمی ادارے کے قیام کے مشورے کو قبول کرتے ہوئے نواب میر محبوب علی خان نے اپنے دور 19 ذی الحجہ 1292ھ مطابق 1875 جامعہ نظامیہ حیدرآباد کی بنیاد رکھی۔ دکن کی یہ پہلی مذہبی یونیورسٹی تھی، جس کی شاخیں ریاست حیدرآباد کے مختلف علاقوں میں قائم ہوگئیں، جس کی وجہ سے مذہبی علوم و فنون کی ترقی و اشاعت کا سلسلہ دراز ہونے لگا۔ جامعہ نظامیہ کے مذہبی نصاب کی ترتیب و تدوین اور مذہبی علوم کی تدریس کے لیے درکار کتابوں کی اشاعت کے لیے یہ ضروری تھا کہ کسی تصنیفی ادارے سے استفادہ کیا جائے، چنانچہ انوار اللہ فضیلت جنگ کی جستجو کے نتیجے میں دائرۃ المعارف کا قیام 1302ھ مطابق 1882 میں عمل میں آیا، جہاں نادر و نایاب عربی کتابوں کی اشاعت کا اہتمام کیا گیا تھا، جس میں ابوبکر رازی کی 'حاوی' اور 'کنز العمال' کی اشاعت شامل ہے۔ اب تک دائرۃ المعارف سے چالیس علوم پر دو سو مخطوطات کی اشاعت عمل میں آچکی ہے۔ ابتدا میں جامعہ نظامیہ کی بیشتر کتابیں 'دائرۃ المعارف' سے شائع ہوتی رہیں۔ اس ادارے سے بے شمار دینی کتابیں عربی سے ترجمہ کرکے شائع کی گئیں۔ اس طرح جامعہ نظامیہ کی نصابی تکمیل کے لیے دینی اور اسلامی علوم پر بے شمار کتابیں اردو میں شائع ہوگئیں، کیوں کہ اس جامعہ کا طرزِ تعلیم اردو تھا اور تمام دینی نصابی کتابیں اردو میں شائع ہوتی تھیں، جس کی وجہ سے دینی تعلیم اور اس کی کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ حیدرآباد کی سرزمین سے شائع ہوکر دیگر کتبوں کے نصابات کی تکمیل کرنے لگا۔

نواب میر محبوب علی خان آصف جاہ سادس نے اپنی ریاست میں جس نظامِ تعلیم کو رواج دیا تھا، وہ درحقیقت مشرقی انداز کا نظام تھا۔ ان کے عہد میں چوں کہ ریاست کی چار زبانیں چار علاقوں سے متعلق تھیں اور ان تمام علاقوں پر ریاست حیدرآباد کا قبضہ و تصرف تھا، اس لیے محبوب علی خان کے دور میں جہاں اردو ذریعہ تعلیم کا اہتمام کیا گیا، وہیں پادریوں کے قائم کردہ مشن اسکول میں انگریزی تعلیم کی اجازت فراہم کی گئی۔ جن علاقوں میں مراٹھی کا چلن تھا وہاں مراٹھی میڈیم کو فروغ دینے کی طرف توجہ دی گئی، اس کے علاوہ کنڑ، تلگو اور ٹامل کے علاقوں میں انہی زبان کے ذریعہ تعلیم کو رواج دیا گیا۔ 1911 میں جب نواب میر محبوب علی خان کا انتقال ہوا اور ان کے صاحبزادے نواب میر عثمان علی خان نے آصف جاہی حکومت کے ساتویں بادشاہ کی حیثیت سے تخت و تاج کی وراثت حاصل کی تو انھوں نے اپنی ریاست کے تعلیمی نظام کو جدید ترین بنانے کے لیے کمیٹی مقرر کی اور اس کمیٹی کے سربراہ مولانا شبلی نعمانی مقرر کیے گئے، جب کہ سرسید احمد خان کے پوتے سر راس مسعود کو اس کمیٹی کا سربراہ بنا کر عیسائی، ہندو، سکھ اور پارسی مذاہب کے اہم ماہرین تعلیم کو اس کمیٹی کے ارکان کی حیثیت سے منتخب کیا گیا اور ان پر یہ ذمے داری عائد کی گئی کہ وہ اس کمیٹی کے توسط سے ساری ریاست میں نئے نظامِ تعلیم کو رواج دینے کے لیے اپنی سفارشات پیش کریں۔ اس کمیٹی نے

جدید علوم وفنون کو نصاب کا حصہ دیتے ہوئے جو سفارشات پیش کیں، اس کے مطابق ہر جماعت کا نصاب مقرر کیا گیا اور اس نصاب میں تاریخ و جغرافیہ اور حساب کے ساتھ ساتھ سائنس اور دیگر علوم کو بھی تدریس کا ذریعہ بنانے پر زور دیا گیا۔ کمیٹی کی سفارشات کے پس منظر میں نصاب منتخب کیا گیا اور نصابی کمیٹیوں نے جب اپنی سفارشات پیش کیں۔ تو 1912 سے 1914 تک اُن کمیٹیوں کی سفارشات پر غور و خوض کیا گیا اور ریاست میں قائم شدہ مشہور اردو کے ایک اہم ادارہ 'انجمن ترقی اردو' کو نصابی کتابوں کی اشاعت کی ذمے داری سونپی گئی۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق اس وقت انجمن ترقی اردو کے سربراہ تھے اور اس انجمن کا مرکزی دفتر اورنگ آباد میں قائم تھا۔ انجمن ترقی اردو نے حکومت کی سفارشات کو قبول کیا اور سب سے پہلے انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد سے نصابی کتابیں شائع ہونے لگیں۔ اس عہد میں مولوی عبدالحق اورنگ آباد کے سب سے مشہور علاقے 'بی بی کا مقبرہ' کے احاطے میں قیام پذیر تھے اور انھوں نے لکھنؤ کے مشہور رسالے 'دلگداز' پریس کو خرید کر انجمن ترقی اردو کے سپرد کیا، جہاں سے کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ جاری ہوا۔ شمس الامرا کے نجی چھاپہ خانہ کے بعد انجمن ترقی اردو کا چھاپہ خانے حیدرآباد کا دوسرا تصنیفی ادارہ تھا، جس نے اردو میں کتابوں کی اشاعت کی طرف خصوصی توجہ دی۔ اس انجمن کی جانب سے نہ صرف اردو کی نادر و نایاب کتابیں، تذکرے اور تحقیقی کتابوں کی اشاعت عمل میں آئی، بلکہ نصابی اور غیر نصابی کتب بھی انجمن ترقی اردو اورنگ آباد سے شائع ہو کر اردو دنیا میں پھیلنے لگیں۔ جامعہ عثمانیہ سے فارغ ہونے والے دانشوروں میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ایسے واحد ادیب تھے جنھوں نے حیدرآبادی مصنفین کی تصانیف کی اشاعت اور اس کی توسیع کے لیے 1938 میں ایک اہم ادارہ 'ادارۂ ادبیات اردو' کے نام سے قائم کیا۔ اس ادارے کی طرف سے بھی ڈاکٹر زور کی لاتعداد کتابیں اور دکن کے کئی مصنفین کی تصانیف بھی شائع ہوتی رہیں۔ اسی ادارے سے ڈاکٹر زور نے ماہنامہ 'سب رس' جاری کیا جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ آزادی سے قبل تک انجمن ترقی اردو کے بعد ادارۂ ادبیات اردو ہی وہ منفرد ادارہ تھا، جس کا کوئی اپنا ذاتی پریس نہ ہونے کے باوجود مختلف مطبع جات میں ادارے کی کتابیں شائع ہوتی تھیں۔ ادارۂ ادبیات اردو نے علم و ادب کے علاوہ سائنس و ٹکنالوجی، تاریخ، جغرافیہ اور دیگر علوم پر کتابوں کی اشاعت کو ممکن بنایا۔ اب اس ادارے سے منعقد ہونے والے امتحانات اور اس کے لیے نصابی کتابیں بھی شائع ہوئیں۔ ڈاکٹر زور مرحوم نے پہلی مرتبہ 'اردو انسائیکلوپیڈیا' کی پہلی جلد شائع کی، جو کارنامہ کا درجہ رکھتا ہے۔ اس ادارے سے ماہنامہ 'سب رس' کی اشاعت آج بھی جاری ہے۔

حیدرآباد کے نام کو تصنیفی و تالیفی حیثیت سے شہرت دینے والے ایک اہم سرکاری ادارے کی حیثیت سے دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کی خدمات کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ ریاست حیدرآباد کی ہمہ جہت تعلیمی ترقی کے لیے ساتویں نظام میر عثمان علی خان نے اپنے دور میں عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کے حکم نامے کے ذریعے اردو دیسی زبان کو اس یونیورسٹی کے ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے قبول کیا۔ 1918 میں یونیورسٹی کے قیام سے ایک سال قبل یعنی 14 اگست 1917 کو سرکاری فرمان کے ذریعے دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کا قیام عمل میں لایا گیا، جس کے ذریعے انگریزی زبان سے مختلف علوم وفنون کی کتابوں کو اردو میں ترجمہ کر کے انھیں جامعاتی نصاب میں شامل کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کی سب سے اہم خوبی یہی رہی کہ اس ادارے نے سائنس، انجینئرنگ، میڈیسن، قانون، علوم عمرانیات جیسے علوم پر انگریزی میں لکھی ہوئی مایہ ناز کتابوں کے ترجمے کو ممکن بنایا۔ یہ کتابیں نصابی اغراض کے طور پر منتخب کی جاتی تھیں اور جنھیں ترجمہ کرنے کے لیے مختلف افراد کی سرپرستی حاصل تھی۔ حکومت کے زیر اہتمام دارالترجمہ ایک ایسا شعبہ تھا جو آزادانہ طور پر کام کرتا تھا اور اس شعبے کے سربراہ کو ناظم علوم وفنون، سررشتۂ تالیف و ترجمہ کہا جاتا تھا۔ دارالترجمہ کے تمام کاموں کی نگرانی اور ملازمین کے انتخاب کی ذمے داری ناظم کے سپرد ہوتی تھی۔ اس ادارے میں نہ صرف ہمہ وقتی، جزوقتی اور موقتی ملازمین کام کرتے تھے۔ بلکہ اہم موقعوں پر ملک کے نامور مترجم کی خدمات بھی حاصل کی جاتی تھیں۔ حکومت کی توجہ سے ملک کے کونے کونے سے قابل اور ماہر افراد کو اس ادارے میں ملازمت کا موقع دیا گیا، چنانچہ مولانا عبدالماجد دریابادی، عبدالحلیم شرر لکھنوی، سید ہاشمی فرید آبادی، مرزا محمد ہادی رسوا اور علی حیدر نظم طباطبائی کے علاوہ شبیر حسن جوش اور عبداللہ عمادی کی خدمات اس ادارے کو حاصل رہیں۔ اس ادارے سے شائع ہونے والی علوم وفنون کی ترجمہ شدہ کتابوں کی طباعت اور اشاعت کے لیے دارالطبع حیدرآباد کی خدمات حاصل کی گئیں، جو سرکاری طور پر قائم کردہ پریس تھا۔ ہندوستان کی سرزمین میں یہ پہلا موقع تھا کہ علوم وفنون کی ترجمہ شدہ کتابیں سرکاری سرپرستی میں شائع ہوتی تھیں۔ ان کتابوں کی جلد، طباعت اور سرورق کو دیکھنے سے ہی روحانی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ دارالترجمہ کے قیام سے لے کر اس

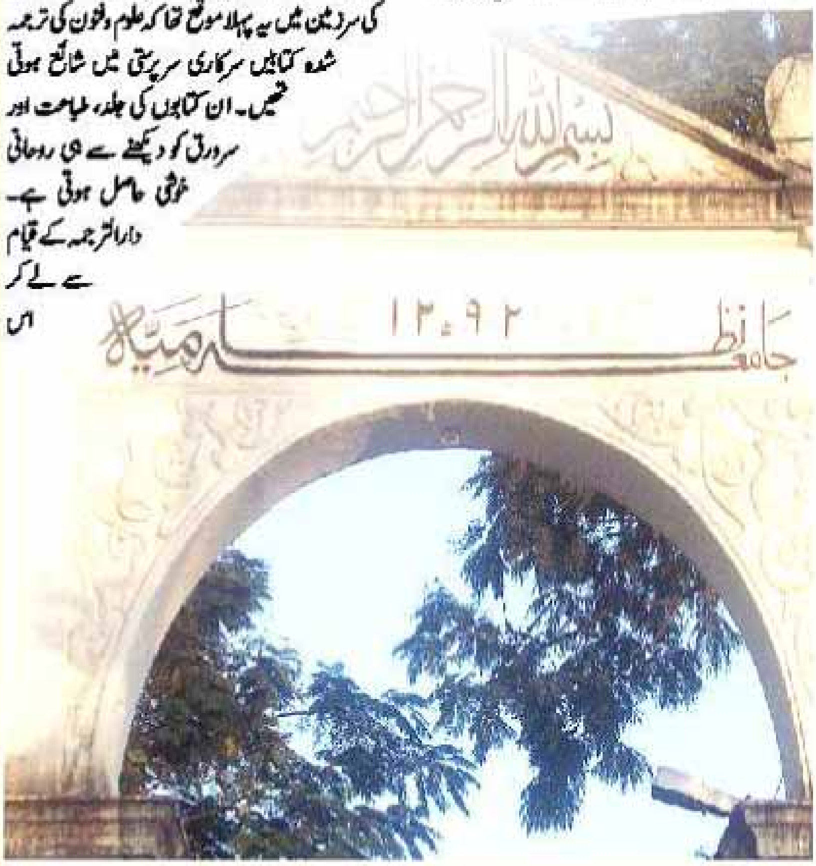

کے اختتام تک اس ادارے سے مختلف اوقات میں سات ناظم اور 129 مترجمین وابستہ رہے، جنھوں نے جامعہ عثمانیہ کے لیے انٹرمیڈیٹ سطح کے نصاب سے لے کر میڈیکل، انجینئرنگ، قانون اور سائنسی علوم پر زائد از 386 کتابیں شائع کیں۔ ترجمہ کے دوران پیش آنے والی پیچیدہ اصطلاحات کا بھی اردو میں متبادل پیش کرکے وضع اصطلاحات کے کارنامے انجام دیے گئے۔ اس طرح دارالترجمہ کی بارہ سب کمیٹیوں نے 32 علوم وفنون کی نئی اصطلاحات مرتب کیں اور ان کی تعداد 91 ہزار بتائی جاتی ہے۔ دارالترجمہ کی وضع اصطلاحات کمیٹی کی یہ ذمے داری تھی کہ وہ نئے الفاظ کے لیے نئی اصطلاحیں وضع کریں۔ پاکستان سے ڈاکٹر جمیل جالبی نے دو جلدوں میں 'اصطلاحات جامعہ عثمانیہ' شائع کردی ہیں۔ یورپ کی مشہور یونیورسٹیوں جیسے آکسفورڈ اور کیمبرج کے نصاب میں جو کتابیں شامل تھیں ان کے نصاب کو سامنے رکھ کر جامعہ عثمانیہ کے مختلف شعبہ جات کے بورڈ آف اسٹڈیز کے ذمہ داران جس معیاری کتاب کو نصاب کا درجہ دیتے، اس کا ترجمہ کرکے اصطلاحات کے ساتھ یہ کتابیں اشاعت کے لیے پیش کی جاتی تھیں۔ 1917 سے لے کر پولیس ایکشن یعنی 1948 تک دارالترجمہ میں انگریزی کتابوں کے اردو میں ترجمے ہوتے رہے۔ 1950 کے بعد ترجمے کا سلسلہ نئی حکومت کی جانب سے جامعہ عثمانیہ کے ذریعہ تعلیم، اردو کے بجائے انگریزی مقرر کرنے کی وجہ سے ختم کردیا گیا۔ غرض دارالترجمہ کے ملازمین کو دوسرے شعبہ جات میں ضم کردیا گیا اور 18 اگست 1955 کی رات کو دارالترجمہ کے ذخیرے میں آگ لگنے کی وجہ سے ترجمہ شدہ نادر و نایاب کتابیں جل کر خاکستر ہوگئیں، اس طرح 33 سالہ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کی جانب سے پیش کی جانے والی کتابوں کی تاریخی روایت کے تمام باب بند ہوگئے۔ دارالترجمہ سے شائع شدہ کتب کے ذخیرے کشمیر یونیورسٹی لائبریری، بنگلور اور میسور یونیورسٹی کی لائبریری کے علاوہ پاکستان کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔

مختلف اداروں کے علاوہ شخصی اور ذاتی ذمے داروں نے بھی شہر حیدرآباد میں تصنیف وتالیف کے سلسلے کو دراز کیا۔ حیدرآباد کے ایک بہت بڑے علاقے کو آج بھی چھتہ بازار کے نام سے شہرت حاصل ہے، جہاں کتابوں، رسالوں اور جرائد کی اشاعت کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ اس علاقے میں بے شمار پریس اور ان کے مالکان اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ حیدرآباد میں سب سے پہلے خانگی پریس کی بنیاد رکھنے والے افراد کا تعلق اس شہر کے محلہ منظیورہ سے تھا، جہاں سب سے پہلا پریس "اعظم اسٹیم پریس" کے نام سے قائم کیا گیا۔ حیدرآباد کا یہ سب سے بڑا اور اہم پریس تھا، جہاں سنگی چھاپہ خانہ موجود تھا۔ اس پریس سے بے شمار کتابیں شائع ہوئیں، جس کے بعد نیکل فائن پرنٹنگ پریس کی بنیاد رکھی گئی۔ یہ پریس چارمینار کے قریب چارکمان کی مسجد کے پیچھے واقع تھا۔ اسی طرح منڈی میر عالم میں رفیق مشین پریس قائم کیا گیا اور اس پریس سے بھی بے شمار کتابیں شائع ہوتی رہیں۔ آزادی کے بعد چھتہ بازار میں دو بڑے اہم پریس قائم ہوئے، جو اعجاز پرنٹنگ پریس اور دائرہ پریس کے نام سے شہرت رکھتے ہیں۔ حیدرآباد سے شائع ہونے

1950 کے بعد ترجمے کا سلسلہ نئی حکومت کی جانب سے جامعہ عثمانیہ کے ذریعہ تعلیم ، اردو کے بجائے انگریزی مقرر کرنے کی وجہ سے ختم کردیا گیا غرض دارالترجمہ کے ملازمین کو دوسرے شعبہ جات میں ضم کردیا گیا اور 18 اگست 1955 کی رات کو دارالترجمہ کے ذخیرے میں آگ لگنے کی وجہ سے ترجمہ شدہ نادر و نایاب کتابیں جل کر خاکستر ہوگئیں، اس طرح 33 سالہ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کی جانب سے پیش کی جانے والی کتابوں کی تاریخی روایت کے تمام باب بند ہوگئے۔

والے اخبارات کی بھی طویل فہرست ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں سب سے قدیم روزنامہ 'صحیفہ' اس لیے اہمیت کا حامل قرار دیا جاتا ہے کہ اس اخبار کے توسط سے حیدرآباد کی شناخت بنی۔ اس کے بعد 'نظام گزٹ'، 'سلطنت'، 'ریاست' اور 'رہبر دکن' جیسے اخبارات وقفے وقفے سے شائع ہوتے رہے، جنھیں آزادی سے قبل بڑی شہرت حاصل تھی، تاہم بیشتر اخبارات خانگی چھاپہ خانے میں شائع ہوتے تھے۔ آزادی کے بعد اردو اخبارات کے مدیروں نے بھی اپنے چھاپہ خانے قائم کرلیے۔ حیدرآباد کو کسی وقت بھی تلگو، ہندی اور دوسری زبانوں کی کتابوں کی اشاعت کے مرکز کا درجہ حاصل نہیں رہا۔ چونکہ حیدرآباد کی شناخت اردو شعر وادب کے توسط سے تھی اور اس علاقے میں اس کی ترقی وترویج پر خصوصی توجہ دی گئی، اس لیے اٹھارھویں صدی سے لے کر ہندوستان کی آزادی تک اور آزادی کے بعد عصر حاضر تک ریاست حیدرآباد اور پھر اس کے انضمام کے بعد ریاست آندھرا پردیش کی تشکیل تک شہر حیدرآباد ہی نہیں بلکہ ہر بڑے شہر میں بے شمار چھاپہ خانے قائم ہوگئے اور اردو کی کتابوں کی اشاعت بھی دوسری زبانوں کے چھاپہ خانوں میں ممکن ہوگئی، کیونکہ اشاعت کو زبان کی بنیاد پر نہیں، بلکہ تجارت کی حیثیت سے شہرت حاصل ہوگئی۔ اس طرح رفتہ رفتہ طباعت واشاعت کے محدود دائرے وسیع ہونے لگے۔ اس طرح اب حیدرآباد میں کئی مشہور مطابع قائم ہیں، جن کے توسط سے طباعت اور اشاعت کا کام جاری ہے اور توقع کی جاسکتی ہے کہ شہر حیدرآباد نے اپنے مطبع یمین شمس الامرا کے سنگی چھاپہ خانہ سے لے کر زائد از ڈیڑھ سو سال میں جس قدر کتابیں شائع کی ہیں، اس کی اساس پر ہندوستان میں شہر حیدرآباد کو چوتھے اشاعتی مرکز کا درجہ حاصل ہوجاتا ہے، جس کے مطابق دہلی کو اولیت حاصل ہے، جہاں سب سے زیادہ اردو کی کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ ملک کی تقسیم کی وجہ سے لاہور اور کراچی کو پاکستان کے علاقوں کی نمائندگی حاصل ہوئی، اس لیے ہندوستان میں دہلی کے بعد لکھنؤ کو دوسرے اشاعتی مرکز کا درجہ حاصل ہے، جب کہ شہر رامپور اپنی اشاعتی سرگرمیوں کی وجہ سے تیسرا مقام حاصل کرلیتا ہے اور حیدرآباد کو تصنیف وتالیف کی سرگرمیوں میں چوتھا مقام حاصل ہے۔ اس طرح حیدرآباد کے شاعر اور ادیب اپنی تصانیف کی اشاعت کے ساتھ ساتھ علوم وفنون کی ترقی وترویج میں سرگرم نظر آتے ہیں۔ اس علاقے میں ادبی کارناموں کی کثرت ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی علوم وفنون کی کتابیں بھی جس کثرت سے حیدرآباد کی سرزمین سے شائع ہوتی ہیں، اس کی مثال ملک کے دوسرے شہروں سے حاصل ہونی مشکل ہے۔ ادب اور ادبیات کے علاوہ علوم وفنون کی کتابوں کے ذخیروں کو اردو میں عام کرنے کا جو سلسلہ حیدرآباد سے شروع ہوا ہے، اس سلسلے کی نظیر ہندوستان کے کسی بھی شہر سے حاصل ہونی مشکل ہے۔ اس کے علاوہ تصنیف و تالیف، تحقیق وتنقید اور شعر وادب کی ترقی وترویج میں آزادی سے قبل اور آج بھی جس قدر حیدرآباد کی خواتین سرگرم عمل ہیں اور ان کی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ جاری ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حیدرآباد کے مرد حضرات کے شانہ بہ شانہ خواتین بھی اشاعتی سرگرمیوں سے وابستہ ہوکر حیدرآباد کی ساکھ بڑھانے میں پوری طرح مصروف نظر آتی ہیں۔

Prof. Majeed Bedar Ex. Head, Dept. of Urdu, Jamia Usmania, Hyderabad- 500007 (AP)

بیسویں صدی کا ایک گمنام شاعر

علیم اختر مظفرنگری

یہ اردو ادب کا المیہ نہیں تو اور کیا ہے کہ ایسے بے شمار فنکار گمنامی کے اندھیرے میں کھو گئے یا پھر گروپ بندی کے تحت نظر انداز کر دیے گئے جو اپنے وقت کے عظیم فنکار تھے جن کی تخلیقات اعلا درجے کی ہیں۔ جب ہم گمنام فنکاروں کی دستیاب تخلیقات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اس امر کو سمجھنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگتی کہ ان کا کلام اور ان کی تخلیقات کس نوعیت کی ہیں۔ نہ جانے کیوں ابھی بھی لوگ لکیر کے فقیر بنے ہوئے ہیں کہ گنے چنے شعرا و ادبا پر ہی مضمون نویسی کرتے رہتے ہیں۔ ضرورت ہے ہمیں ایسے شعرا و ادبا پر کام کرنے کی جن پر بہت کم لکھا گیا ہے یا لکھا ہی نہیں گیا ہے۔ تاکہ نئی نسل ان کے کارناموں اور تخلیقات سے متعارف ہو سکے۔ علیم اختر مظفرنگری اپنے وقت کے مستند کہنہ مشق اور اعلیٰ پایہ کے فن کار رہے مگر وہ بھی فراموش کر دیے گئے جبکہ ان کے فن کا اعتراف ان کے ہم عصر جیسے فراق، ڈاکٹر اعجاز حسین، مانی جائسی، جوش ملیح آبادی، جگر مراد آبادی، حسرت موہانی وغیرہ نے تحریری طور پر کیا۔ ڈاکٹر اعجاز حسین موصوف کے شعری مجموعہ 'مکہت گل' یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

"آج میں 'نکہت گل' سے اپنے دل و دماغ کو متاثر پاتا ہوں، ایک وجدانی کیفیت محسوس کرتا ہوں اور یہ مختصر سا مجموعہ مجھے کئی لحاظ سے قابل قدر معلوم ہوتا ہے۔ اس کو پڑھ کر یہ احساس قوی تر ہو جاتا ہے کہ ابھی صنف غزل میں بڑی جان ہے۔ اس کی رعنائی اور توانائی کے امکانات ختم نہیں ہوئے۔"

جگر مراد آبادی کے الفاظ بھی ملاحظہ فرمائیے:

"عزیز موصوف" قابل مبارک باد ہیں کہ ان کے کلام نے ان کی زندگی ہی میں شہرت و مقبولیت حاصل کر لی۔ مجھے یقین ہے کہ مستقبل قریب ہی میں انھیں پورا ہندوستان اپنے دیدہ و دل میں جگہ دے گا اور ان کی ادبی شخصیت غیر فانی بن جائے گی۔" (نکہت گل: صفحہ۔ 06)

اور اسی کے ساتھ مولانا حسرت موہانی علیم اختر کی فنی صلاحیتوں کا یوں منظوم اعتراف کرتے ہیں:

علیم اختر، عزیز از جان حسرت
ترے اشعار میں ہے شان حسرت
غزل کو اک بیان شوق دے کر
نکالے تو نے سب ارمان حسرت

مولانا علیم اختر مظفرنگری کے جد امجد شہنشاہ وقت اورنگزیبؒ کے زمانے میں قصبہ سکیری (مظفرنگر، یوپی) میں آ کر سکونت پذیر ہوئے۔ اورنگزیب نے ان کے جد امجد کو مظفرنگر کے قرب و جوار کے قصبات بطور جاگیر عنایت کیے۔ ان کے اسلاف کا شجرۂ نسب سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ملتا ہے۔ یہ خاندان قاضیوں کا خاندان کہلاتا ہے اور مغربی اتر پردیش کے جتنے بھی صدیقی حضرات ہیں، وہ سب اسی سلسلے کی کڑی ہیں۔ 1857 کی پہلی جنگ آزادی میں اہل قصبہ کے نام باغیوں کی فہرست میں آ گئے تھے جس کی وجہ سے ان کی جاگیریں ضبط کر لی گئی تھیں۔ چنانچہ مولانا علیم اختر کے دادا (عبداللہ) کو اپنا وطن ترک کرنے پر مجبور ہونا پڑا اور قریب کے ایک گاؤں "حسین پور بہیرا" جسے اب بہیڑا کہتے ہیں، میں بود باش اختیار کی۔ ان کے والد کا نام قاضی محمد عمر صدیقی تھا جو اپنے زمانے کے مثالی معلم اور معتبر شاعر تھے۔ والدہ کا نام جمیلہ بانو تھا۔ علیم اختر کے والد ایک دیندار انسان تھے۔ معلمی کے پیشے کے باعث منشی جی کہلاتے تھے۔ منشی محمد عمر کے زیر سایہ کتنے ہی نونہال پنپ رہے تھے، انھی نونہالوں میں شاعر مزدور احسان دانش کا نام بھی ہے۔ کیونکہ دوران ملازمت انھوں نے مختلف مقامات پر درس و تدریس کے فرائض انجام دیے۔ کاندھلہ (احسان دانش کا وطن) میں ان کی پوسٹنگ رہی۔ جہاں پر احسان دانش نے ان سے تعلیم حاصل کی۔ منشی محمد عمر ایک معلم ہونے کے ساتھ متوسط زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔

علیم اختر نے اپنی تصنیف 'دلی میری بستی میرے لوگ' میں علیم اختر مظفرنگری کی تاریخ پیدائش دسمبر 1914 درج کی ہے مگر مالک رام نے اپنی تصنیف 'تذکرہ معاصرین: جلد دوم' میں صفحہ 50 پر 06 جون 1914 رقم کی ہے۔ ماہنامہ رسالہ 'شاعر' اپریل 2004 میں بھی موصوف کی یوم ولادت 06 جون 1914 تحریر فرمائی ہے۔ راقم الحروف نے اس اختلاف کو دور کرنے کے لیے عظیم اختر فرزند علیم اختر سے ملاقات کی اور ولادت کے متعلق گفتگو کی۔ عظیم اختر نے فرمایا کہ مالک رام ان (علیم صاحب) کے دوست اور ہم عصر تھے نیز ان کی بات زیادہ معنی رکھتی ہے۔ بہرکیف مطلع صاف ہو گیا۔ اور ہم 6 جون 1914 کو ہی فوقیت دیں گے۔ والد محترم نے ان کا نام عبدالعلیم تجویز فرمایا تھا لیکن اپنے تخلص اور تخلیق کی نسبت سے علیم اختر مظفرنگری سے معروف ہوئے۔ علیم اختر تین بھائی بہنوں میں سب سے بڑے تھے بہن کا نام سلمیٰ بیگم اور بھائی کا نام عبدالسلیم تھا۔

علیم اختر کی ابتدائی تعلیم حسب دستور زمانہ گھر پر ہی ہوئی۔ دینیات کی تعلیم اپنے والد محترم محمد عمر کے زیر سایہ حاصل کی اور مذہب سے متعلق جو بھر پور علم تھا، وہ بے ضابطہ طور سے بزرگان دین کی صحبتوں سے حاصل ہوا۔ انھوں نے مستقل طور پر کسی مدرسے سے دینی تعلیم حاصل نہیں کی۔ عصری علوم کے ساتھ اپنے والد بزرگوار سے ہی عربی و فارسی نیز مذہبی امور میں دسترس حاصل کی۔ اس کے بعد گورنمنٹ انٹر کالج مظفرنگر میں داخلہ لیا۔ یہاں محمد

اسحاق الم مظفرنگری جیسے مشفق استاد نے ان کی شخصیت میں چار چاند لگا دیے۔ نیز انھوں نے 1937 میں میٹرک اور 1939 میں ایف اے کا امتحان پاس کیا۔ آگے کی تعلیم وسائل و ذرائع کے فقدان کے باعث جاری نہ رہ سکی۔

ایف اے کرنے کے بعد تین سال تک خالی رہے۔ اس درمیان ایک مقامی زمیندار کے یہاں ملازمت کر لی، جہاں وہ زمینداری کی نگرانی کا کام انجام دیتے تھے۔ اس کے بعد جب 1939 میں دوسری جنگِ عظیم چھڑ گئی تو فوجیوں کی ضروریات کا خیال رکھتے ہوئے انگریزی سرکار نے کمبل بافی کے کارخانے قائم کیے۔ یہ کام بڑے پیمانے پر ہوتا تھا۔ منڈی سے اون کی خریداری سے لے کر بافندگان تک کا تمام کام سرکاری ملازموں کے سپرد تھا۔ علیم اختر نے اسی ڈپارٹمنٹ میں 25 روپے ماہانہ پر ملازمت کر لی۔ اس ملازمت کے دوران وہ مظفرنگر، بڑا، امروہہ، جانسٹھ، کیرانہ وغیرہ مختلف مقامات پر کام کرتے رہے۔ آہستہ آہستہ تنخواہ میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ اور یہ تنخواہ 25 روپے سے لے کر 70 روپے ماہوار ہو گئی۔ افسران وغیرہ بھی ان کے کام سے خوش تھے۔ لیکن 1941 میں یہ اچھی خاصی نوکری چھوڑ کر آئی سی ایس میں نوکری کرنے کا سودا لیے ہوئے کانپور پہنچ گئے۔ اس امر کا ذکر انھوں نے اپنے مضمون 'ایک علم دوست اردو نواز انگریز' میں کیا ہے۔ چنانچہ شعبۂ مالیات کے سپر وائزر کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ کانپور سے ٹرانسفر ہو جانے کی وجہ سے ناگپور جانا پڑا۔ ناگپور میں سرطان کی بیماری کا شدید حملہ ہوا۔ اس کے موجب سولہ مہینے طویل تعطیل علالت لینی پڑی۔ نتیجہ ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑا۔ 1946 میں صحت یاب ہونے کے بعد علیم اختر دلی تشریف لے آئے تاکہ کنٹرولر جنرل کے دفتر سے دوبارہ ملازمت کا پروانہ حاصل کر سکیں۔ مگر اس میں کامیابی نہ مل سکی۔ زندگی گزارنے کے لیے دلی میں قیام کے دوران انھوں نے مختلف رسائل میں کام کیا۔ بالآخر ہندوستان کی آزادی کے بعد 1948 میں انھوں نے مستقل طور سے ماہنامہ 'شمع' کے دفتر میں ملازمت کر لی۔

تقریباً ربع صدی تک علیم اختر ماہنامہ 'شمع' میں بحیثیت مدیر بحسن وخوبی فرائض انجام دیتے رہے۔ یہ اردو رسائل و اخبار کا المیہ رہا ہے کہ جریدہ کے مالک کا نام ہی ایڈیٹر کی حیثیت سے نوشتہ ہوتا ہے اور جفاکشی و آبیاری نیز پروان چڑھانے والے کا نام گمنامی کی دنیا میں گم ہو جاتا ہے۔ لیکن حقیقت سے کوئی منحرف نہیں ہو سکتا۔ علیم اختر وہ شخص تھے کہ جنھوں نے مسلسل 24 برس بڑے انہماک سے 'شمع' کو فرش سے عرش پر پہنچا کر ماہِ کامل کی مانند درخشاں و تابندہ بنایا تھا۔

ویسے تو علیم اختر نے نثر، صحافت اور شاعری کی بھی اصناف میں اپنی لیاقت کے جوہر دکھائے مگر بالخصوص وہ غزل کے میدان کے شہسوار تھے۔ علیم اختر مظفرنگری کی کل کائنات شاعری حسن و عشق پر منحصر ہے۔ اس حسن و عشق میں ہمہ طور پر جمالیات کی کارفرمائی ہے۔ علیم اختر بیسویں صدی کے ان گنے چنے شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں جنھوں نے تغزل اور فنِ جمالیات کا حق ادا کیا۔ جہاں تک ان کی غزل گوئی، شاعری کے موضوعات اور اسالیبِ فکر کا تعلق ہے، اس میں وہ محبوب کے زلف و کاکل اور گل و بلبل تک ہی محدود نہیں رہے بلکہ ان کے موضوعات کا دائرہ وسیع ہے۔

علیم اختر کی شاعری کو اگر ہم موضوعات کی نوعیت سے دیکھیں تو ان کی شاعری میں مذکورہ بالا اوصاف نظر آتے ہیں۔ جیسا کہ ان کی شاعری کا وصفِ خاص حسن و عشق کی کائنات ہے اور اس حسن و عشق کی شاعری میں جذبات کی فراوانی کا احساس قدم قدم پر ہوتا ہے نیز اس

علیم اختر کے یہاں عشق کے میدان میں جذبوں کی تہہ میں جو نئے نئے شگوفے کھلتے ہیں، ان کا یہ عشق نیا رنگ وآہنگ اور سمت اختیار کر لیتا ہے۔ یہ گونا گوں پہلوؤں کی پردہ پوشی میں آنکھ مچولی کرتا ہے، جس کی وجہ سے ان کا جذبۂ عشق پیچیدہ اور گنجلک ہو جاتا ہے اس پیچیدگی کے باعث یہ جذبۂ عشق دب کر رہ جاتا ہے۔ علیم اختر کے جذبۂ عشق کو یہ مبہم سا احساس ہوتا ہے کہ وہ کدھر جائے؟ کس نہج کو اختیار کرے؟ اس کی منزل مقصود کیا ہے؟ وہ کشمکش کا شکار نظر آتا ہے۔

جذبات کی فراوانی میں رنج و غم، حسرت و مسرت، رحم و جبر، جور و ستم، محبت و نفرت، بغض و حسد و کینہ اور ہجر و وصال جیسے پہلو نمایاں ہیں۔ ان کا عشق ماورائی نہیں ہے بلکہ حقیقت پسند اور ارضیت کا مظہر ہے اور اس حقیقی عشق میں خوشی بھی ہے، رنج بھی ہے، ہجر بھی ہے، وصال بھی ہے، جور و جبر بھی ہے، لطف و کرم بھی ہے، آہ بھی ہے، کسک بھی ہے، تڑپ بھی ہے، اندوہ بھی ہے، غیرت و حمیت بھی ہے، لحاظ و پاس بھی ہے، شرم و حجاب بھی ہے، چاشک بھی ہے، طنز بھی ہے، شکوہ و شکایت بھی ہے، روٹھ جانے اور راضی ہو جانے والی کیفیت بھی ہے اور ان سب کے ساتھ تصوف کی چاشنی بھی ہے جو خارجیت سے داخلیت کا، مجاز سے حقیقی کا، ظاہر سے باطن کا احساس دلاتی ہے اور یہ حالاتِ زندگی سے لڑنے کا حوصلہ عزم بھی سکھلاتی ہے۔

لیکن مذکورہ تمام باتوں کے اثبات کے ساتھ اس حقیقت اور اس پہلو سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ علیم اختر کا جو موضوع غزل ہے اور عشق کے ساتھ وہ جن باتوں کا ذکر اپنی شاعری میں کرتے ہیں، وہ ان باتوں کو صراحت و وضاحت کے ساتھ بیان نہیں کر پاتے ہیں۔ علیم اختر کے یہاں عشق کے میدان میں جذبوں کی تہہ میں جو نئے نئے شگوفے کھلتے ہیں، ان کا یہ عشق نیا رنگ وآہنگ اور سمت اختیار کر لیتا ہے۔ یہ گونا گوں پہلوؤں کی پردہ پوشی میں آنکھ مچولی کرتا ہے، جس کی وجہ سے ان کا جذبۂ عشق پیچیدہ اور گنجلک ہو جاتا ہے اس پیچیدگی کے باعث یہ جذبۂ عشق دب کر رہ جاتا ہے۔ علیم اختر کے جذبۂ عشق کو یہ مبہم سا احساس ہوتا ہے کہ وہ کدھر جائے؟ کس نہج کو اختیار کرے؟ اس کی منزلِ مقصود کیا ہے؟ وہ کشمکش کا شکار نظر آتا ہے۔ وہ کچھ فیصلہ صادر نہیں کر پاتا ہے اور جب یہ کچھ فیصلہ صادر نہیں کر پاتا ہے تو یہ بدحواسیہ و لایعنیہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یایں ہمہ الجھاؤ کا فنکار اپنا منہاج و راستہ بھول جاتا ہے۔ مگر اس الجھاؤ میں فنکار کا قلم ایک ایسا راستہ اختیار کر لیتا ہے جس کا اسے بھی احساس نہیں ہوتا ہے نیز نئے فن پارے کی تخلیق ہوتی ہے۔ اس ضمن میں ذیل کے اشعار ملاحظہ فرمائیں:

دل سے بہت قریب نظر آ رہے ہو تم
عنوان زندگی کا بنے جا رہے ہو تم

اللہ رے فروغ امید و ضیائے شوق
اک آفتاب ڈھال رہے ہیں کرن سے ہم

اب آ سکے نہ یاد بھی تجھ کو خدا کرے
لے اٹھ کے جا رہے ہیں تیری انجمن سے ہم

اب بار بار ان کی ندامت کا ہے خیال
اٹھنے کو تو اٹھ آئے ہیں انجمن سے ہم

عورت کے حسن و جمال کا ذکر ہو اور انسان پر محو ہو جانے والی اور مر مٹنے والی کیفیت طاری نہ ہو غیر ممکن ہے۔ جب حسن و جمال کی بات ہوتی ہے تو اس کے ساتھ ہائے، ارے توبہ، اللہ اللہ والی کیفیت شروع ہو جاتی ہے۔ علیم اختر محبوب کے حسن و جمال پر مر مٹنے والی حالت کو بھی بحسن وخوبی فنکارانہ مہارت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں پایا جانے والا یہ انداز دل کے تاروں کو چھیڑتا ہے، گدگداتا ہے، گرماتا ہے اور دماغ میں سرمستی،

سرور، نشہ اور خمار پیدا کرتا ہے۔ یہ سر چڑھنے والا انداز محبوب کی اداؤں کے باعث دل کو تڑپاتا بھی ہے اور انتظار بھی کرواتا ہے۔ اشاروں و کنایوں میں بات بھی ہوتی ہے۔ علیم اختر اپنے یہاں ان کیفیات کو جمالیاتی تناظر میں بڑی فن کاری، معنی خیزی اور عمدگی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل اشعار پر غور فرمائیں:

جام رنگیں تو نے لوٹ لیا
ہائے رے غم تو نے لوٹ لیا
غمزۂ دل ربا نے لوٹ لیا
ان کی اک اک ادا نے لوٹ لیا
ہے آج مجھ کو میزبانی کا شرف اختر
مہ و خورشید ہو جائیں بہم ایسا بھی ہوتا ہے
نگہِ ناز کے انداز تغافل پہ نثار
عشق کا ذوق الم اور نکھر جاتا ہے
کیسی خوشبو سے مہک اٹھی ہے دل کی محفل
کیا تری یاد سے سرشار ہوئی جاتی ہے

محبوب کے حسن و جمال کی تحریف فریفتگی کی طرف، اور فریفتگی بے خودی، سرمدی، سرمستی اور سکر کے عالم کی طرف لے جاتی ہے۔ اب عاشق بے خودی و سکر کے مقام پر آ جاتا ہے۔ یہ حسن و عشق کا تیسرا اور آخری درجہ ہوتا ہے۔ اس درجے و مقام پر آ کر عاشق کہہ اٹھتا ہے کہ نہ مجھ کو اپنی خبر ہے نہ دنیا کی خبر ہے۔ بے خودی کی اس کیفیت میں اسے اپنے کپڑوں تک کی بھی پرواہ نہیں رہتی ہے وہ اپنے چاک و گریبان کے تار تار ہونے سے بے خبر رہتا ہے۔ یہ بے خودی کی کیفیت علیم اختر کے یہاں جگہ جگہ دکھائی دیتی ہے۔ بطور نمونہ چند اشعار زیر ساعت:

عالمِ حیرتِ نظارگیِ شوق نہ پوچھ
کوئی جلوہ ہے نہ خود اپنی خبر ہے کوئی
ہر التفاتِ حسن فسوں گر سے بے نیاز
اکثر گزر گیا ہوں انہیں دیکھتا ہوا
میرا ہی عزم جستجوئے شوق تو نہیں
یہ کون پھر رہا ہے مجھے ڈھونڈتا ہوا
پوچھتے پوچھتے ہم کسی کا پتا
پوچھتے پھر رہے ہیں اب اپنا پتا
میری نگاہِ شوق کی دوشیزگی نہ پوچھ
پھولوں جمال ناز بھی دیکھا گیا مجھے

علیم اختر اگر اپنے کلام میں محبوب کے ایک ایک اعضا کا ذکر بڑے رومانی و جمالیاتی انداز میں کرتے ہیں اور اس رومانی فضا میں فریفتگی اور بے خودی کا عالم پیدا کرتے ہیں تو دوسری جانب وہ اپنے کلام میں محبوب کے روٹھ جانے، دل کے مجروح ہو جانے، نشہ طاری ہو جانے، درد رگِ جان ہو جانے بجملہ تمام وجوہات کو اپنی شاعری میں بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ علیم اختر رنج و غم کے آنے، آتشِ عشق کے ابھرنے وغیرہ کے سبب کو بڑے موثر اور دل آویز پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔ ان کا یہ لہجہ سبب کبھی لجاجت و دعائیہ ہو جاتا ہے اور کبھی سبب کی لپک اختیار کرتا ہوا معاملہ بندی کی شکل میں بدل جاتا ہے۔ قاری کو پڑھتے وقت شاعر کی آواز اس کو اپنی آپ بیتی محسوس ہوتی ہے لیکن کبھی کبھی یہ معاملہ تنقید کی راہ بھی تان لیتا ہے جس کے باعث قاری جھنجھلاہٹ اور بوریت کا احساس کرنے لگتا ہے۔

اس ضمن میں چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

ہمیں جرأتِ اظہار آرزو بھی نہیں
خفا ہیں آپ تو کچھ وجہ برہمی بھی تو ہو
روز یاد کرتے ہیں ہم ترے تغافل کو
کیا ترے تغافل کو ہم بھی یاد آتے ہیں
ویسے تو مرے حال پہ ہنستا ہے زمانہ
یہ کیا میں تری آنکھ بھی نم دیکھ رہا ہوں

متذکرہ موضوع کے علاوہ علیم اختر کے کلام میں تصورِ غم، تصوف، اساطیری داستان، تلمیحات، حسن و عشق، محبت، عصریت، وطنیت وغیرہ کے موضوعات کی کارفرمائی ہے۔ جمالیاتی فضا ان کے پورے کلام میں جلوہ گر ہے نیز متصوفانہ جمالیات، حسن و عشق اور محبت کی جمالیات، دیو مالائی عناصر کی جمالیات کے ساتھ آئینہ و زلف و کاکل سے پیدا ہونے والی جمالیات کا ذکر بھی علیم اختر اپنی شاعری میں بجا طور پر کرتے ہیں۔ علیم اختر نے اپنی شاعری میں جن دیو مالائی عناصر کا ذکر کیا ہے ان میں شری کرشن کے ہی صفاتی ناموں کو مستعار لیا ہے۔ دوسرا کردار رادھا کا اور تیسرا گوپیوں کا ہے۔ جن دیو مالائی عناصر کا ذکر کیا ہے ان میں زیادہ تر ان کرداروں سے متعلق افعال و حرکات کو پیش کیا ہے۔ علاوہ ازیں ہندو تہذیب کے مطابق ہونے والے اعمال اور رسم و رواج کا جمالیاتی نقشہ بھی علیم اختر بہت فنکاری و متانت کے ساتھ کھینچتے ہیں۔ کرشن کے صفاتی نام پریم رس کے وہ جمالیاتی کردار ہیں کہ جن کے ذکر سے داغِ عشق نمایاں ہو جاتا ہے اور جب کرشن کے ساتھ گوپیوں اور رادھا کا بھی ذکر ہو تو داغِ عشق سودائے عشق بن جاتا ہے۔ پریم رس کی حلاوت و سوزش کی آمیزش میں محبوب و عاشق عجیب قسم کا حظ اور جمالیاتی و روحانی انبساط حاصل کرتے ہیں۔ علیم اختر کے یہاں شیام کی بانسری سے نکلنے والی آواز اور رادھا کے راگ کی لے اور گیت کی تان کا تصور بے حد جمالیاتی انداز کے ساتھ پایا جاتا ہے اور یہ جمالیاتی تصور کس کے ذہن کے تاروں کو نہ چھیڑے گا اور دل کو گدگدائے گا نہیں۔ شیام کی بانسری کی آواز کا تصور بے حد خوب صورت اور لطیف آہنگ جو انسان کے ذہن تک پہنچتا ہے وہ کانوں میں ایک رس گھولتا ہے، بے شمار پیکر نمودار کرتا ہے تو دوسری جانب کنہیا کے ساتھ رادھا کے راگ کی لے اور گیت کی تان مدہوش و مدمست تشنگی کا احساس دلاتی ہے جس سے دل پر وجد طاری ہوتا ہے۔ علیم اختر شیام کی بانسری کی آواز اور رادھا کے مدھر گیتوں کی لے، سحر انگیزی و عجیب و غریب تشنگی شعور کو بڑے فنکارانہ طریقے سے اپنی شاعری میں پیش کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں بطور نمونہ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

اللہ اللہ ترے انداز بیاں کی سوغات
گوپیاں لائی ہیں رادھا کی نگاہوں کا سلام
گوپیاں یادوں کی لے چھیڑتی ہیں بار بار
جب لبوں پر دفعتاً رادھا کا نام آ جاتا ہے
جیسے رادھا کے مدھر راگ کی لے، گیت کی تان
لے کے گوکل سے کنہیا کا پیام آئی ہے
یوں دل میں کھنکتی ہے تری یاد کی پائل
رادھا کے مدھر راگ کی آواز ہو جیسے

بحیثیت مجموعی کہا جا سکتا ہے کہ علیم اختر کی کائنات شاعری میں کلی طور سے جمالیاتی فضا جلوہ گر ہے۔ اس جمالیاتی فضا نے نہ ان کے کلام کو رومانی و انبساطی بنایا ہے بلکہ اس جمالیاتی وصف سے ان کے فن کو بھی جلا ملی ہے جو قارئین و سامعین حضرات کے اذہان پر دیرپا فنی چمک و دمک برقرار رکھتی ہے نیز علیم اختر کا یہ جمالیاتی وصف ہی قاری کو بوریت کا احساس ہونے نہیں دیتا۔

علیم اختر کی ذہانت، دیدہ ریزی اور خیالات سے متعلق سرسری تہوں میں جھانکنے کا عمل ان کی کل کائنات شاعری کے مطالعے سے عیاں ہے کہ کس طرح انہوں نے ایک ماہر نباتات کی طرح قدرت کی ہر شے کا تجزیہ کر کے جمالیات کو اپنی شاعری میں سمو لیا ہے۔

علیم اختر کے یہاں جمالیاتی قدروں کا وہ وصف ہے جس سے ان کے کلام میں تازگی، شگفتگی، سرمستی کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔

■

Dr. Mohd. Mustaqim; Haryana Urdu Academy, IP-16, Sector-14, Panchkula-134113, Mobile. 09023746092

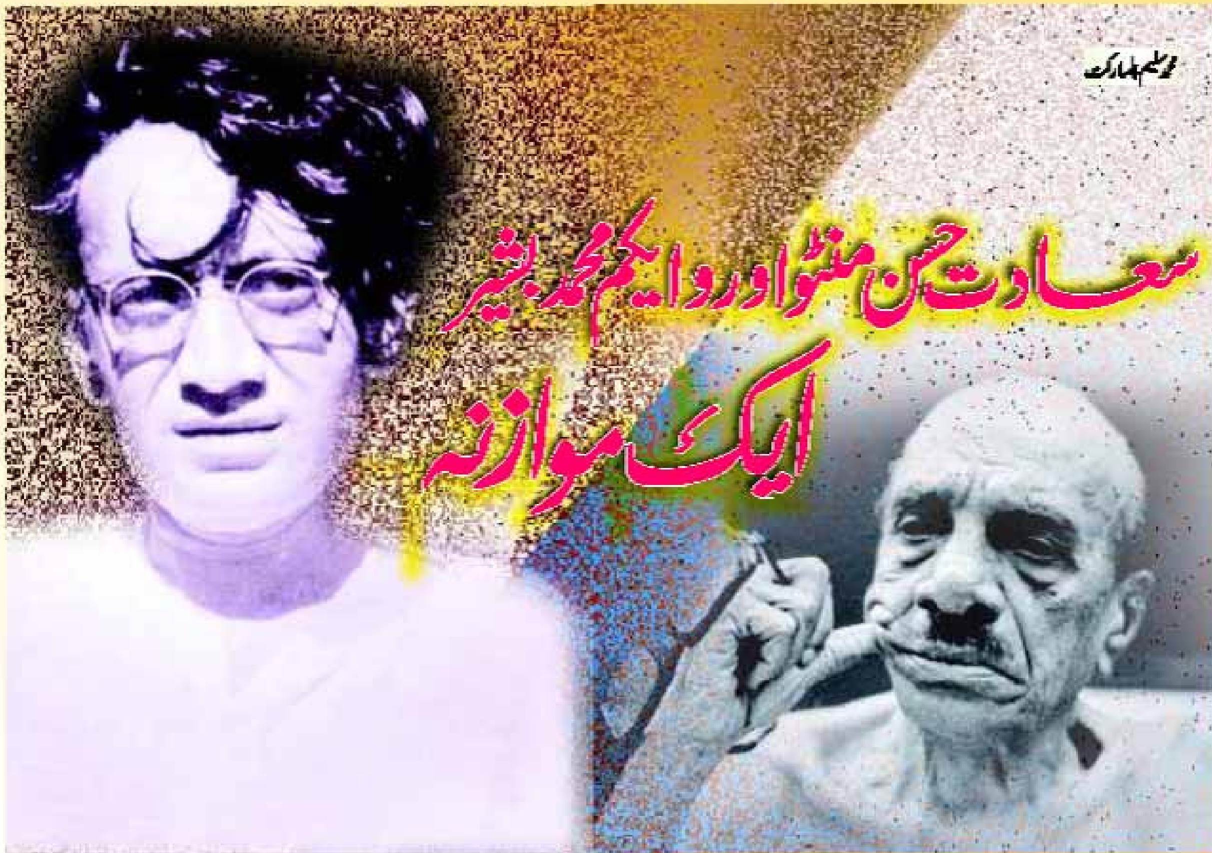

سعادت حسن منٹو اور وائیکم محمد بشیر
ایک موازنہ

محمد سلیم مبارک

ہم عصر شعرا و ادبا کے درمیان موازنے کا رواج اردو ادب میں پہلے سے ہی موجود تھا جبکہ بعض شعرا و ادبا کو حریفین کے نام سے بھی ہم یاد کرتے ہیں جیسے انیس و دبیر، غالب و ذوق، میر حسن و دیا شنکر نسیم، میرامن دہلوی و رجب علی بیگ سرور، ملا وجہی و غواصی وغیرہ اہم ہیں۔ آج کل دو زبانوں کے یا مختلف زبانوں کے ادب یا ادیبوں کے مابین موازنہ ہوتا ہے۔ Comparetive Literature کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ دیگر زبان و ادب، تہذیب اور افکار کو نہایت قریب سے دیکھنے کا موقع مل جاتا ہے۔

یہاں اردو کے ایک عظیم افسانہ نگار سعادت حسن منٹو اور ملیالم کے ایک بلند پایہ ادیب وائیکم محمد بشیر کے درمیان ایک تقابلی مطالعہ مقصود ہے۔ دونوں ہندوستان کے دو لسانی خاندان کے الگ الگ فنکار ہیں، لیکن ان کی زندگی اور فن میں کچھ اختلافات کے باوجود بہت سی مماثلتیں پائی جاتی ہیں۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ دونوں کو اپنی زبان کی افسانہ نگاری میں بلند مرتبہ حاصل ہے۔ ان کے افسانہ لکھنے سے ہی جدید اردو افسانے کا آغاز ہوا تھا۔ اسی طرح وائیکم محمد بشیر نے بھی ملیالم مختصر افسانے کو نئی جہت اور رنگ دے کر ایک نئی راہ دکھائی تھی۔ ان کے افسانے سے ہی ملیالم افسانے میں صحیح طور پر حقیقت نگاری کی ابتدا ہوئی ہے۔ دونوں حقیقت نگار فنکار ہیں۔ منٹو نے کہا تھا:

"زمانے کے جس دور سے ہم گزر رہے ہیں اگر آپ اس سے واقف ہیں تو میرے افسانے پڑھیے۔ اگر آپ ان افسانوں کو برداشت نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ زمانہ ناقابل برداشت ہے۔ مجھ میں جو برائیاں ہیں وہ اس عہد کی برائیاں ہیں۔ میری تحریر میں کوئی نقص نہیں۔ جس نقص کو میرے نام سے منسوب کیا جاتا ہے وہ دراصل موجودہ نظام کا نقص ہے۔"

(لذت سنگ، منٹو ص 20)

منٹو کی طرح محمد بشیر کے افسانے بھی حقیقت پرمبنی ہیں۔ انسانی زندگی کی پیچیدگیوں کو باریک بینی کے ساتھ بیان کرنے میں دونوں افسانہ نگار کمال رکھتے ہیں۔

بشیر کا افسانہ 'جنم دن' اس کی سب سے عمدہ مثال ہے۔ اس میں ایک ایسے نوجوان کی کہانی بیان کی گئی ہے جو تعلیم یافتہ ہے مگر بے روزگار۔ وہ ملازمت کی تلاش میں شہر آتا ہے۔ بہت دن کی کوششوں کے باوجود نوکری نہیں مل رہی ہے۔ اس دوران ہوٹل کے نوکر سے بھی قرض لینے پر مجبور ہو جاتا ہے اور اپنے جنم دن میں بھوک کے مارے بازو والے کمرے کے لڑکے کا کھانا چوری کر کے کھا جاتا ہے۔ رات میں جب وہی لڑکا کھانے سے فارغ ہو کر کمرے پہنچتا ہے تو وہ رات کا اپنا کھانا پڑوس میں رہنے والے بے روزگار نوجوانوں کو دے جاتا ہے۔ جب وہ دروازے پر دستک دیتا ہے تو ڈر کے مارے بے روزگار نوجوان کے پیٹ میں پورا کھانا ہضم ہو جاتا ہے اور اس طرح اس کا جنم دن گزر جاتا ہے۔

محمد بشیر کے دوسرے افسانے 'بھوک' اور 'ایک انسان' اسی قسم کی کہانیاں ہیں۔ ملیالم کے ایک نقاد ڈاکٹر ایم پی پول نے بشیر کی افسانہ نگاری پر ابتدائی دور ہی میں کہا تھا کہ:

"۔۔۔یہ زندگی سے پھاڑا ہوا ایک ورق ہے۔ اس کے چاروں طرف خون ٹپک رہا ہے۔" (بال کال سکھی، بشیر ص 9)

منٹو اور محمد بشیر کے افسانوں کے موضوعات میں طوائفوں کی زندگی کا خاص دخل ہے۔ نیز دونوں تخلیق کاروں کے افسانوں میں طوائفوں کی نفسیات کی گہری عکاسی ملتی ہے۔ دونوں نے طوائف کے اندر کی عورت کو تلاش کیا ہے۔ شاید دونوں اپنی زبان کے پہلے ادیب ہیں جنھوں نے اس طبقے کو اتنے قریب سے دیکھ کر ان سے ہمدردانہ جذبے کا اظہار کیا ہو۔

بشیر کے افسانے شبدنگل (آوازیں)، وشپ (بھوک)، پاول پیاودرٹے ویشیا (غریبوں کی طوائف)، ہمارا اکچھنو وغیرہ اور منٹو کے افسانے کالی شلوار، ہتک، موکینڈل پاور کا بلب، شاردا وغیرہ اس کی اہم مثالیں ہیں۔ ان دونوں نے اس طبقے کی عورتوں کی مجبوریاں، ان کی مشکلات کی بہت عمدہ تصویر کشی کی ہے۔

انسانی نفسیات خاص طور پر عورت کی نفسیات کو بے باکی کے ساتھ پیش کرنے کی وجہ سے ان دونوں فنکاروں کو بہت ساری جلی کٹی باتیں سننی پڑیں۔ دونوں کے افسانوں پر فحش نگاری کے الزامات بھی لگے اور ایسے افسانوں کی وجہ سے دونوں بدنام بھی ہوگئے تھے۔ منٹو کو کئی بار مقدمے کے سلسلے میں عدالت بھی جانا پڑا۔ وہ اپنے افسانے بو، ٹھنڈا گوشت، دھواں، کھول دو وغیرہ کے مقدمے کے سلسلے میں کئی بار عدالت گئے تھے۔ محمد بشیر کے افسانے آوازیں، بھوک وغیرہ پر بھی سخت تنقیدیں ہوئیں۔

دونوں کے ہاں انسانی نفسیات کا گہرا مشاہدہ جابجا ملتا ہے۔ منٹو کے بیشتر افسانے دراصل فرائڈ کے خیالات کا عکس ہیں۔ بشیر کے افسانوں میں فرائڈ کے اثرات براہ راست نہیں دیکھ پاتے۔ پھر بھی انسانی نفسیات کا گہرا مشاہدہ بشیر کے افسانوں کے اہم اوصاف میں ایک ہے۔

منٹو پہلے کامریڈ اور طفر کے فرضی نام سے لکھتے تھے۔ ان کے ابتدائی زمانے کے موضوعات میں ترقی پسندی، آزادی اور بغاوت خاص اہم ہیں۔

انسان کو قابو میں لانے والی دو طاقتیں بھوک اور جنس ہیں۔ حقیقی زندگی کو اصلیت سے پیش کرنے والے حقیقت نگار فنکار (ریلسٹ) اکثر غربت کے ساتھ ساتھ جنس کو بھی بے باکی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ لوگ اکثر عشق کے پاک جذبے سے ہٹ کر جنس کے جال میں پھنس جاتے ہیں۔ محمد بشیر کی کہانی 'پہلا بوسہ' میں ایک لڑکی کو پہلی بار بوسہ دینے کا واقعہ ایک کردار سناتا ہے۔ یہ سن کر ایک فنکار پوچھتا ہے کہ "تمھیں کیسے معلوم کہ تم ہی نے پہلی بار اسے بوسہ دیا ہے؟ تمھارے پاس کیا ثبوت ہے کہ تمھاری بیوی یا محبوبہ کو سب سے پہلی بار تم نے ہی بوسہ دیا ہے؟" کیا پاک محبت صرف ایک خیال ہے؟ حقیقی طور پر یہ ایک ریلسٹک سوال ہے۔

بشیر کا افسانہ 'بے وقوفوں کی جنت' میں جنس کو پاکیزگی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ زوردار حیوانی جذبہ جنس کے ساتھ واحد متکلم طوائف کے پاس پہنچتا ہے۔ جب واحد متکلم اس سے اس کی کہانی سن لیتا ہے تو اس کا حیوانی جذبہ تھک جاتا ہے۔ انسانیت بیدار ہوتی ہے۔ "وہ کچھ بچے ہوئے باقی ماندہ روپے اسے دے کر وہاں سے باہر چلا جاتا ہے... عجیب زندگی۔ وہ، اس کی ماں، باپ، بہت کے برابر کے بچے... چلتے ہوئے سوچتا رہا۔ کیوں اس طرح ہو رہا ہے؟ بچی عورت ہے کیا میرے دل کو چیرنے والی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی؟ وہ کیسے پیار کر سکتی ہے؟"

یہی موضوع ہمیں سعادت حسن منٹو کے افسانے 'ٹھنڈا گوشت' میں نظر آتا ہے۔ اس افسانے کا کردار ایشر سنگھ فسادات کے دوران ایک جوان لڑکی کا اغوا کر لیتا ہے اور اسے زنا بالجبر کرنے کی کوشش کرتا ہے تو ایشر سنگھ کو پتہ چلتا ہے کہ وہ لڑکی ڈر کے مارے مرگئی تھی۔ تو ایشر سنگھ کے اندر کا انسانی جذبہ باہر نکل آتا ہے۔ اس کا اثر یہ ہوتا ہے

کہ کلونت کور سے عشق کرنے کی لاکھ کوشش کے باوجود وہ ہار جاتا ہے اور کلونت کور کے ہاتھ سے مارا جاتا ہے۔

دونوں کے افسانوں کے کردار برے ہوتے ہیں اس کے باوجود ان کے اندر انسانیت دکھائی دیتی ہے۔ منٹو کے کرداروں میں ایشر سنگھ سہائے، موذیل، بابو گوپی ناتھ اور بشیر کے کردار 'ایک انسان' کا جیب چرانے والا، تنگی نیلیا (عدل وانصاف) کا عبدالرزاق وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

منٹو اور بشیر دونوں نے شہری زندگی اور یہاں کی کج رویوں اور پیچیدگیوں کو پیش کیا ہے۔ اس کے باوجود ان کے کرداروں میں خلوص اور محبت کا بڑا دخل ہے۔

دونوں کے افسانوں میں خود نوشت سوانح کا رنگ ابھر آتا ہے۔ کبھی براہ راست افسانے کا ایک کردار بن کر کبھی واحد متکلم کے طور پر افسانے میں اپنے تجربات کو پیش کرکے۔ ان کے افسانوں کے مطالعے سے ان کی شخصیت اور زندگی کے بہت سارے پہلوؤں پر معلومات حاصل ہوتی ہے۔ بقول ڈاکٹر کے ایم ترکن:

"بشیر کو دیگر فنکاروں سے مختلف کرنے والی باتیں، ان کی غیر معمولی شخصیت اور بے نظیر ذہانت ہے۔ یہ باتیں دودھ میں مکھن کے جیسے اس میں شامل ہے۔ صرف ایک فرق ہے۔ دودھ سے مکھن الگ کر سکتے ہیں۔ مگر لاکھ کوشش کے باوجود بشیر کی تخلیقات سے بشیر کو جدا نہیں کر سکتے۔" ([illegible])

یہ بھی بڑی عجیب مماثلت ہے کہ دونوں بچپن میں والد کی سخت گیر طبیعت کے باعث گھر سے بھاگ گئے تھے۔ دونوں فلمی دنیا سے وابستہ تھے۔ بشیر کے 'نیلاویلچم' (نیلا روشنی)، مَتِلُکل (دیواریں)، عالمی شہرت یافتہ وغیرہ کہانیاں فلمائی گئی تھیں اور منٹو نے بہت ساری فلموں کے لیے کہانیاں اور اسکرین پلے لکھے تھے اور مشہور بھی ہوئے ہیں۔ ان کی سب سے مشہور فلم 'مرزا غالب' ہے۔

ان تمام مماثلتوں کے باوجود ان دونوں کے بیچ کچھ فرق بھی ہے۔

منٹو کی تخلیق کا پس منظر متحدہ ہندوستان کی سماجی زندگی ہے تو بشیر کے پاس کیرلا کی سماجی زندگی ہے۔ وہ بھی خاص کر مسلمان طبقے کی زندگی تک محدود ہے۔ علاوہ ازیں واکم محمد بشیر کا انداز منٹو سے ہی نہیں بلکہ تمام فنکاروں سے مختلف ہے۔ بشیر اکثر Mystic اور صوفی بن جاتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ بشیر نے زندگی کو مثبت نظروں سے دیکھا ہے اور اسی انداز میں اپنی تحریروں میں پیش کیا ہے۔ مگر منٹو نے منفی دنیا کے مثبت پہلو کو پیش کیا ہے۔

■

Dr. Mohamed Saleem Pularakath Assistant Professor, Department of Urdu, Farook College Kozhikode (Kerala)
Mob.:09497612434
Email: saleempularakath@gmail.com

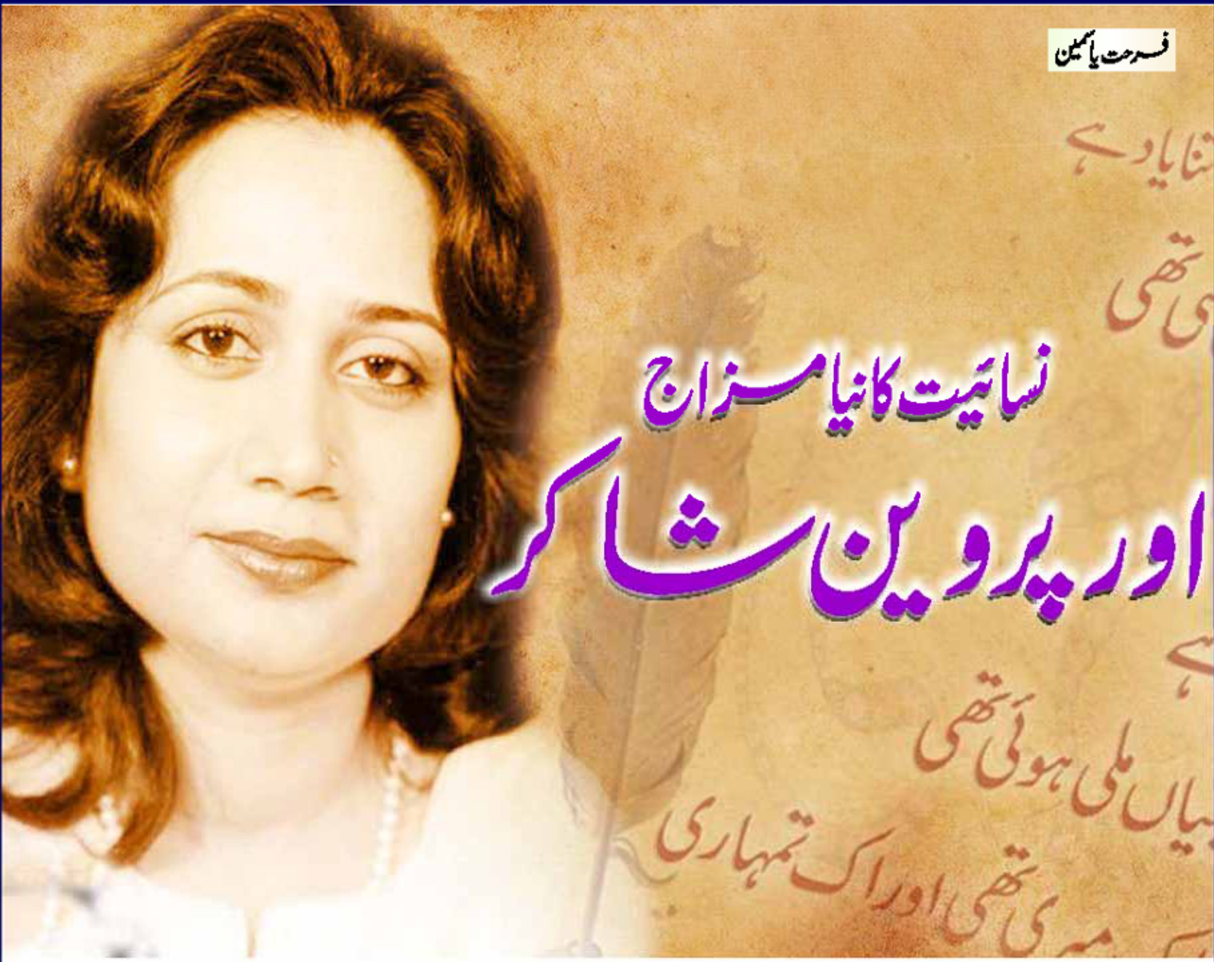

فرحت یاسمین

نسائیت کا نیا مزاج اور پروین شاکر

بیسویں صدی کے نصف آخر اور حالیہ برسوں میں اردو شاعرات نے اپنے مختلف شعری رویوں اور نسائی لہجوں سے پوری طرح متوجہ کیا ہے۔ جن کے اشعار نسائی کیفیات کے مظہر ہیں جنھیں پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ ایک حساس ذہن کی تخلیق ہے۔ اس جدید شعری روایت کے زمرے میں پروین شاکر نمایاں مقام کی حامل ہیں۔ جنھوں نے اس روایت کو جمالیاتی ذوق اور وجدان عطا کیا۔ یہ سچ ہے کہ قدرت نے انھیں حیاتی تجربے کی ایک وسیع دنیا عنایت فرمائی تھی۔ ان کے اندر گزرتے ہوئے ایک ایک لمحے سے لطف اندوز ہونے کی ایسی زبردست حسیت موجود تھی، جو تاریکی میں بھی موہوم سی روشنی دکھا دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک ایک لمحے اور پل کو اپنی شعری صلاحیت سے اس طرح پیش کرتی ہیں کہ قاری اس سے محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ پاتا ہے۔

شاعری کا شوق انھیں بچپن سے ہی تھا۔ طبیعت میں حد درجہ سادگی تھی، بے ریائی، سلاست اور غیر مصنوعی انداز طبیعت نے پروین شاکر کی شاعری کو بھی تصنع سے پاک رکھا اور راست اظہار کا ایک عمدہ نمونہ بنا دیا۔ وہ شدید جذبے کو بھی اس نرم روی اور سلیس انداز میں پیش کرتی ہیں جس سے ان کی شاعری کو جو مقام میسر ہوا وہ کم ہی شاعرہ کو حاصل ہوا۔

چونکہ شاعری ایک ذوقی اور وجدانی شے ہے۔ علامہ شبلی نے بھی کہا ہے:

"شاعری ایک آگ ہے جو خود بخود مشتعل ہوتی ہے، ایک چشمہ ہے جو خود ابلتا ہے، ایک برق ہے جو خود کوندتی ہے۔" (شعرالعجم جلد چہارم، ص8)

اس طرح شاعری کی کوئی جامع اور مانع تعریف نہیں کی جا سکتی۔ ان کے نزدیک شاعری کا منبع ادراک نہیں احساس ہے اور یہی احساس جب لفظ کا جامہ پہن لیتا ہے تو شعر بن جاتا ہے اور پروین شاکر کی شاعری اسی احساس اور جذبے کی ترجمانی کرتی ہوئی نظر آتی ہے

چہرہ میرا تھا، نگاہیں اس کی
خامشی میں بھی وہ باتیں اس کی
میرے چہرے پہ غزل لکھتی گئیں
شعر کہتی ہوئی آنکھیں اس کی

جدید غزلیہ شاعری میں پروین شاکر کا مقام اس حیثیت سے منفرد و نمایاں ہے کہ انھوں نے غنائیت کو اپنایا ہے۔ ان کے اشعار پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نغمے پھوٹ رہے ہوں ایسی روانی اور تسلسل ہے کہ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے:

رات جب پھول کے رخسار پر دھیرے سے جھکی
"چاند نے جھک کے کہا، اور ذرا آہستہ!"

پہلا شعری مجموعہ 'خوشبو' میں سو سے زائد غزلیں شامل ہیں ان میں سے ہر غزل کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ:

سرگوشیِ بہار سے خوشبو کے در کھلے
کس اسم کے جمال سے بابِ ہنر کھلے
سما کے ابر میں، برسات کے امنگ میں ہوں
ہوائیں جذب ہوں خوشبو کے انگ انگ میں ہوں

یہ پورا مجموعہ کلام دلنواز ساعتوں کی صورت میں روبرو ہوتا ہے اور ایک سرشاری کی کیفیت ہر سو نظر آتی ہے۔ خوشبو ہی خوشبو پوری کائنات کو معطر کر دیتی ہے۔ یہ وجدان اور

حسیت سے بھرپور شاعری ہے۔ جہاں پروین شاکر نے محبت کے تجربے کو اس کی مختلف حسیاتی ونفسیاتی کیفیتوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ دراصل خوشبو کی شاعری انکشاف ذات کی شاعری ہے۔

'صد برگ' میں شامل نظموں اور غزلوں میں ذات کا درد کائنات کا درد بن جاتا ہے۔ جہاں انفرادی اور اجتماعی سطح پر ہونے والی حق تلفیوں اور ناانصافیوں کو وہ نظر انداز نہیں کرسکتی ہیں اور انھیں ہر طرف کربلا کا منظر دکھائی دیتا ہے۔ 'صد برگ' میں پروین شاکر کی شاعری انفرادی اور سماجی سطح پر ہونے والی ناانصافیوں کے خلاف ردعمل کی صورت میں ہمارے سامنے آتی ہے:

عقب میں گہرا سمندر ہے سامنے جنگل
کس انتہا پہ مرا مہربان چھوڑ گیا
دھوپ کی رُت میں کوئی چھاؤں اُگاتا کیسے
شاخ پھوٹی تھی کہ ہم سایوں میں آڑے نکلے
کہاں سے آتی کرن زندگی کے زنداں میں
وہ گھر ملا تھا مجھے جس میں کوئی در ہی نا تھا

پروین شاکر کو یہ احساس بار بار ستاتا ہے کہ اس کے ساتھ ہونے والی زیادتی اور ناانصافی کی اصل وجہ سماج کے بنائے ہوئے فرسودہ اصول ہیں جس کا شکار سماج کا ہر فرد ہے۔

'صد برگ' کے بعد کی شاعری ایک Turning Point کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس موڑ پر پروین شاکر کی غزلوں میں ہمیں خود احتسابی کا عمل دخل غالب نظر آتا ہے اور ان کی غزل کا ہر شعر اس احساس کی ترجمانی کرتا ہے:

کوئی سفاک ہو کہ میرا ہو کہ پروین اسے
راس آتا ہی نہیں چاند نگر میں رہنا

'خود کلامی' میں غزلوں کی بہ نسبت نظموں کا دائرہ موضوعاتی اعتبار سے زیادہ وسیع ہے۔ یہاں ان کی فکر اس عورت تک پہنچ گئی ہے جو آج کی معروف زندگی میں جینے کے لیے گھر کے باہر قدم نکال چکی ہے۔ عورت کا درد ان کی اس نظم میں ابھر کر سامنے آتا ہے:

ہر صبح
میرے شانوں پر
ذمہ داری کا بوجھ لیکن
پہلے سے بھاری ہوتا ہے
پھر بھی میری پشت پہ
نااہلی کا کوب
روز بروز نمایاں ہوتا جاتا ہے!

'خود کلامی' کے کلام میں ایک اور بات جو نمایاں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے نئی تراکیب کا استعمال کیا ہے۔ اکثر سائنسی اصطلاحات کو علامت اور استعارے کے طور پر استعمال کیا ہے۔

ملاحظہ ہو:

بعض محبتیں
اپنے بلڈ گروپ میں
"O" منفی ہوتی ہیں!

اسی طرح نیل پرنٹ، ایسوٹوپس، تابکار نفرتیں، طے یافتہ کیمیا، ہزاروں نوری سالوں کا فاصلہ جیسی اصطلاحات بے ساختہ استعمال ہوئی ہیں۔

مجموعہ 'انکار' میں پروین کی شاعری زندگی کے اعتراف کی صورت میں ابھر کر سامنے آتی ہے۔ 'انکار' میں شامل بیشتر نظموں کو پڑھتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ دائمی شکست اور تشنگی عورت کا مقدر ہے لیکن پروین شاکر اس کے باوجود اپنے دل میں فطرت کے حُسن اور جمالِ

یار کے تصور سے رنگ ونور بھرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ چنانچہ اظہار کی جو صورت سامنے آتی ہے وہ جمالیاتی کیف وسرشاری سے بھرا ہے۔

پورے چاند کی شب ہے
زمین سے آسماں تک
روشنی کی ایک سیڑھی بن گئی ہے
مرے تن پر ستاروں سے بنا ملبوس ہے
ایک ہاتھ میں تازہ گلاب
اور دوسرے میں تیرا بازو ہے

پروین شاکر کو زبان و بیان پر فطری قدرت حاصل تھی۔ زبان وبیان پر بے پناہ دسترس کے ساتھ ان کے یہاں فکر ونظر کی گہرائی ملتی ہے۔ ان کی شاعری میں محبت کا جو تصور ملتا ہے، اس کی جتنی جہتیں ان کے یہاں ملتی ہیں کہیں اور اس کا تصور بھی محال ہے۔ ان کی شاعری محض نسائی محسوسات تک قید نہیں کی جاسکتی ان کی شاعری میں پورا انسانی دل دھڑکتا دکھائی دیتا ہے۔

'کفِ آئینہ' پروین شاکر کا آخری مجموعہ کلام ہے۔ اس مجموعے میں شامل غزلیں دراصل ذات کی توسیع پر مشتمل ہیں۔ اس شعری مجموعے کے چند اشعار سے پروین شاکر کے تخیل کی اڑان اور جذبے کی شدت کو محسوس کیا جاسکتا ہے:

مجھے تیری محبت نے عجب ایک روشنی بخشی
میں اس دنیا کو اب پہلے سے بہتر دیکھ سکتی ہوں
ریت ہی ریت ہے اس دل میں مسافر میرے
اور یہ صحرا ترا نقشِ کفِ پا چاہتا ہے
ترے پیمانے میں گردش نہیں باقی ساقی
اور تری بزم سے اب کوئی اٹھا چاہتا ہے

بہرحال 'خوشبو' سے جس سفر کا آغاز ہوا 'صد برگ' سے 'خود کلامی' اور پھر 'انکار' سے 'کفِ آئینہ' تک کی منزلیں طے کرتا ہوا ایک 'ماہ تمام' کا احساس دلاتا ہے۔ یہ وہ شاعری ہے جو دماغ میں نہیں، دل میں اترتی ہے۔ بات جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔ پروین شاکر کی شاعری بھی دل کی آواز ہے جس میں ایک عاشق کی مختلف حسیاتی اور نفسیاتی کیفیتوں کا اظہار ملتا ہے۔ اردو غزل کے روایتی عاشق کی جگہ یہاں عاشق ایک عورت ہے۔ اور اس عاشق کے ذریعے حال دل کا جب بیان ہوتا ہے تو عورت کی وفاداری اس کی قربانی، اس کا جذبۂ ایثار سب کچھ ابھر کر سامنے آتا ہے۔ عورت کے جذبات کو عورت کی زبان میں ایک عورت کی طرف سے بیان کرنے کا یہ انداز اردو شاعری میں نسائیت اور تانیثیت کے نئے مزاج کو سامنے لاتا ہے اور جس طرح سے پروین شاکر نے خاموش جذبوں کو قوتِ گویائی عطا کی ہے وہ اردو ادب کی عشقیہ شاعری کے سرمائے میں اضافہ ہے۔

■

Dr. Farhat Yasmin, B.N. College (Urdu Deptt.), Patna University, Patna - 800004 (Bihar)

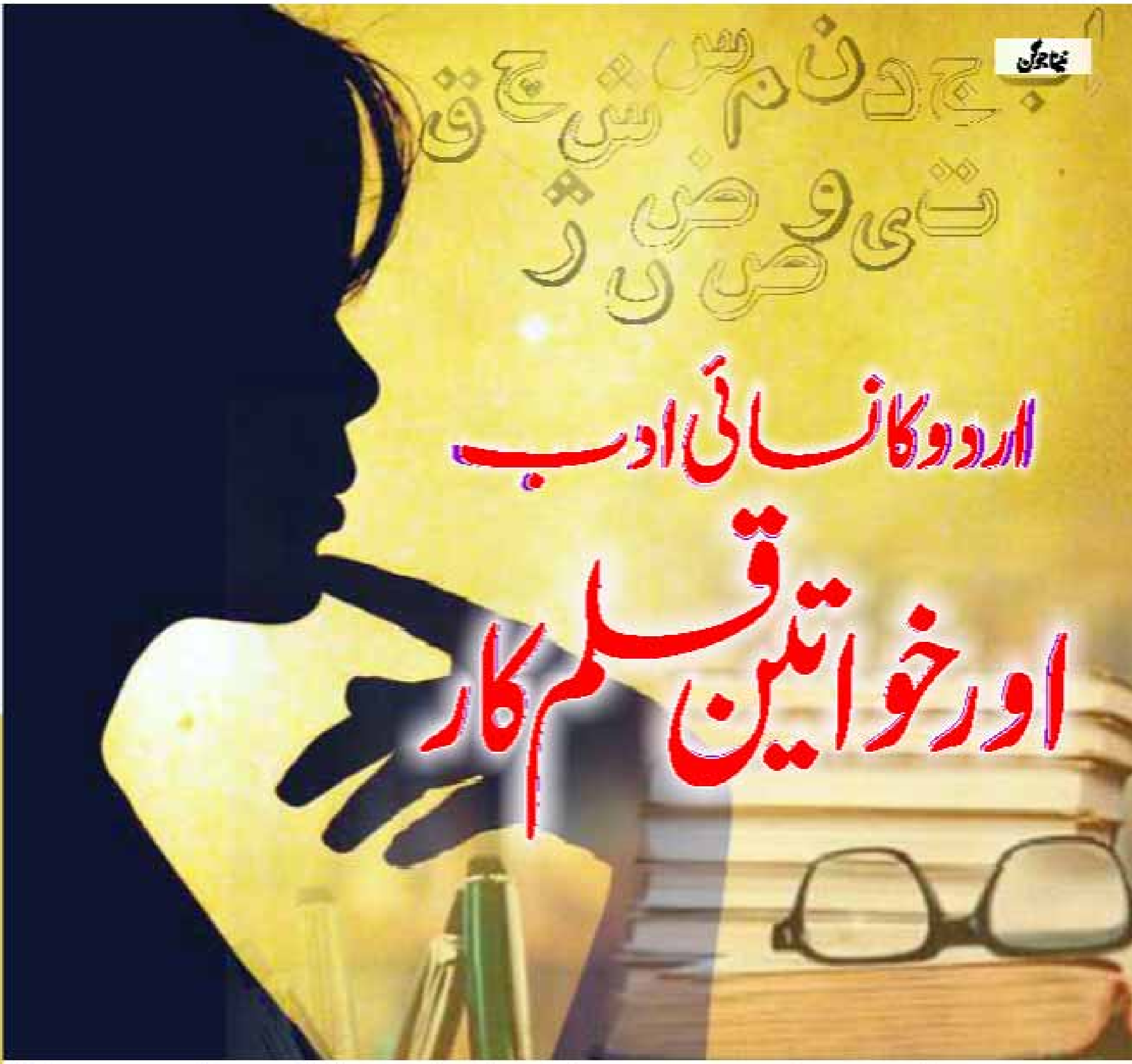

نسوانیت اور تانیثیت میں فرق ہے۔ لفظ "نساء" کے معنی عورتیں، بیبیاں، ناریاں، استریاں اور مستورات ہیں۔ اس کی جمع نسواں ہے۔ جس کے وہی معنی ہیں۔ لیکن اس کی صفت ہے "عورتوں سے منسوب"۔

تانیثیت میں خواتین کے حقوق کی آواز پوشیدہ ہے۔ سماجی، قانونی، اقتصادی اور سیاسی مسائل کی طرف متوجہ کرنا بھی ہے۔ صرف جنسی مساوات ہی لازمی نہیں ہے۔ اس لیے کہ عورت ذی شعور ہے۔

آزادیٔ نسواں دراصل آزادی و خود مختاری ہے جس کے تحت اخلاقی و سماجی نقطۂ نظر سے خواتین کے حقوق کی حمایت ہوتی ہے۔ افلاطون نے The Republic-Part 6-Books میں لکھا ہے کہ:

"بہت سی عورتوں میں بہت سی باتیں مردوں سے بہتر ہیں۔ اس لیے سماج میں کوئی کام ایسا نہیں جو خصوصی طور پر عورت، عورت کی حیثیت سے کرے، اور مرد، مرد کی حیثیت سے۔ عورتوں کے لیے فطری بات یہ ہے کہ تمام پیشوں میں مردوں کے ساتھ ہوں، گو کہ عورتیں کمزور پارٹنر ہوں گی۔ اگر صرف اتنا فرق ہے کہ عورت بچے جنتی ہے اور مرد جنم کا سبب بنتا ہے تو یہ فرق ہمارے مقصد کے لیے غیر متعلق ہے۔ ہم یہی کہیں گے کہ مرد اور عورت دونوں ایک ہی پیشہ اختیار کریں گے۔"

حالانکہ یہ تصور اکیسویں صدی سے پرے ہے۔ آج عورتیں ہر پیشے سے وابستہ ہیں اور کئی ملکوں کی سربراہی بھی کر رہی ہیں۔

عورتوں کے لیے حجاب کا تصور بھی ہے کیونکہ حجاب میں شرم ہے، پردہ ہے اور ایک طرح سے حفاظت بھی ہے۔ کشش تو ہے ہی۔ جبکہ مغربی تہذیب میں دوشیزگی (Virginity) اور پاک دامنی کا تصور دم توڑ چکا ہے۔ جنسی انقلاب (Sexual Revolution) کا بول بالا ہے۔ عریانیت اور فحش نگاری (Pornography) معاشرے کا کردار ہے۔ مغربی تہذیب کی یہ تنگ نظری ہے کہ مخصوص کلچر اور نظریات کو برداشت نہیں کر سکتی۔

اردو ادب کی چند خواتین فنکار مثلاً رشید جہاں، ممتاز شیریں، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، جیلانی بانو، پروین شاکر، کشور ناہید، ساجدہ زیدی، وغیرہ کی تحریر کو ردِ تشکیل کے عمل سے گزارا Deconstruct کیا جا سکتا ہے جن میں کئی نظریات پوشیدہ ہیں جو کارکردگی کو کئی ناظر میں ظاہر کرتے ہیں۔ ساتھ ہی کلچر کے تجربے میں حقیقی رشتے کی نمائندگی ہوتی ہے۔ ان کہی کی تلاش میں

روشن امکانات کو دیکھا جاسکتا ہے۔ ان سب کے ادبی فن پاروں کا تجزیہ کرکے عورتوں کے شعور کی عکاسی کو بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ ان سب کے اظہار اور اسلوب میں جدت ہے۔ ختم ہوئی صدی میں انھوں نے زندگی بخش فکری سورج طلوع کیا ہے۔ غیر عقلیت، انھر ڈیٹی اور بے جوہر انسانی کی ترجمانی ہرگز نہیں کی ہے بلکہ جمالیاتی، ادراکی، اخلاقی اور روحانی طور پر یہ خاتون لکھاری حاوی کررہی ہیں۔ اگر ناول نویسوں اور افسانہ نگاروں کا جائزہ لیں تو ان کے یہاں جمالیاتی ضرورت یقینی طور پر ملی ہے۔ الیوژن (التباس) کو تقویت پہنچائی گئی ہے، مظاہر کے اخلاق کو ترجیح دی گئی ہے اور بیانیہ نشانات اور سگنائز کے ذریعے تاریخ کا درجہ عطا کیا گیا ہے۔ مشہور ناولوں میں ٹیک قطرہ خوں (عصمت چغتائی)، عذرا (صالحہ عابد حسین)، تلاش بہاراں (جمیلہ ہاشمی)، آگ کا دریا (قرۃ العین حیدر)، آنگن (خدیجہ مستور)، آبلہ پا (رضیہ فصیح احمد)، اللہ میگھ دے (رضیہ سجاد ظہیر)، راجہ گدھ (بانو قدسیہ)، ایمان غزل (جیلانی بانو)، واپسی (آمنہ ابوالحسن) وغیرہ انفرادیت کے حامل ہیں۔

جہاں تک افسانے کی بات ہے تو نئے سیاسی، سماجی، تہذیبی، اقتصادی، نفسیاتی اور انقلابی شعور کی روشنی میں تخلیقیت سے مملو اور نئے آفاق تلاش کرنے والے میری اور آپ کی پسند کے افسانے بہت سے لکھے گئے ہیں۔ چند نام اس طرح ہیں:

'چوتھی کا جوڑا، لحاف (عصمت چغتائی)، ہاؤسنگ سوسائٹی (قرۃ العین حیدر)، راستہ (خدیجہ مستور)، انگڑائی (ممتاز شیریں)، روحی (حجاب امتیاز علی)، گھر ل اکیڈمی (جیلانی بانو)، مشرق (آمنہ ابوالحسن)، آنکھ مچولی (شکیلہ اختر)، گہن (نگار عظیم)، راکھ سے بنی انگلیاں (صادقہ نواب سحر)، اداس لمحوں کی خودکلامی (شائستہ فاخری)، ڈار سے بچھڑا پرند (بانو سرتاج)، جسم و زبان کی موت سے پہلے (زاہدہ حنا)، شہروالی (بشریٰ رحمٰن)، پھول (پروین طارق)، وغیرہ میں تحیر کا لطف ہے، فریب آمیز تیزی ہے اور اسلوب وابلاغ کی کاٹتی ہوئی دلیل ہے:

بعض شاعرات کے پسندیدہ اشعار اس طرح ہیں:

تمھیں تو یاد ہے سولہ برس کی وہ ناہید
نزاکتیں بھی عجب تھیں بدن چھریرا تھا

(کشور ناہید)

نہ کیوں مناؤں دیوالی کہ آج اس کا خیال
چراغ یاد کے طاقوں پہ دھر گیا ہر سو

(رشیدہ عیاں)

خدا تم کو مصیبت سے نکالے
خلوص دل سے یہ میری دعا ہے

(زاہدہ زیدی)

خون ناحق تو خود ہی بولے گا
آپ کتنا اسے چھپائیں حضور

(سلطانہ مہر)

روٹیاں لٹتی ہیں جس سے اور وہ بھوکا رہے
عہد حاضر میں اسے تو ہنر کا دہقان لکھ

(سیدہ نسرین نقاش)

تحلیل نفسی کرنے سے ہم کو یہ معلوم ہوا
اک تاریخ پوشیدہ ہے کڑوے کسیلے لہجے میں

(سعیدہ روشن صدیقی)

تجھ سے وصال مانگتی ہوں
میں آدمیوں سے کٹ گئی ہوں

(فہمیدہ ریاض)

معصوم امیدیں ہیں حالات کی گردش میں
گھر میں کسی مفلس کے شہزادیاں پلتی ہیں

(پروین فطرت)

ان میں ذہنی آزادی ہے۔ منطقی حسن ہے، فکری اور معنوی منفرد جہتیں ہیں اور فنکارانہ لطف بھی ہے۔

اس طرح نسائی ذہن عشق کا مبدا اور ماخذ ہے۔ اردو کی خواتین فنکاروں نے تہہ نشیں شعور کی نشاندہی کی ہے۔

■

Nalna Jogan, Kohaar, Bhikaapur - 3,
Bhagalpur - 812001 (Bihar)

محمد منصور عالم

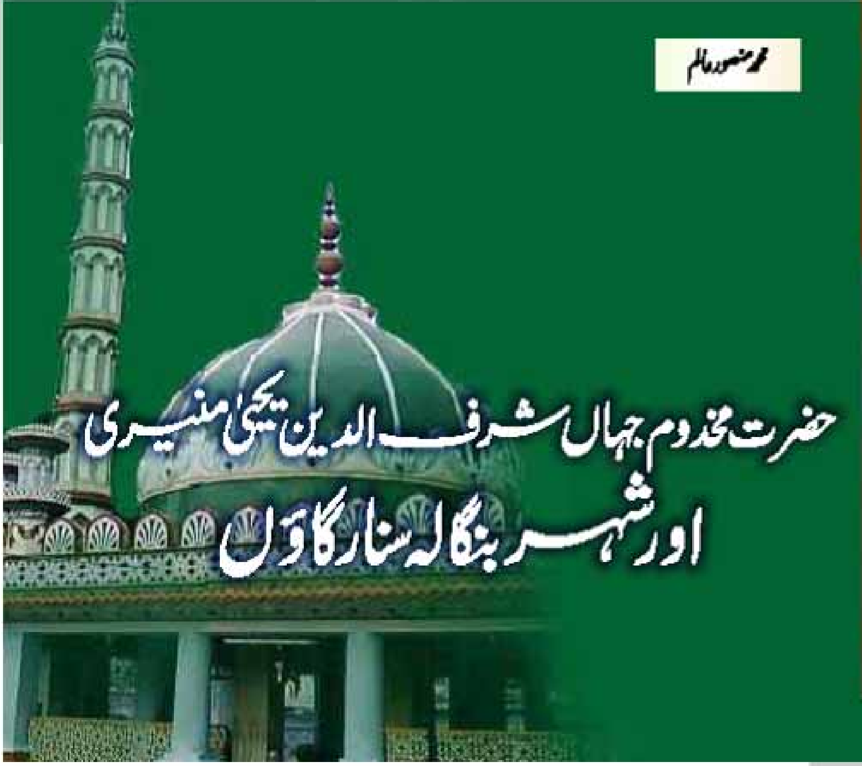

حضرت مخدوم جہاں شرف الدین یحییٰ منیری اور شہر بنگالہ سنار گاؤں

اسلامی تاریخ میں جن بزرگ ہستیوں اور صوفیائے کرام نے قرآن وسنت کی روشنی میں اسلامی زندگی کے احیا اور ملت کو سر اٹھا کر جینے کا حوصلہ اور انھیں انحطاط و پستی سے نکال کر فلاح و ترقی کی راہ پر گامزن کرنے میں جو گرانقدر خدمات انجام دی ہیں ان میں مخدوم جہاں حضرت شرف الدین یحییٰ منیری کا ایک خاص مقام ہے۔ آپ ایک عبقری شخصیت کے مالک، نابغۂ روزگار، ایک ممتاز عالم اور عارف کامل، شاعر و نثار و مکتوب نگار، ایک نمایاں عابد و زاہد اور ایک فریدِ روزگار فقیہ تھے۔ آپ جود و سخا "خشوع و خضوع" تکریم کبار اور فروتنی و عجز و انکسار میں ایک خاص مقام رکھتے تھے اور صوری و معنوی محاسن سے مالا مال اور بہت ذہین طباع تھے آپ ایک غیر معمولی ظرافت و ذہانت و فراست کے حامل تھے۔ آپ دقیق سے دقیق، باریک سے باریک مسائل حل کرنے میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے جن کا ثبوت آپ کے مکتوبات اور دیگر تخلیقات ہیں۔ "آپ (661-782ھ) آٹھویں صدی ہجری میں ہندوستان کے ان اکابر طریقت میں سے تھے جن کی جلالت شان، روحانی اور عظمت و درویشی کے چرچے آج تک اس عالم ہست و بود میں زندہ جاوید ہیں اور ہنوز پورے ہندوستان کے چپے چپے پر ان کے انفاس گرم اور حرارت ایمانی کے تابندہ نقوش ثبت ہیں۔ صدیاں گزر گئیں مگر لیل و نہار کی گردشوں نے ان کو نہیں چھوا، بلکہ مرورِ ایام کے ساتھ ساتھ ان کی چمک دمک چند در چند وجوہ سے بڑھتی رہی اور بڑھ رہی ہے"[1] ان جیسی روحانی شخصیت کے افکار اور آرا سے متعلق علماء، فصحاء، دانشوران اور محققین نے یوں تو بہت کچھ لکھا ہے لیکن پھر بھی اس بات کا اعتراف تو کرنا ہی پڑتا ہے کہ ان کی حیات و شخصیت پر جتنا کام ہونا چاہیے وہ اگر کم نہیں تو زیادہ بھی نہیں ہوا ہے۔ ان کی حیات کے آج بھی کئی گوشے ایسے ہیں جو متقاضی جستجو و تحقیق طلب ہیں۔ تذکروں اور علمی کتابوں کے مطالعے سے اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ مخدوم جہاں اپنی زندگی کے 22 قیمتی سال بنگال کے ایک دور افتادہ شہر سنار گاؤں میں گزارنے کے بعد بہار لوٹ آئے اور پھر دوبارہ اُدھر کا رخ نہیں کیا لیکن اس شہر میں اس طویل زندگی بسر کرنے کے حالات سے بھی کتابیں خاموش ہیں۔ سنار گاؤں میں مخدوم کے شب و روز کے بارے میں مناقب الاصفیاء کی مختصر اطلاعات سے قطع نظر اس زمانے کی تحریر کردہ دین و تصوف کی کتابوں میں بھی خاطر خواہ مواد نہیں ملتا۔ ان کے 22 سالہ تعلیمی دور کے شب و روز، ان کے ہم جماعتوں اور دیگر طلبہ کے اسمائے گرامی، علامہ ابو توامہ کے علاوہ کسی اور استاد کا نام، وہاں کا ماحول، باشندے اور ان کے رہن سہن کا طریقہ، ان کی زبان اور عام لوگوں سے حضرت موصوف کے تعلقات سب کچھ پردۂ خفا میں ہیں۔ مقالہ نگاروں نے عنوان تحت کے حوالے سے اگرچہ یہ لکھا ہے کہ ان کی تعلیمی زندگی کی پوری تفصیل اس کتاب میں موجود ہے۔ لیکن راقم الحروف کو وہاں اس سلسلے میں چند جملوں کے علاوہ کچھ نہیں ملا۔ ایسا ممکن ہی نہیں کہ اتنا عظیم اور جید عالم جو کئی کتابوں کا مصنف بھی ہو اور جہاں 22 سالوں تک اپنا وقت حصول تعلیم میں گزارے، اس کی تفصیل نہ لکھے۔ گمان اغلب ہے کہ حضرت مخدوم جہاں نے وہاں کے روز مرہ کے واقعات ضرور قلمبند کیے ہوں گے جو یا تو تلف ہو گئے یا گم۔ لیکن ان گمشدہ تحاریر کا پتہ چلانے کی آج تک کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ ابو توامہ نے اپنے شاگردوں کی حاضری کے لیے کوئی نہ کوئی رجسٹر ضرور تیار کیا ہوگا اگر اس کا بھی پتہ چل جاتا تو کم از کم مخدوم جہاں کے ہم سبقوں کے اسمائے گرامی معلوم ہو جاتے اور ان سے ان کے تعلقات کا پتہ چل جاتا۔ راقم کے خیال میں یہ بات محل نظر اور محتاج تحقیق ہے کہ قیام سنار گاؤں کے زمانے میں مخدوم جہاں کی کچھ تحریریں تلف ہو گئیں ہوں گی۔ آج کئی سال گزر گئے لیکن ان گمشدہ تحاریر کا پتہ چلانے کی نہ تو کوئی کوشش کی گئی اور نہ ہی اس کی طرف کوئی دھیان دیا گیا۔ ہو سکتا ہے جن معلومات کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ ڈھاکہ یا اس کے آس پاس کے کسی میوزیم میں پڑے ہوں یا پھر جس طرح انگریز بے شمار قلمی نسخے اپنے ساتھ لے گئے، ہو سکتا ہے ان میں وہ قلمی نسخے بھی موجود ہوں جن میں مخدوم جہاں نے اپنے تعلیمی دور اور روز مرہ کی زندگی کا حال درج کیا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے ڈھاکہ میں واقع مدرسہ عالیہ کی وہ شاندار لائبریری جو قدیم مخطوطات سے بھری پڑی ہے حضرت مخدوم جہاں کے اس دور کی تاریخ کو اپنے سینے میں چھپائے زمانے کے ظلم و ستم کا رونا رو رہی ہو یا پھر کسی ذاتی کتب خانے میں پڑی دیمک کی خوراک بننے کی سعادت حاصل کر رہی ہو۔

میں نے اپنے اس مختصر سے مقالے میں مخدوم جہاں کی حیات مبارکہ کی انھیں گمشدہ کڑیوں کو تلاش کرنے اور سنار گاؤں سے ان کے جذباتی اور ذاتی رشتے، کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن حق تو یہ ہے کہ مواد کی عدم موجودگی میں، میں بھی کچھ زیادہ نہیں لکھ پایا ہوں۔ امید تھی کہ پروفیسر امام الدین فردوسی نے اپنی تحقیقی کتاب 'بہار کے فارسی گو صوفی شعرا' اور پروفیسر انوار احمد نے اپنی تصنیف 'مشائخ فردوسیہ کی علمی اور عرفانی خدمات کا مطالعہ' میں اس جانب کچھ روشنی ڈالی ہوگی اور مخدوم جہاں اور سنار گاؤں کے تعلق سے کچھ نہ کچھ ضرور لکھا ہوگا۔ لیکن افسوس کہ یہ محققین بھی سنار گاؤں کا سرسری طور پر ذکر کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں۔

جس زمانے میں حضرت شرف الدین ابو توامہ سنار گاؤں جاتے وقت منیر شریف تشریف لائے اس وقت حضرت یحییٰ منیری کی علمی بصیرت، فقیہانہ فکر، دینی علوم مرتبت اخلاق اور ولایت قطبیت کا شہرہ تھا۔ مخدوم کو

ابوتوامہ جیسی باکمال و ممتاز اور عبقری شخصیت کی پہلے سے خبر تھی لہٰذا انھوں نے اس یگانۂ روزگار اور استاد بے عدیل و بے مثل کا والہانہ استقبال کیا اور ان کی مہمان نوازی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ ان کی مہمان نوازی میں شرف الدین احمد بھی پیش پیش رہے۔ حالانکہ ان کی عمر اس وقت سات سال سے زیادہ نہ تھی۔ اس کی تصدیق ان کی پیدائش مادۂ تاریخ شرف آگین سے ہوتی ہے۔[2] لیکن مولانا ابوالحسن ندوی کے مطابق ان کی پیدائش 773 میں ہوئی تھی[3] لہٰذا دونوں کے مطابق اس وقت مخدوم جہاں کی عمر یا تو سات سال تھی یا پھر بارہ سال جبکہ صاحب مناقب الاصفیا کے مطابق دس گیارہ تھی[4]۔ لیکن زیادہ تر مورخین کا خیال ہے کہ وہ اس وقت سات سال کے تھے جب علامہ ابوتوامہ 668 میں منیر شریف تشریف لے گئے تھے[5]۔ بہار شریف میں حضرت ابوتوامہ بہت کم مدت تک رہے۔ لیکن اس درمیان انھیں جس چیز نے بہت زیادہ متاثر کیا وہ حضرت یحییٰ کے بیٹے شرف الدین کے آداب و اخلاق، علمی اور مذہبی ذوق اور دین سے گہرا شغف تھا۔ ان کی تجربہ کار آنکھوں نے مخدوم جہاں میں وہ تمام خوبیاں دیکھ لی تھیں جو انھیں دین و مذہب کے اعلیٰ مدارج پر بیٹھا سکتی تھیں۔ ادھر شیخ بھی علامہ توامہ سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے تھے۔ ان کی خداداد صلاحیت، ذہانت، دینی امور میں استعداد کے اتنے قائل ہوئے کہ اپنے بیٹے کی اعلیٰ تعلیم کے لیے انھیں منتخب کرلیا۔ چنانچہ ابوتوامہ جب سنارگاؤں کے لیے رخصت ہونے لگے تو حضرت شیخ یحییٰ کی اجازت سے حضرت شرف الدین احمد کو اپنے ہمراہ وہاں لے گئے جہاں ان کا جانا پہلے سے طے تھا۔

ابوتوامہ نے سنارگاؤں جا کر تبلیغ اسلام و درس و تدریس کا انتخاب خود نہیں کیا تھا بلکہ انھوں نے سلطان غیاث الدین بلبن کی ایما پر ادھر کا رخ کیا تھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ دہلی میں ابوتوامہ کی موجودگی اور ان کی شہرت اور بے مثال مقبولیت نے بلبن کو ذہنی طور پر پریشان کر رکھا تھا۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ بخارا سے آنے والی اس ممتاز شخصیت کی وجہ سے اس کی مقبولیت کو گہن لگ رہا ہے۔ لہٰذا اس نے نہایت چالاکی سے ان کو سنارگاؤں جا کر تبلیغ اور اشاعت اسلام کا حکم صادر کیا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ جس شخص کو وہ دہلی سے دور کر رہا ہے اللہ نے اسے دنیا کو ایک عظیم روحانی و عرفانی شخصیت دینے کی ذمہ داری سونپ رکھی تھی۔ وجہ ذاتی مقبولیت کے کم ہونے کی ہو یا خالص سیاسی یا پھر جذبۂ ایمانی، اس بات سے انکار کی گنجائش نہیں کہ اگر بلبن نے ابوتوامہ کے لیے یہ قدم نہیں اٹھایا ہوتا تو ہمیں حضرت شرف الدین جیسے بلند قامت صوفی شاید ہی ملتے۔ بہرحال ابوتوامہ 1270 میں سنارگاؤں آ کر بس گئے جو آج کل بنگلہ دیش کے ضلع ڈھاکہ میں واقع ہے اور اسی سرزمین پر 1300 میں انھوں نے زندگی کی آخری سانس بھی لی اور سنارگاؤں کی مٹی میں ہی دفن ہوئے[6]۔

اس سے قبل کہ اس شہر میں حضرت شرف الدین احمد منیری کی تعلیم و تربیت اور حیات مبارکہ کا حال لکھا جائے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ سنارگاؤں کا محل وقوع، اس کی تاریخ، علمی، ثقافتی، ادبی، تجارتی اور جغرافیائی حیثیت سے روشناس کرا دیا جائے۔ اس لیے کہ اس مقالے کا موضوع بحث بھی یہی ہے۔

سنارگاؤں تیرھویں صدی عیسوی میں بنگال کا ایک مشہور ترین شہر تھا۔ جس کا قدیم نام سبرنا گرام تھا جو بعد میں کثرت استعمال سے سنارگاؤں ہو گیا ٹھیک اسی طرح جس طرح شغالدہ کثرت استعمال سے سیالدہ ہو گیا۔ چودھویں صدی کے نصف حصے میں یہ بنگال کا ایک تجارتی شہر بن گیا تھا اور بندرگاہ ہونے کے وجہ سے مغربی اور جنوبی سے ایشیا سے تاجر اور سیاح با آسانی یہاں پہنچ سکتے تھے۔[7] 1346 میں ابن بطوطہ نے اس شہر کی زیارت کی اور اسے بنگال کا ایک اہم بندرگاہ بتایا جس کے بالواسطہ چین، انڈونیشیا (جاوا) اور مالدیپ سے تجارتی تعلقات قائم تھے۔ یہاں کے تیار کردہ آب رواں، جام دانی، شبنم اور ململ اپنی باریکی، نفاست اور مضبوطی کے لیے دنیا بھر میں مشہور تھے۔ اس کے علاوہ خطاطی، زرگری، مسکوکات دیگر اشیاء کی تجارت کے لیے بھی سنارگاؤں مشہور تھا۔

تیرھویں صدی عیسوی میں سنارگاؤں کے علاوہ پورے علاقے پر ہندوؤں کی حکمرانی تھی۔[8] سلطان فخرالدین سنارگاؤں کا پہلا آزاد حکمراں تھا بعد میں لکھنوتی کے سلطان الیاس شاہ نے سنارگاؤں کو فتح کیا اور خود کو شاہ بنگالہ کے نام سے موسوم کیا۔ اس طرح اس نے ریاست بنگالہ کے تینوں اقالیم یعنی لکھنوتی، سات گاؤں اور سنارگاؤں کو متحد کر دیا۔ لیکن سکندر شاہ کے صاحبزادے الیاس شاہ نے اسے اقالیم معظم آباد کا نام دیا۔ سلطان غیاث الدین اعظم شاہ نے (1373-1393) اسے اپنا پایۂ تخت بنایا اور سکہ ڈھالنے کا مرکز بھی۔ غیاث الدین اس کے بعد پنڈوا چلا گیا اور وہیں وفات پائی۔

سنارگاؤں مسلمانوں کی نظر میں صحیح طور پر اس وقت آیا جب سلطان غیاث الدین بلبن ایک کثیر فوج کے ہمراہ لکھنوتی کے باغی گورنر طغرل خاں کی سرکوبی کے لیے اس کے تعاقب میں مشرقی بنگال تک جا پہنچا۔ طغرل خاں وہیں پناہ گزیں تھا لہٰذا اس صدی کے آخر میں بلبن نے اس علاقے کو اپنی حکومت میں شامل کر لیا اور سنارگاؤں اور اس سے متصل علاقے میں اسلام کی اشاعت کے لیے راہ ہموار کی۔ بلبن کو سنارگاؤں کی تاریخی، مذہبی، ثقافتی، علمی اور تجارتی حیثیت کا اچھی طرح علم تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے تبلیغ دین کے لیے علامہ ابوتوامہ کو سنارگاؤں بھیجا۔ اس شہر کی اہمیت کا اندازہ آپ اس بات سے بھی لگا سکتے ہیں کہ یہاں کی سرزمین کو بڑے بڑے دانشوران، اولیاء اور صوفیائے کرام نے اپنے قدوم میمنت سے سرفراز کیا۔ ڈاکٹر وائز اپنے ایک مضمون[9] میں اس شہر کو ذی علم اور مقتدر ہستیوں کے علاوہ فقراء، اولیا اور صوفیا کا مرکز بتاتے ہیں۔ اسی شہر میں حضرت ابوتوامہ نے ایک مثنوی مسمّیٰ بہ نام حق لکھی جس کا ایک قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ میں موجود ہے۔ سنارگاؤں میں ہی موسیٰ خاں کے ایک درباری شاعر نے شبد رتناولی نام کی ایک سنسکرت لغت تیار کی جس کی تدوین Methew نے کی۔ مناقب الاصفیا میں ابوتوامہ کے معاصر شاہ صاحب نے اس کتاب کی بے حد تعریف کی ہے۔ علمیت، صلاحیت اور صوفیانہ مزاج کی وجہ سے ابوتوامہ کی شہرت ایران اور عرب تک پھیل گئی تھی۔

سنارگاؤں کی قدر و قیمت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا سکتا ہے کہ شیخ علاؤل پنڈوی (المتوفی 800ھ/1380ء) کو حاکم بنگالہ سکندر شاہ نے سنارگاؤں کی طرف جلاوطن کر دیا تھا۔ ان کے بعد ان کے صاحبزادے شیخ نور قطب عالم اور پوتے شیخ زاہد نے سنارگاؤں میں لنگر خانہ کھولا اور یہاں اسلام کی تبلیغ کی۔ ان لوگوں نے سنارگاؤں کی علمی اور عرفانی فضاء کا خوب فائدہ اٹھایا۔ حضرت ابوتوامہ نے جس مدرسے اور خانقاہ کی بنیاد ڈالی تھی اس کی نگہداشت ان کے جانشین شاہ ابراہیم دانشمند اور ان کے وارثین مثلاً شیخ محمد کمال شیخ محمد یوسف اور دیگر افراد نے کی۔ سنارگاؤں اس وقت ادبی، ثقافتی اور مذہبی دونوں اعتبار سے ایک اہم شہر مانا جاتا تھا بغرا خان کی ہدایت پر اسی شہر میں مجموعہ خوانی فی آ کمین المعانی تالیف کمال کریم، تفسیر تاتار اور فتاویٰ تاتار خانی جیسی نادر اور تحقیقی کتابیں عالم وجود میں آ گئیں۔

مولانا سید شاہ ابوصالح محمد یونس شعیب فردوسی اپنی کتاب تذکرہ مصابیح رشاد میں سنارگاؤں کا تذکرہ کرتے ہوئے یوں لکھتے ہیں:

"میں نے یہاں کے آثار دیکھے۔ یہ جگہ اب چھوٹے سے دیہات کی شکل میں ہے یہاں سے دریائے برہم پترا تقریباً دو میل ہے۔ اس کے ایک جانب کھائی

ہے۔ مقبرے کا حلقہ بہت وسیع ہے۔ درمیان میں ایک مسجد ہے۔ مسجد کے دکھن جانب چند قبے ہیں، جن میں مزارات ہیں۔ مغربی قبہ سے جنوب کی طرف ایک احاطہ کے اندر مزار ہے۔ لوگوں کا کہنا کہ یہ مخدوم جہاں کی اہلیہ بی بی بہو بادام کا مزار ہے۔ احاطہ سے پورب کی جانب دو اور مزارات ہیں جن کے متعلق مشہور ہے کہ یہ مخدوم جہاں کی دو صاحبزادیاں ہیں جو کمسنی میں انتقال کر گئیں۔ مسجد سے پورب ایک احاطے میں قبروں کا سلسلہ ہے۔ اس میں مولانا شرف الدین ابوتوامہ کا مزار ہے۔"

اسی اہم ترین شہر سنارگاؤں میں پہنچ کر حضرت ابو توامہ نے اس مدرسہ اور خانقاہ کی بنیاد ڈالی تھی جن کی شہرت و مقبولیت پورے ہندوستان میں ہو گئی تھی۔ ابوتوامہ نے سنارگاؤں میں مدرسہ اور، خانقاہ کی بنیاد ڈال کر کچھ کیا ہو یا نہ کیا ہو لیکن انھوں نے حضرت شرف الدین احمد منیری کی شخصیت کو تراش خراش کر نورانی اور روحانی قافلے کا سردار ضرور بنادیا۔

آج ڈھاکہ چٹاگانگ کے مغربی جانب اور بندر گاہ کے مشرقی جانب موگرا پاڑہ (سنارگاؤں) میں درگاہ کمپلیکس، درگاہ بلڈنگ، مدرسہ بلڈنگ، شیخ شاہ مسجد (1484) نیابت خانہ، حضرت ابوتوامہ، شاہ ابراہیم دانشمند، شاہ کمال، منا شاہ اور دیگر درویشوں کے مقبرے سنارگاؤں کی قدیم شان و شوکت کے گیت گا رہے ہیں۔ تاریخی موگرا پاڑہ جہاں سنارگاؤں واقع ہے اب فقط نام کا رہ گیا ہے۔ ڈھاکہ کے عروج کے ساتھ موگرا پاڑہ اور سنارگاؤں نے بھی اپنی اہمیت کھو دی ہے۔ 19 ویں صدی کے نصف حصے تک یہ شہر گاؤں میں تبدیل ہو چکا تھا۔ یہ وہی شہر تھا جس نے مخدوم جہاں کو علمی و عرفانی زیور سے آراستہ و پیراستہ کر کے تصوف کی پیشانی پر جگمگاتا ہوا جھومر بنا کر لگا دیا۔

حضرت مخدوم جہاں کے استاد شرف الدین ابوتوامہ بخاری اپنے عہد کے ایک جید عالم تھے اور علوم دینی میں زبردست دستگاہ رکھتے تھے اس کے علاوہ فن کیمیا اور دوسرے علوم میں بھی دخل رکھتے تھے۔ آپ کے تبحر علمی کا ذکر خود حضرت مخدوم نے کیا ہے۔ لکھتے ہیں

"حضرت مولانا شرف الدین ابوتوامہ ایسے دانشمند تھے کہ پورے ہندوستان میں ان کے علم پر کسی کو شبہ تھا"[10]

حضرت شرف الدین ابوتوامہ علم و عمل، اتباع شریعت، صلاح اور تقویٰ اور توکل اور استغنا میں سلف صالحین کا نمونہ تھے۔ جب انھوں نے مخدوم جہاں کو دینی تعلیم سے آراستہ کر دیا تو چاہا کہ انھیں دوسرے علوم کی طرف راغب کیا جائے مگر مخدوم جہاں نے اس طرف اپنی توجہ مبذول نہیں کی اور استاد سے کہا کہ "خوشنودی الٰہی کے حصول کے لیے علم دین ہی واحد ذریعہ ہے"۔ مختصر یہ کہ ابوتوامہ کی تعلیم و تربیت میں مخدوم جہاں نے کلام پاک، حدیث، فقہ، فلسفہ، منطق اور ریاضی میں استعداد پیدا کر لی۔ یہی نہیں انھوں نے ان معلومات کے علاوہ اتنی علمی و ادبی صلاحیت بھی پیدا کر لی کہ کثیر التصانیف ہوئے جن میں ان کے مکتوبات کو کافی اہمیت حاصل ہے۔ ابوالفضل کے مطابق:

"وفراوان تصنیف از و یادگار، از آن میان مکتوبات او در سرشگفتی کس آزمون دارد"[11]

مولانا عبدالحق محدث دہلوی بھی اخبار الاخیار میں اس طرح رقمطراز ہیں:

"شرف الدین یحییٰ منیری از مشائخ ہندوستان است چہ احتیاج کہ کسی ذکر مناقب او کند۔ اورا تصانیف عالی است۔ از جملہ تصانیف او مکتوبات مشہور و لطیف ترین تصانیف است۔ بسیاری از آداب طریقت و اسرار حقیقت در آنجا اندراج یافتہ"[12]

اپنے تعلیمی دور میں بھی حضرت مخدوم جہاں روحانی و عرفانی ریاضتوں میں مشغول رہے۔ اور علم کے ساتھ ساتھ صوفیانہ طرز و بود و باش میں ڈوبے رہے۔ سنارگاؤں میں حصول تعلیم میں آپ کی انتہائی مشغولیت و محنت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ دوران تعلیم آپ کے پاس جو خطوط آیا کرتے تھے آپ ان کو پڑھتے نہیں تھے بلکہ ایک جگہ جمع کرتے جاتے تھے اس اندیشہ سے کہ اشتغال علمی میں خلل نہ پڑے۔ مونس القلوب میں درج ذیل عبارت سے سنارگاؤں میں ان کی تعلیمی سرگرمیوں کا پتہ چلتا ہے۔

"حضرت مخدوم جہاں قدس سرہ العزیز بعالی خواندن پیش مخدوم مولانا شرف الدین توامہ رحمۃ اللہ علیہ رفتہ و علوم دینیہ تحصیل کردند و دانشمند علامہ گشتند۔ مخدوم گفتند: برابر چند علم کہ در است آن نیز تحصیل کنید۔ چنانچہ علم کیمیا و سیمیا و علم تکسیر و جز آن۔ حضرت مخدوم جہاں قدس اللہ سرہ العزیز فرمودند: من علم فقہ و اصول و جز آن تحصیل کردم۔ ہم سبب آن ندامت می کنم کہ بعالی چہ چندین وقت در آن صرف کردم و خدمت پروردگار خود نکردم۔ اکنون مرا ازین علوم حاجت نیست۔ چون مخدوم مولانا شرف الدین رحمۃ اللہ علیہ از مخدوم جہاں قدس سرہ العزیز آن سخنہا شنیدند و این ہمت بدیدند بعادت بار گرد حضرت مخدوم جہاں قدس اللہ سرہ العزیز بگشتند و گفتند: قربان برچنین ہمت"[13]

صاحب مناقب الاصفیاء بھی مخدوم جہاں شرف الدین رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمی سرگرمیوں کے بارے میں اس طرح لکھتے ہیں:

"در تحصیل علوم دین بافضل الغایۃ کوشید، شب و روز در علم مشغول بود، و در آن مشغولی ریاضت و مجاہدہ داشت و روزہای طی داشتی"[14]

اگرچہ سنارگاؤں میں مخدوم کے استاد ابوتوامہ اور دہلی میں روحانی رہنما شیخ نجیب الدینؒ تھے جنھوں نے ان تمام علوم سے ان کا سینہ روشن کر دیے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سنارگاؤں میں صرف ابوتوامہ ہی تھے جن سے وہ درس لیا کرتے تھے۔ وہاں امیر فاضل بلخی جیسے عالم دین بھی تھے جہاں وہ تفسیر قرآن پر ان کا لیکچر سنا کرتے تھے۔ اُن کے علاوہ مخدوم جہاں خود معدن المعانی[15] کے باب بارہ 12 میں فرماتے ہیں کہ وہ اکثر و بیشتر مولانا ضیاء الدین سنامی سے تفسیر قرآن سنا کرتے تھے۔ ابوتوامہ کے بھائی بھی حافظ قرآن اور عالم دین تھے ان کی علمی کاوشیں بھی ناقابل فراموش ہیں۔ ممکن ہے کہ انھوں نے بھی مخدوم جہاں کو درس دیا ہوگا۔

جس زمانے (668-1270) میں ابوتوامہ مخدوم جہاں کو لے کر سنارگاؤں پہنچے تھے اس وقت مقامی لوگوں بالخصوص علماء نے ان کا شایان شان استقبال کیا۔ ڈاکٹر سنتی کمار چٹرجی کے مطابق اس وقت وہاں کی زبان سنسکرت آمیز بنگلہ تھی یا پھر مقامی بولیاں (Local dialects) بنگلہ زبان آج کی شکل میں موجود نہیں تھی اس کا ابتدائی دور تھا۔ فارسی سرکاری زبان ضرور بن گئی تھی اور اس کا چلن ضرور ہو گیا تھا لیکن اس کا استعمال اس وقت صرف رؤسا، امرا اور دانشوران ہی کیا کرتے تھے۔ ایسے میں ایسے شخص کے لیے جو باہر سے آیا ہو اور وہاں کی زبان سے واقف نہ ہو تصور کیجیے کہ اسے کتنی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہوگا۔ مدرسے میں جو کلاسیز ہوتے ہوں گے ان میں زیادہ تر تعداد مقامی بنگالی طلبہ کی ہوتی ہوگی۔ لہٰذا ابوتوامہ ہوں یا ان کے افراد خانوادہ یا شرف الدین جیسا کمسن بچہ شروع شروع میں تو اشارے و کنائے میں ہی گفتگو ہوتی ہوگی۔ مخدوم جہاں ان بنگلہ بولنے والے طلبہ کے ساتھ صبح و شام لکھتا پڑھتا کرتے۔ بازار بھی جانے کی نوبت آتی جہاں زیادہ تر بنگالی دوکانداروں سے سابقہ پڑتا لہٰذا بنگلہ سیکھنے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا ہوگا۔ مخدوم جہاں نے بھی اپنے استاد کے ساتھ 22 سالوں میں مقامی زبان بنگلہ ضرور سیکھ لی ہوگی۔ اور اس میں اچھی خاصی استعداد بھی پیدا کر لی ہوگی اور یہ بھی ممکن ہے کہ اپنے علمی

ذوق کے تحت اس زبان میں بھی یقیناً کچھ ضرور لکھا ہوگا لیکن ان کی بنگلہ نویسی کے نمونے دستیاب نہیں ہوئے۔ جس کا پتہ چلا کر اسے منظر عام پر لانا ان محققین کا کام ہے جو خاص طور پر صوفیائے کرام کے کارناموں پر تحقیقی کام کرتے ہیں۔

سنارگاؤں سے حضرت مخدوم جہاں کا اتنا گہرا تعلق تھا کہ کسی خط کے ذریعہ اپنے والد کے انتقال کی خبر پڑھ کر وہ بہار تو چلے آئے لیکن وہاں کی یادان کے دل میں ہمیشہ موجود رہی۔ جس سرزمین پر رہ کر انھوں نے اپنی زندگی سنواری، حضرت ابوتوامہ جیسے استاد کے داماد بننے کا شرف حاصل کیا، اپنی شریک حیات بی بی بھو بادام اور اپنی کمسن بچیوں کو سنارگاؤں کی زمین میں دفن کیا بھلا اس جگہ سے ان کو بے پناہ محبت کیوں نہ رہی ہوگی۔ سنارگاؤں سے ان کی روحانی، جذباتی اور قلبی وابستگی کا پتہ آپ اس بات سے بخوبی لگا سکتے ہیں کہ وہ تا حیات اس سرزمین کو نہیں بھولے۔ یہ واقعہ ہے کہ انسان جہاں سکونت پزیر ہوتا ہے اور اپنی زندگی کا بیشتر حصہ وہاں گزارتا ہے وہاں کے جغرافیائی اور تاریخی حالات، آب وہوا، ماحول، رہن سہن وہاں کے مکانات، ملبوسات و ماکولات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا حتیٰ کہ لسانی اور ادبی مذاق بھی اس پر اثر انداز ہوتے ہیں اور حضرت شرف الدین احمد منیری اس قاعدہ کلیہ سے پرے نہیں تھے۔

علم وادب کے اس سنہری شہر سنارگاؤں اور وہاں کے احباب، علماء، فضلاء اور معتقدین سے مخدوم جہاں کا برابر رابطہ رہا جنھیں وہ اپنے مکتوب کے ذریعے ہمیشہ یاد کیا کرتے تھے۔ مکتوبات صدی میں سنارگاؤں کے قاضی مولانا صدرالدین کے نام ان کا جو ایک خط ملتا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ بنگال بالخصوص سنارگاؤں اور بیربھوم کے شہر ڈیہہ سے جہاں ان کے خاندان کے دیگر افراد بھی دفن ہیں انھیں قلبی اور روحانی ربط تھا، جذباتی وابستگی اور علمی و دینی تعلق تھا۔ آپ ہمیشہ بنگال کا ذکر خیر اخلاق و محبت سے کیا کرتے تھے۔ جب کوئی شخص سنارگاؤں یا بنگال کے کسی بھی خطے سے بہار شریف جا کر ان سے شرف ملاقات حاصل کرتا تو وہ انتہائی بے تکلفی اور دلچسپی کے ساتھ سب سے پہلے وہاں کے حالات دریافت کرتے، اپنی جان پہچان والوں اور مریدوں کی خیریت معلوم کیا کرتے۔ اس کی تصدیق اس بات سے ہوتی ہے کہ آپ کی وفات کے بعد آپ کے جلیل القدر خلیفہ حضرت مولانا مظفر بلخی جو اپنے دینی علوم اور عرفانی و روحانی روشنی کی بنا پر اپنے پیر کی نظر میں نہایت محبوب و محترم تھے، اپنے مخدوم کے بنگال سے گہری انسیت کا ذکر اپنے ایک مکتوب (نمبر 163) میں جو انھوں نے غیاث الدین شاہ بنگالہ کے نام تحریر ہے، یوں لکھتے ہیں۔

"شرف الحق قدس سرہ والعزیز بابندہ بصورت دیدہ کہ در باب این ملک (بنگال) این عنایت داشت و خدای تعالی ما عین عنایت بر این زمین و بر این ملک بود۔ و ہست کہ شیخ شرف الدین را کہ لشکر الہی بود، بر سر این زمین داشت"17

ترجمہ: شیخ شرف الدین قدس سرہ والعزیز کو بندہ ہمیشہ اس ملک (بنگال) پر نوازش وعنایت فرماتے دیکھتا تھا۔ اور خدای تعالی کی اس سرزمین اور ملک پر نوازش تھی اور ہے کیوں کہ انھوں نے شیخ شرف الدین کو جو لشکر الہی تھے اس سرزمین پر آباد کیا۔

مولانا ابوالحسن ندوی بھی اپنی معرکتہ الآرا تصنیف 'دعوت وعزیمت' میں مخدوم جہاں اور بنگال کے تعلق سے یوں لکھتے ہیں:

آپ (حضرت مخدوم الملک) نے علوم دینیہ کی تحصیل اور تعلیم کی تکمیل سنارگاؤں میں کی تھی اس لیے قدرتاً آپ کو بنگالہ اور وہاں کے حالات سے خاصی دلچسپی تھی اور وہاں کے مسلمانوں کے حالات کے فکر و اہتمام رہا کرتا تھا۔ بنگال بالخصوص سنارگاؤں سے مخدوم کی گہری انسیت کی ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ مخدوم حبیب الدین، مخدوم رکن الدین اور ان کی شریک حیات (مبارک بیگم) کی ابدی آرام گاہیں ضلع بیربھوم، مغربی بنگال میں زیارت خلائق ہیں۔"18

حضرت ذین الدین جب چھ ماہ سولہ دن کے بعد بنگال سے بہار لوٹے تو انھوں نے اپنے پیر و مرشد سے ملاقات کی۔ حضرت مخدوم جہاں نے فیروز شاہ تغلق کے حملے کے سبب وہاں (سنارگاؤں) کے باشندوں کے درمیان پھیلی ہوئی بد امنی، عدم سکون اور بے اطمینانی کے بارے میں سوال کیا تھا۔ اس سے بنگال سے ان کی والہانہ شیفتگی، گہری وابستگی اور بے پناہ فکر کا پتہ چلتا ہے۔ یہ فیروز شاہ کی بنگال پر دوسری بار لشکر آرائی کا واقعہ ہے۔ جس شخص کو سنارگاؤں سے اتنی محبت ہو اس نے دوبارہ اس سرزمین کو اپنے قدوم سے سرفراز نہ کیا ہو تحقیق طلب ہے۔

جن دنوں آپ عالم مستی سے گزر رہے تھے اس وقت آپ کے برادر خورد مخدوم حبیب الدین نے نگر ڈیہہ سیوڑی ضلع بیربھوم میں سکونت اختیار کر کے حضرت مخدوم کے صاحبزادے مخدوم ذکی الدین کو اپنی سرپرستی میں لے کر انھیں علوم ظاہری اور علوم باطنی سے آراستہ و پیراستہ کیا۔ حصول تعلیم کے بعد سید حسن کی صاحبزادی سے ان کی شادی کروائی جن کے بطن سے ایک لڑکی مسمّی بی بی مبارک پیدا ہوئی لیکن بدقسمتی سے ذکی الدین کی شریک حیات عالم جوانی میں فوت ہو گئیں۔ کچھ دنوں کے بعد ذکی الدین بھی رحلت فرما گئے ان کی بچی کو کسی رشتہ دار نے بہار پہنچا دیا۔

غرضیکہ شرف الدین یحییٰ منیری کو سنارگاؤں بالخصوص اور بنگال بالعموم سے کافی محبت اور انسیت تھی وہ جب تک باحیات رہے اس شہر کی یادان کے دل میں رہی جہاں ان کے استاد علامہ ابوتوامہ نے ان کی زندگی کی کایا پلٹ دی۔ سنارگاؤں ہمیشہ اپنی خوش قسمتی پر نازاں رہا کبھی اس کی سرزمیں کو حضرت مخدوم جہاں نے اپنی موجودگی اور روحانی وعرفانی افکار سے نہ صرف منور کیا بلکہ دنیائے اسلام میں اس شہر کا مرتبہ بلند کیا بنگال کے دونوں شہر یعنی سنارگاؤں اور بیربھوم کو اعزاز حاصل ہے کہ ان کی زمین میں حضرت مخدوم جہاں کے خسر ابوتوامہ، شریک حیات بی بی بھو بادام، بھائی مخدوم حبیب الدین، نورچشم ذکی الدین اور ان کی اہلیہ مبارک بیگم اور خاندان کے دیگر افراد کی ابدی آرام گاہیں ہیں۔ مخدوم جہاں کا جب بھی بھی ذکر ہوگا سنارگاؤں کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوگا۔

حوالے:

1. اردو ادب انڈیا جلد 35، شمارہ 4-3، 1982
2. بزم صوفیہ تالیف سید صباح الدین عبدالرحمٰن ص 350
3. تاریخ سلسلہ فردوسیہ تالیف محمد حسین الدین ندوائی ص 137
4. تاریخ دعوت وعزیمت تالیف ابوالحسن ندوی (حصہ سوم) ص 14
5. مناقب الاصفیا (اردو ترجمہ) حصہ دوم ص 148
6. مکتوب صدی (اردو)
7. مکتوبات جہانگیر ستائی 130، ص 35، پی پی 1948
8. گلکتہ ریویو جلد اول ص 197؛ مکتوبات صدی (اردو) ص 3
9. عہد سلطانی میں بنگال میں مسلمانوں کی تعلیم تالیف ڈاکٹر محمد کے یحییٰ ص 44
10. جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی جلد "XLIII" ص 87
11. خوان پر نعمت (انگریزی ترجمہ) پال جیکسن ص 90
12. آئین اکبری تالیف ابوالفضل (انگریزی ترجمہ) ص 920
13. مونس القلوب: حضرت احمد لنگر دریائی ص 130
14. مناقب الاصفیا بحوالہ سیرت الشرف ص 49
15. معدن المعانی، باب 12
16. مکتوبات صدی تالیف مخدوم جہاں شرف الدین منیری مکتوب نمبر 163
17. مکتوبات حضرت مولانا مظفر بلخی (نمبر 163)
18. دعوت وعزیمت تالیف ابوالحسن ندوی ص 14

■

Prof. Md. Mansoor Alam Sabiq Member, West Bengal Public Service Commission, Formerly General Secretary, Iran Society, Kolkata

نثار احمد ڈار

انتظار حسین کی ناسٹلجیائی حسیت کے تشکیلی اجزا

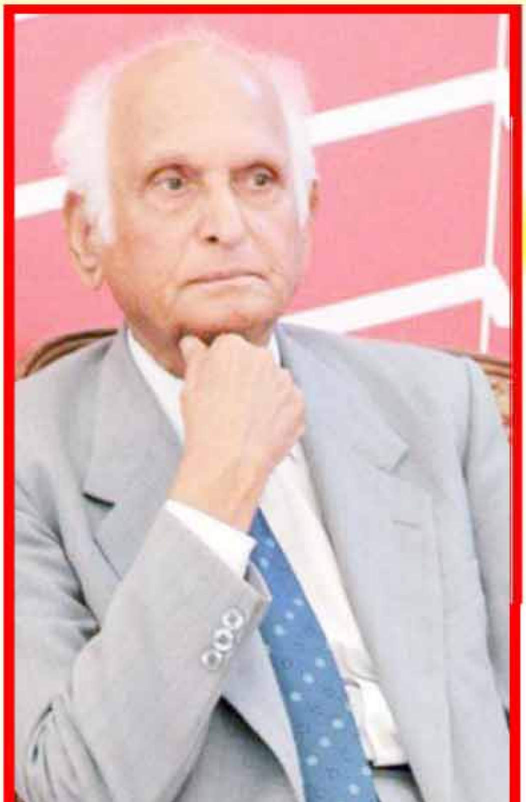

'ناسٹلجیا' (Nostalgia) انگریزی زبان کا لفظ ہے، جس کے معانی ماضی کی حسرت ناک یادوں، ماضی کی یاد دلانے والی چیزوں، گھر خاندان، کھیت کھلیان اور کھیل کے میدان کی یادوں اور فرقتوں کے پیدا کردہ غم و مسرت آگیں شدید مخلوط احساسات کے ہیں، جسے ہم منجملہ Living in one's past بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ ایک ایسا غم و انبساط آگیں شدید مخلوط احساس ہے، جس سے کسی انسان کو مفر نہیں۔ یہ ہر کسی کے یہاں پایا جاتا ہے، چاہے وہ عام آدمی ہو یا دانشور۔ البتہ غم و مسرت آگیں شدید مخلوط جذبات و احساسات مختلف افراد کے ہاں مختلف ہو سکتے ہیں۔

ایک ادیب یا فنکار کے یہاں یہ ناسٹلجیا ایک کرب وانبساط کی مخلوط صورت اختیار کرتی ہے۔ یہ ایسی مخلوط صورت ہے، جو اس کی قوت بن جاتی ہے اور اسے کچھ نہ کچھ تحریر کرنے پر اُکساتی رہتی ہے۔ کسی مخصوص تاریخی و سیاسی حالات کے تحت جب کوئی فرد کسی سماجی اُلٹ پھیر کا شکار ہو کر ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر منتقل ہوتا ہے، تو اس تاریخی و سیاسی جبر کے باعث اس کی سماجی و ثقافتی اعتبار سے رچی بسی زندگی اجیرن بن جاتی ہے، جس سے اس کے یہاں ایک شدید احساسِ زیاں اور چبھن سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، جو صرف آدم خاکی ہی کا مقدر ہے۔ انسانی ارتقا کی متعدد صورتِ حال کے پیش نظر نقلِ مکانی اور ہجرت کی کئی صورتیں ہوتی ہیں، جس کے پیچھے ناسٹلجیا کی لڑی بندھی ہوتی ہے۔ ان ہی میں سے ایک صورت وہ ہے جہاں فرد حالات کے ہاتھوں اپنی خواہش و رضا کے بغیر اپنے گھر بار اور وطن کو چھوڑنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ایسا ہی واقعہ آزادیِ ہند اور تقسیمِ ہند کے وقت پیش آیا۔ یہ ایسی ناگفتہ بہ صورت حال تھی، جس کے ہاتھوں برصغیر کے ان گنت لوگ دوچار ہوئے، جن میں اردو ادب کے معروف فکشن نگار انتظار حسین بھی شامل ہیں۔

تقسیم ملک اور قیامِ پاکستان کے بعد جب دونوں ملکوں سے ہجرتوں کا سلسلہ شروع ہوا تو لوگ اپنے اپنے اثاثہ جات کو لے کر یہاں سے وہاں، وہاں سے یہاں منتقل ہوئے، لیکن جہاں تک انتظار حسین کا تعلق ہے۔ وہ اپنا قومی مزاج، قومی اخلاق، قومی تہذیب و ثقافت کے حیاتی ورثے کو سمیٹ کر لاہور منتقل ہوئے۔ قومی مزاج، اور تہذیب و ثقافت میں انسان کی زبان، اس کا کلچر، اس کے رویّے، اس کی مٹی، اس کی آب و ہوا، اس کے موسم، اس کے تہوار، اس کی عادات و اطوار سبھی کچھ شامل ہوتے ہیں۔ انتظار حسین ان ہی حیاتی اثاثہ جات کو لے کر لاہور منتقل ہوئے۔

انتظار حسین ہندوستان سے پاکستان تو چلے گئے لیکن کیا وہ اس نئی یا اجنبی زمین پہ خود کو پوری طرح ڈھال پائے؟ کیا انھوں نے وہاں جا کر پاکستان کو قبول کیا، یا کیا سرزمین پاکستان نے انھیں قبول کیا؟۔ یہ ایسے سوالات ہیں جو آج بھی جواب طلب ہیں۔ لیکن جب ہم انتظار حسین کی نگارشات کا مطالعہ کرتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ بظاہر تو انتظار حسین نے ہندوستان اور اپنی بستی 'ڈبائی' کو چھوڑ دیا ہے لیکن ان کی روح آج بھی اس بستی میں گھوم رہی ہے۔ آج بھی انتظار حسین بچپن کی بستی کی یادیں دل میں لیے ہوئے پھرتے ہیں۔ بچپن یا ہندستان کی یادیں ہی انتظار حسین کی ناسٹلجائی زندگی کا حصہ بن چکی ہیں۔ اپنے ایک افسانوی مجموعے 'شہر افسوس' کے دیباچے میں خود فرماتے ہیں:

''جو لوگ اپنی زمین سے بچھڑ جاتے ہیں پھر کوئی زمین انھیں قبول نہیں کرتی''

انتظار حسین افسانہ نگاروں کے اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جس نے 1947 کے آس پاس لکھنا شروع کیا۔ ابتدائی دو افسانوی مجموعے 'گلی کوچے' اور 'کنکری' کے نام سے شائع ہوئے، جن میں ہجرت اور ماضی کی بازیافت کی سیدھی سادی کہانیاں ہیں۔ لیکن تیسرے افسانوی مجموعے 'آخری آدمی' سے انتظار حسین کو خاصی شہرت ملی۔ ان افسانوں میں انتظار حسین نے اسطور و علامت کا سہارا لے کر تمثیلی انداز میں روحانی زوال، اخلاقی اقدار کی شکست و ریخت اور ذہنی انتشار کو پیش کیا ہے اور چند برسوں کے اندر ہی اردو افسانہ نگاری کی تاریخ میں بقول فرمان فتح پوری ''ایک انمٹ نقش بنا لیا۔''[1]

انتظار حسین کی ساخت وپرداخت یا شخصیت کی تشکیل مخصوص گھریلو حالات اور پُر آشوب سماجی افراتفری کی رہینِ منت ہے جس کے اہم اجزا میں تین ہجرتیں شامل ہیں یعنی ڈبائی سے ہاپوڑ، ہاپوڑ سے میرٹھ اور میرٹھ سے لاہور۔ انتظار حسین کی زندگی اور ادبی زندگی میں سے اگر ان ہجرتوں کو نکال دیا جائے تو منظر علی کے اس فرزند کی پہچان مشکل ہی سے ہو پائے گی۔ انتظار حسین کی ساخت وپرداخت میں ہجرتوں کے علاوہ ڈبائی کے کھیت کھلیان، جھاڑ جھنکاڑ اور پرندے بھی شامل ہیں علاوہ ازیں ہاپوڑ کے درختوں پر بیٹھی فاختائیں، ہاپوڑ سے گزرتی ہوئی ریل کی پٹری، وہاں کے میلے، محرم کی مجلسیں اور میرٹھ کے دوست احباب نے بھی اہم رول ادا کیا۔ ان ہی تمام عناصر سے جو زندگی عبارت ہوئی اسے ہم اردو کے جدید اور ممتاز افسانہ نگار انتظار حسین کے نام سے جانتے ہیں۔

انتظار حسین علامتی، تمثیلی اور داستانوی اسلوب بیان کی وجہ سے اردو کے افسانوی ادب میں ایک نئے طرز کے موجد کہے جاتے ہیں۔ جدید دور کے افسانہ نگاروں میں ان کا نام اس اعتبار سے بھی منفرد ہے کہ انھوں نے اردو افسانے کو نہ صرف نئے معنیاتی اور فنی امکانات سے آشنا کیا، بلکہ علامت نگاری کے رجحان کا باقاعدہ آغاز بھی ان ہی کے افسانوں سے ہوتا ہے۔ جب کہ شروع میں بیان کیا گیا ہے کہ ان کے فن کا بنیادی تجربہ ہجرت کا تجربہ ہے۔ انھوں نے تقسیم وطن اور 1857 کے واقعات اور سانحات کو تاریخ میں ایسی وارداتیں قرار دیا ہے جنھوں نے زمانے کو اپنی پوری تہذیب اور روایت کے محور سے ہٹا دیا۔ 1857 اور تقسیم وطن کے بعد سرحدوں کے دونوں طرف کشت وخون کا جو بازار گرم ہوا، اس کی ایک بھیانک صورت حال نقلِ مکانی کی صورت میں سامنے آئی۔ خود انتظار حسین بھارت سے پاکستان چلے گئے اور ہجرت کا یہی تلخ تجربہ ان کے فن کا بنیادی تجربہ بن گیا۔ آخری آدمی، زرد کتا، کایا کلپ، اپنی آگ کی طرف، پرچھائیاں، رات، دیوار، کشتی اور 'شہر افسوس' ایسے افسانے ہیں جو علامتیت اور اساطیریت کے ساتھ ساتھ ماضی کی بازیافت کے سلسلے میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

انتظار حسین 21 دسمبر 1925 کو قصبہ ڈبائی ضلع بلند شہر (یوپی) میں پیدا ہوئے اور 2 فروری 2016 کو انتقال کر گئے۔ والد کا نام منظر علی تھا جو ایک صوفی منش آدمی تھے۔ انتظار حسین کے خاندان کی ہر نسل میں کوئی نہ کوئی فقیر درویش یا صوفی ضرور ہوا ہے جس کا ذکر خود انتظار حسین نے اپنے ایک انٹرویو میں ان الفاظ میں کیا ہے:

''میں اپنے والد صاحب سے پہلے اپنے اجداد کے متعلق ایک بات عرض کروں: میں بچپن میں سُنتا رہا ہوں کہ ہمارے خاندان کی ہر نسل میں کوئی نہ کوئی بڑا فقیر یا درویش یا صوفی، جو بھی آپ کہنا چاہیں، ہوتا رہا۔''2

ڈبائی ضلع بلند شہر یوپی میں اپنی زندگی کے ابتدائی نو دس سال گزارنے کے بعد انتظار حسین اپنے والد کے ساتھ ہاپوڑ ضلع میرٹھ میں آ کر رہنے لگے کیونکہ ان کے خاندان کے بیشتر افراد ہاپوڑ ہی میں آباد تھے۔ اس ابتدائی زندگی کے واقعے کا ذکر خود انتظار حسین نے اپنے ایک خط میں کیا ہے جو انھوں نے ارتضیٰ کریم کو یکم اگست 1995 کو لکھا تھا کہ:

''بلند شہر کے ضلع میں قصبہ ڈبائی ہے وہاں میں پیدا ہوا۔ مگر ہمارا خاندان زیادہ تر ہاپوڑ (میرٹھ) میں آباد

تھا۔ سو نو دس سال کی عمر میں میں اپنے والدین کے ساتھ نکل کر ہاپوڑ میں جا آباد ہوا۔''3

انتظار حسین کی زندگی کی یہ پہلی ہجرت تھی۔ اپنے بچپن کا یہ چھوٹا سا قصبہ 'ڈبائی' آج بھی ان کے شعور کے نہاں خانوں میں بسا ہوا ہے۔ ان کے افسانے ہوں یا ناول یا کوئی اور تحریر، جو چیز ہر جگہ جھلکتی ہے وہ ماضی کی یادیں، وطن کی مٹی کا ذکر اور اپنی بستی سے اکھڑنے کا کرب ہے۔ سہیل احمد سے بات چیت کرتے ہوئے اپنے بچپن اور اپنے آبائی وطن (ڈبائی) کا بیان اس طرح کرتے ہیں:

''علی گڑھ کے قریب بلند شہر کے ضلع میں ایک چھوٹی سی بستی تھی 'ڈبائی' سُنتے ہیں اب بھی ہے، اس بستی میں پیدا ہوا۔ جہاں تک میرا خیال ہے میں دس گیارہ سال تک اس بستی میں رہا ہوں۔ وہ نو دس سال تھے یا دس گیارہ سال تھے مجھے یوں لگتا ہے کہ وہ ایک پوری صدی تھی۔ وہ علاقہ، وہ چھوٹی سی زمین، وہ بستی، اس کے باہر کے چھوٹے چھوٹے دیہات جہاں میں کبھی کبھی یکّے میں بیٹھ کر جایا کرتا تھا اور کبھی بیل گاڑی میں، ان سب چیزوں کو دھیان میں لاتا ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے کہ وہ چھوٹی سی زمین پورا برِّ اعظم تھی تو میں اس بستی کی کس کس چیز کا ذکر کروں؟ ان درختوں کا ذکر کروں جن کے سائے میں، میں نے پرورش پائی اور تربیت حاصل کی۔ املی کے پیڑوں کا، نیم کے پیڑوں کا ذکر کروں جو میں نے ان دنوں دیکھے....''4

انتظار حسین اپنی نانی سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ انھوں نے اپنی نانی ہی کو پہلی اور سب سے بڑی معلّمہ بتایا ہے۔ رات کو سونے سے پہلے وہ انھیں قصّے کہانیاں سُنایا کرتی تھیں۔ ان کا ماننا ہے کہ فکشن کی ابتدائی تعلیم اسکول کی تعلیم سے قبل انھوں نے اپنی نانی اماں ہی سے حاصل کی۔ جب کبھی بھی کہیں پر تعلیم کا ذکر چھڑتا ہے تو انتظار حسین اپنی نانی کو یاد کر کے ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہیں:

''جناب ایک ہستی تو پھر جس کے بارے میں ذکر کر کے اب تک بہت نادم ہو رہا ہوں اور ایک لمبے عرصے سے مجھ پر اس حوالے سے تقاضا ہو رہا ہے وہ میری نانی اماں تھیں۔ میری نانی اماں بھی میرے لیے بہت بڑی معلّمہ تھیں۔ اس سلسلے کی جو ابتدائی تعلیم ہے وہ میں نے انھیں سے حاصل کی۔ الف لیلہ بھی ہمارے گھر میں رکھی ہوئی تھی جسے میری بہنیں پڑھا کرتی تھیں۔ فکشن کی ابتدائی تعلیم میں نے اپنی نانی اماں اور الف لیلہٰ ہی سے حاصل کی۔''5

انتظار حسین کے بھائی بہنوں کے بارے میں قطعی طور سے کچھ معلوم نہیں چلا۔ ان سے جب بھی کسی نے اس بارے میں بات کی تو انھوں نے بات ٹال دی اور کچھ کہنے سے انکار کیا، البتہ افسانوی مجموعے 'آخری آدمی' کے آخر میں انھوں نے ایک مضمون ''اپنے کرداروں کے بارے میں'' تحریر کیا ہے جس میں انھوں نے اپنی ایک

بھن کا ذکر بڑے ہی ادب و احترام سے کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ان سے عمر میں بڑی تھیں۔ اس کے علاوہ اپنی ابتدائی تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا ہے کہ "الف لیلہ بھی ہمارے گھر میں رکھی ہوئی تھی جسے میری بہنیں پڑھا کرتی تھیں۔" یہاں انھوں نے صیغہ جمع 'بہنیں' استعمال کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی ایک سے زیادہ بہنیں تھیں۔ جنھوں نے انھیں متاثر کیا۔

انتظار حسین کے والد مذہبی قسم کے آدمی تھے اس لیے وہ چاہتے تھے کہ انتظار حسین مذہبی تعلیم حاصل کریں۔ ابتدائی تعلیم گھر ہی پر والد کے زیر سایہ ہوئی۔ شروع ہی سے عربی تعلیم سے روشناس کرایا گیا۔ والد محترم نے انتظار حسین کو اسکول میں داخلہ دلانا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ وہ جدید تعلیم کو تخریب اخلاق تصور کرتے تھے۔ اس لیے جب تک بستی میں رہے اسکول میں داخل نہ ہوسکے۔

انتظار حسین کو بچپن ہی سے اردو سے لگاؤ تھا۔ اگرچہ ان کے والد انھیں عربی کی تعلیم دے رہے تھے لیکن وہ چوری چوری اردو کی کتابیں والد کے کتب خانے سے نکال کر پڑھتے تھے۔ اس سلسلے میں انتظار حسین کا کہنا ہے:

"وہ بہت سالوں تک مجھے عربی پڑھانے کی کوشش کررہے تھے اور میں چھپ کر ان سے، اردو کی کتابیں پڑھتا رہا تو میرا مطالعہ اور یہ تعلیم جو ہے کہ میرے والد صاحب مجھے کچھ تعلیم دینے کی کوشش کررہے تھے میں کچھ اور تعلیم حاصل کررہا تھا۔"[6]

گھر پر تعلیم حاصل کرنے کا یہ سلسلہ اس وقت منقطع ہوا جب ان کے خاندان نے ڈبائی سے ہاپوڑ ہجرت کی اور وہیں سکونت اختیار کی۔ ہاپوڑ میں انتظار حسین نے باقاعدہ اسکول کی تعلیم کا آغاز کیا اور وہیں ہائی اسکول تک کی تعلیم حاصل کی۔

انتظار حسین نے اپنی پیدائش کے دس سال بعد 1935 میں ہاپوڑ ہجرت کی اور اسکول میں داخلہ لیا۔ چونکہ گھر پر ابتدائی تعلیم کا اہتمام تھا لہذا اسکول میں انھیں پانچویں جماعت میں داخل کیا گیا۔ اس کے چار سال بعد یعنی 1938 میں انھوں نے نویں جماعت کا امتحان دیا۔ سہیل احمد کو دیے گئے ایک انٹرویو میں انتظار حسین نے کہا:

"جب میں نویں کلاس کا امتحان دینے جارہا تھا تو میں نے یہ سنا کہ علامہ اقبال کا انتقال ہوگیا۔"[7]

انتظار حسین نے 1942 میں میٹرک کا امتحان پاس کیا اور 1945 میں بی۔ اے۔ (B.A.) کے لیے کالج میں داخلہ لیا۔ 1945 میں بی۔ اے۔ میں کامیابی حاصل کی۔

بی۔ اے۔ کن مضامین سے کیا اس کی وضاحت کہیں نہیں ملتی۔ البتہ 1947 میں میرٹھ کالج سے اردو میں ماسٹرس کی ڈگری حاصل کی۔ ہاپوڑ سے میرٹھ انتظار حسین 1941 میں آئے۔ یہ ان کی زندگی کی دوسری ہجرت تھی۔ اس وقت انتظار حسین کی عمر 14 سال کی تھی۔ اس کے بعد انھوں نے انگریزی میں بھی ماسٹرس کی ڈگری حاصل کی۔

انتظار حسین نے جہاں اپنی نانی اماں اور الف لیلہ کو اپنا اولین معلم بتایا ہے وہیں میرٹھ کالج کے اُستاد پروفیسر کرار حسین کا ذکر بھی خاص طور سے کیا ہے۔ کرار حسین ان کے عزیز بھی تھے اور ان کے ہم وطن بھی۔ جب انتظار حسین نے میرٹھ سے پاکستان ہجرت کی تو کرار حسین نے بھی اسی زمانے میں ہندوستان سے

> **"انتظار حُسین جہاں مغربی تہذیب کی مخالفت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں وہیں مشرقی تہذیب اور رہن سہن کو بہت پسند کرتے ہیں۔ چنانچہ ٹیبل پر بیٹھ کر آم کاٹنے سے کراہت ہوتی ہے وہ اکثر بڑے تأسف سے کہتے ہیں 'اب آم بھی ٹیبل پر پہنچ گیا' ان کو بچپن ہی سے کھیت کھلیانوں سے بڑی دلچسپی رہی ہے چنانچہ املی کے درخت سے املی کھانا، جامن کے پیڑ سے جامن توڑ کر کھانا، بیر کے پیڑ سے بیر توڑ کر کھانا انہیں اچھا لگتا تھا انہیں میلوں سے بھی خاصی دلچسپی رہی ہے۔ جامعہ کا بازار ہو یا چاندنی کلب، دکان پر ٹھہر کر جلیبیاں کھانا انہیں بے حد پسند تھا"**

ہجرت کی تھی۔ اس طرح پاکستان میں بھی انتظار حسین کو پروفیسر کرار کی رہنمائی حاصل رہی۔

انتظار حسین کو کھیل کود سے بھی خاصی دلچسپی رہی ہے۔ بچپن میں کئی قسم کے کھیل کھیلتے تھے جیسے گلی ڈنڈا، پتنگ بازی وغیرہ۔ جب بھی گھر سے باہر جانے کی مہلت ملتی تو اکثر یا تو گلی ڈنڈا کھیلتے یا پتنگ اُڑاتے اور جب گھر میں رہتے تو چپکے چپکے ایک کتاب جس میں جادوگروں اور جنوں کی تصویریں تھیں پڑھا کرتے تھے۔ یہ کتاب الف لیلہ تھی جس کو پڑھنے سے ان کے والد نے انھیں منع کیا تھا۔

انتظار حسین کے بچپن کے ساتھیوں میں ان کے اسکول کے ایک دوست ریوتی سرن شرما تھے جن کے ساتھ وہ ہاپوڑ کی گلیوں میں کھیلا کرتے تھے اور دوسرا دوست فاختہ۔ فاختہ کے بارے میں ان کا ایمان ہے کہ جس جگہ بیٹھی ہے تو بس بیٹھی ہی رہتی اور اپنے مخصوص آہنگی اور دھیمے لہجے میں بولے جارہی ہے۔ یہ وہ پرندہ ہے جو انتظار حسین کے لیے کوئی طائر کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ یہ ان کے بچپن اور ان کے ماضی کے دوست کا استعارہ بن کر سامنے آتا ہے۔ ریوتی سرن شرما سے دوستی بنائے رکھنے کے لیے انتظار حسین نے اپنے والد سے ایک طرح کی بغاوت کی۔ ادب کا چسکا دونوں کو یکساں تھا اس لیے دونوں نے ایک ساتھ ادبی سفر شروع کرنا چاہا تھا لیکن تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ تقسیم سے نہ صرف زمین اور سرحدیں بٹ گئیں بلکہ بہت سے خونی و دلی رشتے بھی تقسیم ہوگئے۔ اس بارے میں خود انتظار حسین فرماتے ہیں:

"ادب کا چسکا ہمارا مشترک تھا اور میری پہلی ہم سفری ریوتی سرن شرما کے ساتھ ہے ہم نے تو طے بھی کیا کہ ادب کی دنیا میں ساتھ ساتھ سفر کریں گے لیکن قدرت کو یہ منظور نہیں تھا۔ اب وہ کہیں ہے اور میں کہیں۔"[8]

انتظار حسین جہاں مغربی تہذیب کی مخالفت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں وہیں مشرقی تہذیب اور رہن سہن کو بہت پسند کرتے ہیں۔ چنانچہ ٹیبل پر بیٹھ کر آم کاٹنے سے کراہت ہوتی ہے وہ اکثر بڑے تاسف سے کہتے ہیں 'اب آم بھی ٹیبل پر پہنچ گیا' ان کو بچپن ہی سے کھیت کھلیانوں سے بڑی دلچسپی رہی ہے چنانچہ املی کے درخت سے املی کھانا، جامن کے پیڑ سے جامن توڑ کر کھانا، بیر کے پیڑ سے بیر توڑ کر کھانا انھیں اچھا لگتا تھا۔ انھیں میلوں سے بھی خاصی دلچسپی رہی ہے۔ جامعہ کا بازار ہو یا چاندنی کلب، دکان پر ٹھہر کر جلیبیاں کھانا انھیں بے حد پسند تھا۔

انتظار حسین ہندو مذہب کا بے حد احترام کرتے تھے۔ انھیں گنگا ندی سے کافی لگاؤ تھا۔ انتظار حسین کو بھجن سننا بھی اچھا لگتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میرٹھ میں ان کے گھر کے سامنے جو مندر تھا اس کا پروہت سویرے سویرے بھجن گایا کرتا تھا۔ انتظار حسین کا کہنا ہے کہ:

"بھجن سنتا ہوں تو وہ ساری فضا میرے لیے زندہ ہوجاتی ہے۔ اسی لیے جتنا اثر مجھے بھجن سُن کر ہوتا ہے کسی اور چیز کو سُن کر نہیں ہوتا۔"[9]

جہاں تک ہندوستان سے ہجرت کا سوال ہے تو یہ ان کے یہاں محض ایک جگہ کو چھوڑ کر دوسری جگہ بس جانے کا نام نہیں ہے اور نہ ہی یہ صرف تقسیم ملک کا واقعہ ہے۔ بلکہ اس ہجرت کی وجہ سے انھوں نے صدیوں کی تہذیب کو مٹتے ہوئے دیکھا ہے۔ بسی بسائی بستیوں کو

اُجڑتے ہوئے دیکھا ہے اور تحقیقی اعتبار سے دیکھا جائے تو ہجرت کے شدید احساس ہی نے انتظار حسین کے یہاں ایک یاس انگیز داخلی فضا کی تشکیل کی ہے۔

انسان جب بھی ہجرت کرتا ہے اس کی معلومات میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ رہن سہن متاثر ہوجاتا ہے اور نئی زمین شروع شروع میں اجنبیت کا احساس پیدا کرتی ہے چھوڑی ہوئی زمین خواب بن کر بار بار اپنی یادیں دلاتی رہتی ہے۔ انتظار حسین کو صرف ایک یا دو نہیں بلکہ تین

انسان جس ماحول میں پیدا ہوتا ہے اور جہاں پلا بڑھا ہوتا ہے وہاں کے اثرات زندگی بھر اس کے ساتھ رہتے ہیں کیوں کہ ایک انسان کی شخصیت کو بنانے میں زندگی کے ابتدائی سال ہی سب سے اہم رول ادا کرتے ہیں۔ بچپن میں انسان کے ساتھ جو حالات وواقعات پیش آتے ہیں ان ہی سے اس کی ساری شخصیت تعمیر ہوتی ہے اور انتظار حسین کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ انھوں نے خود اس بارے میں ایک جگہ ذکر کیا ہے:

اور ایم۔اے (اردو) میرٹھ کالج سے کیا۔ انتظار حسین کی ان علاقوں سے متعلق یادیں اس وقت ناسٹلجیا میں ڈھل گئیں جب انھوں نے 1947 میں ان علاقہ جات میں فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑنے کی وجہ سے انتہائی کسمپرسی کے عالم میں لاہور کا رخ کیا تھا۔ وہ دن اور آج کا دن، وہ ان یادوں کے حصار سے باہر نہیں نکل پائے تھے۔ یقیناً لاہور میں ایک مہاجر کے طور پر ان کی آمد کے بعد اہل پنجاب کا رویہ شہر مدینہ کے انصار جیسا تو نہ ہوگا۔

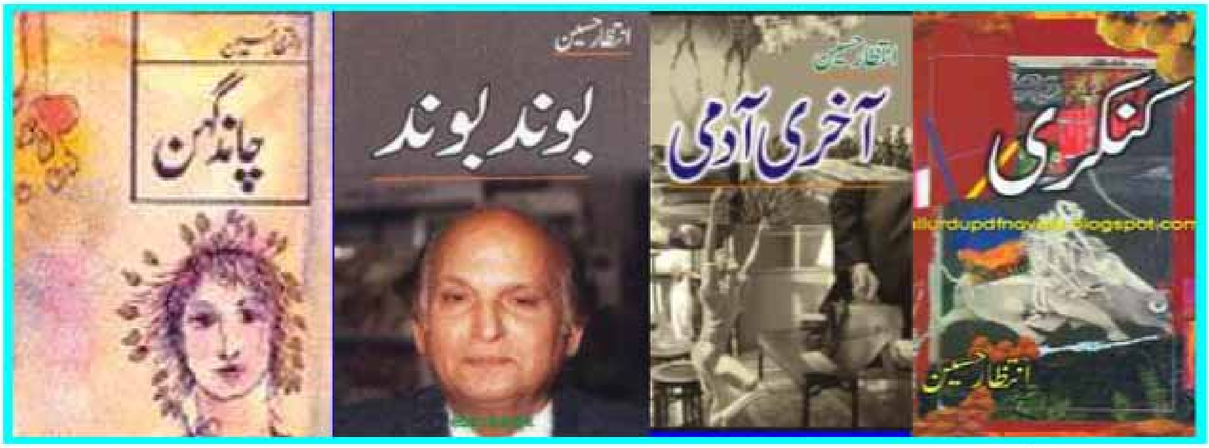

ہجرتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ انھیں صرف دس سال کی عمر میں ہی اپنی بستی کو چھوڑنا پڑا۔ اس واقعے کو انھوں نے اپنی زندگی کا پہلا داغ قرار دیا ہے اس سلسلے میں ان کا کہنا ہے کہ:

''پہلا داغ اس وقت لگا جب میں نے اپنی بستی سے ہجرت کی اور اٹھ کر دوسرے شہر آیا جسے میرٹھ ضلع کہتے ہیں۔''[10]

انتظار حسین نے دوسری ہجرت 16 برس کی عمر میں 1941 میں ہاپوڑ سے میرٹھ کی۔ انتظار حسین کی زندگی کی یہ دو اوّلین ہجرتیں ایک طرح سے ان کے لیے باوجود اپنی سرزمین یا بستی سے جدا ہونے کے خوش آئند تبدیلیاں لے کر آئی تھیں۔ لیکن 1947 کی ہجرت نے انھیں اپنے وطن سے ہمیشہ کے لیے جدا کردیا تھا جسے وہ آج تک نہیں بھول پائے تھے اور یہی ہجرت ان کی ناسٹلجیائی سوچ کی تشکیل میں نمایاں رہی۔ خود ایک جگہ فرماتے ہیں:

''ہجرت اور پاکستان لازم وملزوم ہیں۔ کیا میں ہجرت کو بھول جاؤں؟ اگر ہم پاکستان پہنچ چکے ہیں تو کیا میں 1947 کو فراموش کردوں؟ اگر میں اسے بھول گیا تو پاکستان میرے لیے بے معنی ہوجائے گا۔ جس تاریخ کے بطن سے پاکستان پیدا ہوا ہے، اس تاریخ کو لوگ کہتے ہیں کہ بھول جاؤں، حالانکہ یہ تو ناجائز اولاد کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنے ماضی کو بھول جائے۔''[12]

''مجھے اس بستی سے ابتدائی عمر میں ہی نکلنا پڑا ...دس سال کی عمر میں وہاں سے نکلا لیکن مجھے یوں لگتا ہے کہ میرے تعلیم وتربیت کے سال وہی ہیں، حالانکہ میں نے وہاں کسی اسکول میں نہیں پڑھا۔''[13]

انتظار حسین کی ادبی زندگی میں اس ابتدائی زندگی کے واقعے 'یعنی بستی سے ہجرت کے عمل' نے بڑا رول ادا کیا۔ یہی بستی بقول انتظار حسین انھیں کچھ تحریر کرنے پر انسپائر (Inspire) کرتی ہے۔ اس بارے میں انتظار حسین فرماتے ہیں:

''بستی سے اب میری ملاقات معلوم نہیں کبھی ہوگی یا نہیں لیکن خواب میں میری اس بستی سے بہت ملاقات ہوتی ہے اور جب خواب میں اس بستی کو دیکھتا ہوں تو بہت دنوں تک خواب میں نہیں آتی تو مجھے یوں لگتا ہے کہ جانے نہیں اب میں کہانی لکھ سکوں گا یا نہیں لیکن خدا کا شکر ہے پھر وہ بستی کسی موڑ پر اپنا درشن دے جاتی ہے اور میرا قلم پھر رواں ہوجاتا ہے۔''[13]

مختصر انتظار حسین کا ناسٹلجیا ضلع بلند شہر کے ایک نواحی قصبے 'ڈبائی' اور میرٹھ شہر سے متعلق ہے۔ ان کی ابتدائی یادیں قصبہ 'ڈبائی' اور 'ہاپوڑ' سے متعلق ہیں اور اس کے بعد کی یادیں شہر میرٹھ سے متعلق ہیں یعنی پیدائش قصبہ 'ڈبائی' کی ہے اور لڑکپن 'ہاپوڑ' میں گزرا۔ بی۔اے

لہٰذا وہ جب جب ناروا سلوک کا سامنا کرتے ہوں گے تو انھیں ناسٹلجیا گھیر لیتا ہوگا۔ اسے ہم نفسیاتی عارضہ تو قرار نہیں دے سکتے، جیسا کہ نفسیات کے محققین قرار دیتے ہیں— البتہ یہ انسانی فطرت کا حصہ ہے اور رہے گا۔

حوالہ جات:

1. فرمان فتحپوری۔ اردو افسانہ اور افسانہ نگار، ص 301
2. ایک بات چیت۔ محمد عمر میمن، مشمولہ انتظار حسین ایک دبستان، ص 90
3. ارتضیٰ کریم۔ داستان سے دبستان تک، مشمولہ انتظار حسین ایک دبستان، ص 17
4. کمیل احمد۔ گمشدہ پرندوں کی آوازیں، مشمولہ آخری آدمی، ص 99
5. ایضاً، ص 103
6. ایضاً، مشمولہ انتظار حسین ایک دبستان، ص 98
7. ایضاً، ص 103
8. ایضاً، ص 106
9. کمیل احمد۔ گمشدہ پرندوں کی آوازیں، ص 111
10. ایضاً، ص 98
11. ایک گفتگو۔ انتظار حسین / طاہر مسعود، مشمولہ انتظار حسین ایک دبستان، ص 117
12. کمیل احمد۔ گمشدہ پرندوں کی آوازیں، ص 102
13. ایضاً، ص 111

■

Nisar Ahmad Dar, Research Scholar, Taregam Kagam Kashmir
Mob.:9032841744

ریشماں پروین

آہ! عابد سہیل

(بڑا ہے ادب کا رشتہ)

26 جنوری کی وہ سیاہ شام میں کبھی نہیں بھول سکتی جب بذریعہ فون مجھے عابد سہیل کے انتقال کی خبر ملی۔ ایک لمحہ تو اپنی سماعت پر یقین ہی نہیں ہوا۔ ایسا محسوس ہوا کہ جیسے میں کوئی بھیانک خواب دیکھ رہی ہوں۔ نہیں یہ سچ نہیں ہو سکتا! کہتے ہوئے میں نے فوراً بابا (پروفیسر شارب ردولوی) کو فون کیا۔ "یہ خبر سچ ہے ریشماں" بابا کی آواز جیسے بہت دور سے آئی، لیکن کیسے ابھی تو کچھ دن پہلے عابد انکل بالکل ٹھیک تھے۔ ہاں بیٹا یہ سچ ہے بس اپنے آپ کو سنبھالو۔ مجھے شمیم (پروفیسر شمیم نکہت) کو بھی دیکھنا ہے۔

بابا (پروفیسر شارب) سے بات ہونے کے بعد میرے آنسوؤں نے مجھ پر ایسا حملہ کیا کہ کچھ سمجھ میں ہی نہیں آیا بس میں نے سیدھا پروفیسر شارب ردولوی کے گھر کا رخ کیا جہاں آپا، بابا دونوں عابد سہیل کی یادوں کے اتھاہ سمندر میں غرق تھے۔ ان دونوں کو دیکھتے ہی میرے صبر کا باندھ پھر ٹوٹ گیا اور اب ہم تینوں اپنے ادبی خاندان کی روح عابد سہیل سے بچھڑنے کے صدمے کو برداشت کرنے کے لیے کوشاں تھے۔ جو کبھی واپس نہ آنے کے لیے ہم سے بہت دور چلے گئے تھے انھوں نے اپنا دائمی بسیرہ دور آسمانوں میں کر لیا تھا جہاں ان سے ملنے کا موقع نہ جانے کب ملے گا؟ اور کب وہ مسکرا کر پوچھیں گے؟ "اب کیا لکھ رہی ہو ریشماں بیٹا؟"

عابد سہیل سے میری ملاقات آج سے تقریباً دس برس قبل پروفیسر شارب ردولوی کے یہاں ہوئی جب میں نے کرلیکچرر کی حیثیت سے کھن کھن جی گرلس پی جی کالج لکھنؤ جوائن کیا اور پروفیسر شارب ردولوی کے یہاں رہنے لگی۔ شارب صاحب کا گھر علم و ادب کا مرکز تھا جہاں ہر وقت ادب اور کتابوں کی باتیں ہوتیں۔ ادبی دنیا کے معتبر لوگ جمع ہوتے اور ہر نشست میں نئے نئے ادبی موضوعات پر مباحثہ ہوتا۔

عابد سہیل اور ان کی زوجہ انجم نصرت بھی اکثر تشریف لاتے۔ عابد سہیل کوئی کہانی سناتے یا کسی ادبی موضوع پر گفتگو ہوتی، ہم سب ہمہ تن گوش سنتے، سامعین میں اکثر میں، ارم، اور گھر میں رہنے والے دوسرے لوگ بھی شامل ہوتے، افسانہ سننے کے بعد ہم سب اپنی اپنی رائے دیتے۔ بلکہ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ بابا نے کوئی مضمون مکمل کیا، ہم سب کو سنایا اور پھر اس مضمون کے مکمل ہونے کی خوشی میں دعوت ہوتی جس میں ہمارے اس مختصر ادبی خاندان کے مخصوص لوگ ہی شامل ہوتے۔ آہستہ آہستہ کرکے یہ سلسلہ بڑھتا گیا۔ میں جو صرف ایم اے بی آر ایف کے بعد لیکچرر ہو گئی تھی اور ادب کے میدان میں نو وارد، جب یہ مباحث سنتی تو ایک عجیب سی کیفیت مجھ پر طاری ہوتی، میں دیکھا کرتی کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی زندگی کا مرکز و محور صرف اور صرف ادب ہے۔ عابد سہیل جب بھی ملتے، بڑی محبت سے پوچھتے ریشماں بیٹا کیا لکھ رہی ہو؟ تحقیق کا کام کیسا چل رہا ہے؟ دوران تحقیق مجھے اکثر کتابوں کی ضرورت ہوتی۔ میں بلا جھجک عابد سہیل سے مانگ لیتی۔ بہت خوش ہوتے اور کہتے "دیکھو کتابیں واپس ضرور کر دینا"۔

نئی نسل میں ادبی ذوق کے پروردہ تھے عابد سہیل اور یہ کام وہ بالواسطہ انداز میں کرتے تھے۔ انھوں نے ہمیشہ نئے تخلیق کاروں کی حوصلہ افزائی کی۔ وہ نئے اور پرانے ادیبوں کے درمیان خلوص و محبت کے خواہاں تھے اور نئی نسل کو محنت و عمل کے ذریعے ایک بلند مقام پر دیکھنے کے خواہشمند۔ عابد سہیل کا مضمون "عصمت چغتائی، یادیں، باتیں" ستمبر 2015 نیا دور لکھنؤ میں شائع ہوا جس میں انھوں نے عصمت چغتائی کے لکھنؤ آنے پر ان کے اعزاز میں ہونے والے ایک جلسہ (1962) کا ذکر کیا تھا۔ اس جلسے کا موضوع نئے افسانہ نگاروں کے مسائل تھا۔ عصمت سے سوالات ہوتے رہے جس کے جواب میں انھوں نے کہا کہ نئے افسانہ نگاروں کو اپنے مسائل کو خود پہچاننا چاہیے۔ ان کے جواب کے ردعمل میں لکھنؤ

کے ایک مشہور ادیب نے کہا کہ "نئے ادیبوں کے لیے سب سے بڑا مسئلہ پرانے (سینئر) ادیب ہیں ان کا جملہ کچھ اس طرح تھا:

"جب تک یہ مینار گرائے نہیں جائیں گے نئے مینار قائم کیسے ہوں گے"۔

اس پر صحبت کے بجائے عابد سہیل نے جواب دیا وہ خود بھی اس وقت نوجوان تھے، عابد سہیل کا جواب تھا:

"پرانے میناروں کو گرانے کی ضرورت نہیں ان کے پاس ان سے بھی اونچا مینار قائم کردیا جائے وہ آپ ہی چھوٹے ہوجائیں گے"۔

میں نے یہ مضمون پڑھا اور عابد سہیل سے پوچھا اس جملے سے آپ کا کیا مطلب تھا؟ فوراً جواب دیا۔ "ارے بھائی سیدھی سی بات ہے اگر نئی نسل کو آگے آنا ہے ترقی کرنا ہے، بلند مقام حاصل کرنا ہے، اپنی بات دلیری سے کہنی ہے تو اس کے لیے سخت محنت کی ضرورت ہے۔ مینار ہوا میں کھڑے نہیں ہوتے' پرانے میناروں کو گرا کر سوائے ذلت کے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ آپ محنت کریے خوب مطالعہ کیجیے، پرانے میناروں سے روشنی حاصل کیجیے۔ جب ہی تو بلند مینار بن کر پرانے میناروں کے سامنے کھڑے ہوسکیں گے۔ عابد سہیل کی ادبی زندگی خود ان کی اس بات کی مثال ہے۔ اپنی محنت اور سخت کوشی کی وجہ سے ہی آج عابد سہیل اردو فکشن کا بڑا نام ہے۔

مجھے جاسوسی ناول پڑھنے کا شوق اسکول کے دنوں سے تھا، علی گڑھ میں میرے بڑے چچا انوارالدین صاحب ابن صفی کی جاسوسی دنیا کے زبردست دلدادہ تھے میں نے ان کو سڑک پر چلتے ہوئے ابن صفی کے ناول پڑھتے ہوئے دیکھا، مجھے تجسس ہوا کہ آخر ان کتابوں میں ایسا کیا ہے جو انوار صاحب انھیں پڑھنے میں اس قدر محو ہوجاتے ہیں، ایک دو ناول پڑھنے کے بعد مجھے جاسوسی دنیا کا ایسا ذائقہ لگا کہ میں نے ان کی الماریوں میں لگے ابن صفی کے سارے ناول پڑھ ڈالے۔ کچھ برس بعد شوق ذرا کم ہوا۔ پی ایچ ڈی کے بعد مزید مطالعے کی غرض سے بہت سی چیزیں پڑھنا شروع کیں۔ افسانے، ناول، تنقیدی مضامین، تنقیدی کتابیں اور بھی نہ جانے کیا کیا؟ دوسرے مصنفین کو پڑھنے کے ساتھ ساتھ عابد سہیل کے افسانوی مجموعوں، سب سے چھوٹا غم، جینے والے اور غلام گردش کا بھی مطالعہ کیا۔ ان کے افسانوں نے زندگی کی بہت سی تلخ حقیقتوں سے سامنا کرادیا، اب اندازہ ہوا کہ جاسوسی دنیا اور حقیقی دنیا میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ایک خیالی و تصوراتی ہے۔ دوسری سنگلاخ

عابد سہیل: سوانحی کوائف

نام : سید محمد عابد — قلمی نام : عابد سہیل

پیدائش : 27 نومبر 1932 پیدائش اورئی ضلع جالون یوپی — دادا کا نام : سید وزیر حسن

والد کا نام : سید ظفریاب حسن (چیف ریڈر ریلوائی آفیسر) — والدہ : عائشہ بیگم

1949 پہلا افسانہ دور آسمان کی خلاؤں میں دیوان سنگھ مفتون کے ہفت روزہ 'ریاست' میں شائع ہوا۔

1952 قومی آواز کے اعزازی نامہ نگار مقرر ہوئے (برائے یونیورسٹی) طلبہ تحریک میں سرگرم حصہ لینے کی پاداش میں جیل گئے۔

1957 بی اے انگریزی، فلسفہ اور معاشیات میں پاس کیا۔ — 1957 قومی آواز کے سب ایڈیٹر مقرر ہوئے۔

1959 فلسفہ میں ایم اے کیا۔ — 1961 بطور سب ایڈیٹر نیشنل ہیرالڈ سے وابستہ ہوئے۔

1962 ماہنامہ 'کتاب' جاری کیا۔ — 1972 نیشنل ہیرالڈ میں چیف سب ایڈیٹر بنائے گئے۔

1975 افسانوی مجموعہ سب سے چھوٹا غم شائع کیا۔ یوپی اردو اکادمی نے انعام سے نوازا۔

1979 امین آباد میں نصرت پبلشرز کا شوروم کھولا۔

1981 'اردو کے ادبی رسالوں کے مسائل' بطور مرتب یوپی اردو اکادمی سے شائع ہوئی۔

1982 نیشنل ہیرالڈ کے نیوز ایڈیٹر بنے۔

1988 ترتیب 'انتخاب مضامین احمد جمال پاشا'۔ یوپی اردو اکادمی نے شائع کیا۔

1990 روزنامہ 'صحافت' کے مشیر خصوصی مقرر ہوئے۔ پاینیر سے تعلق کے سبب ایڈیٹر بننا قبول نہیں کیا۔ تین سال تک صحافت کا اداریہ بھی لکھا۔

1994 میں 'سب سے چھوٹا غم' کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔ 1995 تا 1997 پاینیر کے شعبہ ادارت سے وابستہ رہے۔

1998 افسانوی مجموعہ 'جینے والے' شائع ہوا۔ — 2000 میں 'فکشن کی تنقید چند مباحث' شائع ہوا۔

2004 خاکوں کا مجموعہ 'کھلی کتاب' شائع کیا۔ — 2006 تیسرا افسانوی مجموعہ 'غلام گردش' منظر عام پر آیا۔

2008 ہندوستانی ادب کے معمار سیریز کے تحت ڈاکٹر عبدالعلیم کا مونوگراف ساہتیہ اکادمی نے شائع کیا۔

2008 'عبدالعلیم کی منتخب تحریریں' نیشنل بک ٹرسٹ نے شائع کی۔ یہ کتاب بھی عابد سہیل ہی نے ترتیب دی ہے۔

2010 حرف کا کرامت (اقوال زریں) ایک سو ایک اقوال زریں کا مجموعہ ان میں سے بیشتر اقوال کا ترجمہ عابد سہیل نے انگریزی سے کیا ہے۔ یہ کتاب تخلیق کار پبلشرز دہلی سے شائع ہوئی۔

2012 علیم شناسی: مضامین کا مجموعہ اس کتاب کو عابد سہیل نے مشاہیر اہل قلم سے عبدالعلیم کے حیات وخدمات پر مضامین لکھوا کر، گرانقدر مقدمے اور ان کی تنقید نگاری پر اپنے مضمون کے ساتھ عرشیہ پبلی کیشنز دہلی سے شائع کیا۔

2012 'جو یاد رہا' تجسیم خود نوشت یہ کتاب دہلی اردو اکادمی سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب اس فیلوشپ کا حصہ ہے، جس کے لیے تین مشاہیر قلم کو دہلی اردو اکادمی نے فیلوشپ دیا تھا اور باہمی صلاح و مشورے کے بعد عابد سہیل سے کہا گیا تھا کہ وہ اپنی زندگی اور طویل ادبی سفر کو اپنے پروجیکٹ کا موضوع بنائیں۔

2012 درد کا شجر (محبت کی کہانیاں) انتخاب و ترجمہ۔ یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے عرشیہ پبلی کیشنز دہلی سے شائع ہوئی۔

2012 کلیات عبدالعلیم (دو جلدوں میں) یہ کتاب بھی قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی سے، عابد سہیل کے طویل مقدمے کے ساتھ شائع ہوئی۔

اس کے علاوہ متعدد اداروں نے عابد سہیل کو ان کی خدمات کے تحت انعامات سے نوازا جو درج ذیل ہیں۔

- ☆ اترپردیش اردو اکادمی برائے مجموعی ادبی خدمات — ☆ اترپردیش اردو اکادمی کا مولانا آزاد انعام
- ☆ بنگال و بہار اردو اکادمیوں کے ایوارڈ (جینے والے، فکشن کی تنقید، کھلی کتاب، غلام گردش)
- ☆ اترپردیش سرکار کی جانب سے ایوارڈ برائے صحافتی خدمات — ☆ اردو اکادمی ایوارڈ (برائے مجموعی ادبی خدمات)
- ☆ غالب ایوارڈ (برائے تخلیقی نثر) — ☆ دہلی اردو اکادمی فیلوشپ
- ☆ ذہن جدید ایوارڈ (سال کا بہترین مقالہ)

• شاداب عالم، 243 جہلم ہاسٹل جے این یو

داویوں سے بھری، میں نے عابد سہیل سے ان افسانوں کے کرداروں کے بارے میں اکثر سوال کیے۔ انھوں نے بغیر کسی تکلف کے بیحد صاف گوئی سے کام لیا۔ کئی کردار ایسے بھی تھے جن پر گمان ہوا کہ یہ مصنف خود ہے۔ میری خوش نصیبی یہ تھی کہ میں ان کہانیوں کے تخلیق کار سے براہ راست یہ سب پوچھ سکتی تھی اور جب کسی کردار کے لیے عابد سہیل کا جواب ہاں میں آتا کہ وہ خود ہی ہیں تو میں حیرت زدہ رہ جاتی کہ یہ شخص جو بظاہر اتنا پُرسکون نظر آتا ہے اس نے زندگی بھر کانٹے دار راہوں پر سفر کیا ہے۔ عابد سہیل نے اپنی خودنوشت میں ان تمام واقعات کا ذکر بھی کیا ہے۔

اپنی کہانیوں میں معاشرے کے مسائل بڑی باریکی سے عابد سہیل نے پیش کیے ہیں۔ انسان کی مجبوریاں، ناکامیاں، بے بسی، زندگی کی جدوجہد کیا نہیں ہے؟ جو ان کہانیوں میں موجود نہیں بلکہ مصنف کا امتیاز یہ ہے کہ یہ کیفیات خود اس کے قلم کا کرب بن کر صفحۂ قرطاس پر رونما ہوتی ہیں۔

عابد سہیل کی خودنوشت بعنوان 'جو یاد رہا' شائع ہوئی، سب کی طرح میں نے بھی مبارک باد دی۔ دانش محل جا کر 'خودنوشت' کی کاپی لے کر آئی اور عابد سہیل سے گزارش کی کہ وہ اس پر کچھ لکھ دیں، عابد سہیل کچھ دیر تو مسکراتے رہے پھر کہنے لگے بھئی یہ کتاب میں نے تمھیں نہیں دی ہے اس لیے میں اس پر کچھ نہیں لکھوں گا۔ میں نے کہا کیوں؟ کسی کو اس کا پتہ ہی کیوں چلے گا؟ کہنے لگے نہیں، یہ میرے اصول کے خلاف ہے، میرے بہت اصرار کرنے پر انھوں نے کتاب پر بس ایک جملہ لکھا "اردو کتاب خرید کر پڑھنا چاہیے ایک قسم کی عبادت بھی ہے"۔

اس جملے پر مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی مگر آج جب عابد سہیل کے انتقال کے بعد ان کے اس جملے کو پڑھ رہی ہوں تو ان کی ایمانداری اور نیک نیتی کے ساتھ اس میں چھپا پیغام بھی واضح ہو رہا ہے کہ اگر اردو کی کتابیں خرید کر پڑھو گے تو اس زبان کی ترقی ہوگی اور یہ تمھارے لیے کارِ ثواب بھی ہے۔

کہتے ہیں نہ کہ، جہاں چاہ وہاں راہ۔ میں علی گڑھ کی رہنے والی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تعلیم یافتہ، مگر خوبیِ قسمت کہ نوکری مجھے لکھنؤ لے آئی۔ لکھنؤ بھی خدا نے مجھے ایک ایسے گھر بھیج دیا جہاں علم کا سمندر موجزن تھا۔ شارب ردولوی، شمیم نکہت اور عابد سہیل کے ساتھ نے میرے اندر ادبی ذوق کو مزید جلا بخشی۔

میری ادبی زندگی کا آغاز شاید ہی ہوتا اگر مجھے اپنے اس ادبی خانوادے کا ساتھ نہ ملتا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ میں تنہائی میں سوچتی ہوں کہ پروفیسر شارب ردولوی کے تو میں گھر میں رہتی ہوں مگر عابد سہیل سے میرا کیا تعلق ہے، حالانکہ میں انھیں انکل کہتی ہوں حقیقت میں تو وہ میرے انکل نہیں ہیں۔ مگر پھر یہ احساس غالب آ جاتا، ریشماں تم ایسی خرافات کیوں سوچتی ہو رشتے صرف خون کے ہی نہیں ہوتے۔ اور آخر ایک دن میں نے یہ سوال عابد سہیل سے کر ہی لیا، انکل میں اگر کہیں بھی شارب صاحب کو 'بابا' اور آپ کو 'انکل' کہہ کر پکارتی ہوں تو لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کیا آپ ان کی بیٹی اور بھتیجی ہیں؟ آپ بتائیے میں اس سوال کا جواب کیسے دوں؟ میں آپ دونوں کا نام لے کر توبات نہیں کر سکتی اور نہ ہی اس کی تشریح کہ آپ کو 'انکل' اور شارب صاحب کو 'بابا' کیوں کہتی ہوں؟ میرے سوال پر عابد صاحب زور سے ہنسے اور بڑی نرمی سے کہنے لگے بس اتنی سی بات، ارے بیٹا۔ یہ سوالات بچکانا سمجھ لوگ ہی کرتے ہیں اور جو ایسی باتیں کرتے ہیں ان کے لیے سب سے بہتر جواب یہی ہے کہ ہمارا خاندان اردو زبان و ادب ہے اور ہم سب کا رشتہ کتاب اور ادب کا رشتہ ہے اور یہ رشتہ ابدی ہے۔

جب میری پی ایچ ڈی ایوارڈ ہو گئی اور میں مضامین لکھنے کی طرف راغب ہوئی تو فکشن کی تنقید کے مباحث پر نہ جانے کتنے اہم نکات مجھے عابد سہیل نے سمجھائے جب بھی ان کی کوئی کتاب آتی یا لکھ رہے ہوتے تو ضرور ذکر کرتے اور کہتے 'ابھی فلاں کام کر رہا ہوں' اور جب میں کہتی 'آپ اتنا کیسے لکھ لیتے ہیں' تو مسکرا کر جواب آتا 'بس زندگی بھر یہی تو کیا ہے'۔

میری تنقید 2009 کے علاوہ اپنی دوسری کتاب "دیوانی ہوں جو سوچ کر دیکھو (2014)" کے مسودہ کو ٹائپ ہونے کے بعد جب میں نے عابد سہیل کو دکھایا تو بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ بیٹا اسے دو جلدوں میں شائع کراتا۔ ورنہ ضخیم کتاب کو اٹھانا اور پڑھنا دونوں مشکل کام ہیں۔

عابد سہیل کے انتقال سے تقریباً ایک مہینہ پہلے ہی میری ان سے آخری ملاقات ہوئی تھی۔ مجھے ایک سیمینار کے سلسلے میں عصمت چغتائی پر مضمون لکھنا تھا اور اس کے لیے عصمت کے ناول ایک قطرۂ خون کی ضرورت تھی میں نے فون کر کے پوچھا آپ کے پاس ناول ہے۔ کہنے لگے ہاں بھئی بالکل ہے۔ میں شام کو آ کر لے جاؤں گی۔ نہیں ابھی لے جاؤ ورنہ ہو سکتا ہے کہ میں شام میں نہ ملوں۔ ایک تو مجھے اس وقت ناول کی سخت ضرورت تھی دوسرے عابد صاحب کا تحکمانہ انداز، میں نے اپنے سارے کام پھر کسی وقت کے لیے رکھ چھوڑے اور فوراً عابد سہیل کے گھر پہنچ گئی۔

ہمیشہ کی طرح عابد سہیل اور انجم خالہ نے خوش آمدید کہا پھر عابد سہیل فکشن سے اور پرانے لکھنے والوں، عہد حاضر کے ادبی حالات پر تبصرہ کرتے رہے، مجھ سے بہت سی باتیں پوچھیں۔ یہ عابد سہیل کا طریقہ خاص تھا جب بھی ملتے ہمیشہ اپنے سوالات کے ذریعے وہ سامنے والے کے ذوق کو پرکھ لیتے، ہاں یہ ضرور ہے کہ بعض نامور لوگوں کی طرح اس کی دل شکنی نہیں کرتے تھے۔ مدد کرنے کے ساتھ مزید مطالعے کی تلقین عابد صاحب کی خصوصی نصیحت تھی۔ عصمت کے ناول ایک قطرہ خون، پر اظہار خیال کرنے کے ساتھ درمیان میں یہ تنبیہ بھی کرتے رہے۔ "اگر نہیں پڑھو گی تو کبھی اچھا نہیں لکھ سکو گی، معیاری کتابیں تمھارے علم میں اضافے کے ساتھ تمھاری تحریر بھی پختہ کریں گی"۔

ایک دن عابد سہیل کا فون آیا ریشماں یہ شعر نظیر اکبرآبادی کا ہے پوری غزل تلاش کرو۔ بہت اچھا شعر ہے، کون سا شعر؟ کہنے لگے:

ملو جو ہم سے تو مل لو کہ ہم بہ نوکِ گیاہ
مثالِ قطرۂ شبنم رہے، رہے، نہ رہے

نظیر اکبرآبادی کی غزل کا یہ شعر آج خود بخود عابد سہیل کے انتقال کے بعد میرے ذہن و دماغ میں گونج رہا ہے کہ زندگی کی بے ثباتی نہ جانے ہم میں سے کب کس کو نوکِ گیاہ پر رہنے والے قطرۂ شبنم کی طرح غائب کر دے، عابد سہیل بھی آج ہمارے درمیان نہیں لیکن اس کے باوجود وہ زندہ ہیں، ان کی زندگی کا ثبوت ان کی تخلیقات ہیں، ان کے الفاظ ہیں اور وہی الفاظ ان کے ہونے کی گواہی دے رہے ہیں۔ درس و تدریس سے وابستہ نہ ہونے کے باوجود بھی ان کے شاگردوں کی کمی نہیں وہ ادب ہو یا صحافت عابد سہیل کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ اپنی اسی خوبی کی وجہ سے میرے ادبی خانوادے کا یہ فرد صرف میرے ہی نہیں ہم سب کے ساتھ ہمیشہ رہے گا کیونکہ:

"بڑا ہے ادب کا رشتہ"

■

Dr. Reshma Parveen Head, Dept. of Urdu,
Khun Khun Ji Girls PG College, Chowk,
Lucknow -(UP)
Mob.:9219268280
Email: drreshmap7@gmail.com

احمد سہیل صدیقی

اب راہِ صحافت کا وہ راہی نہیں رہا

مولانا احمد مصطفےٰ صدیقی راہی رحمتہ اللہ علیہ کی شخصیت میں سیاست اور صحافت کا حسین امتزاج پایا جاتا تھا۔ انھوں نے مذہبی گھرانے میں آنکھیں کھولیں اور دیوبند کے علمی ماحول میں اپنی تعلیم مکمل کی۔ ملک کے مایۂ ناز جید علماء کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا اور تعلیم سے فراغت کے بعد اردو صحافت کو خدمت خلق کا وسیلہ بنایا۔

راہی صاحب نے 14 اگست 1930 کو مجاہد آزادی اور قوم پرست جید صحافی مولانا عبدالوحید صدیقی رحمتہ اللہ علیہ کے آنگن میں آنکھیں کھولیں اور 16 دسمبر 2015 کو اس کارگہ شیشہ گری سے اپنا رول بحسن و خوبی نبھا کر اپنے محسن حقیقی سے جاملے۔

انھوں نے تقریباً ساڑھے پچاسی سال کی عمر پائی جس میں تقریباً 65 سال تک ان کا نام مختلف اخبار و رسائل میں ایڈیٹر کی حیثیت سے شائع ہوتا رہا۔ 15 جولائی 1951 کو روزنامہ نئی دنیا شروع ہوا تھا اس سے پہلے 'نئی دنیا' ماہنامہ تھا جس کے ایڈیٹر پرنٹر، پبلشر بھی راہی صاحب ہی تھے۔ اس وقت ان کی عمر صرف 20 سال تھی اور نئی دنیا بلی ماران سے شائع ہوتا تھا۔ یہ وہی محلہ ہے جہاں مرزا غالب اور حکیم اجمل خاں جیسی نابغۂ روزگار ہستیاں رہتی تھیں اور جو مجاہدین آزادی کا مرکز تھا۔ مولانا حسرت موہانی اور مولانا عثمان فارقلیط جیسے عظیم صحافیوں کا مسکن تھا۔ راہی صاحب نے اپنے والد مولانا عبدالوحید صدیقی رحمتہ اللہ علیہ سے صحافت کے اسرار و رموز سیکھے۔ 50 سال قبل جب مولانا عبدالوحید صدیقی رحمتہ اللہ علیہ نے عالمی شہرت یافتہ اردو ڈائجسٹ 'ہما' شائع کرنا شروع کیا تو مولانا راہی مرحوم ان کے دست راست بن گئے۔ صحافت کے پیشے سے وابستگی کے علاوہ سیاست سے بھی ان کی دلچسپی بڑھتی رہی۔

روزنامہ نئی دنیا شدید سیاسی، قانونی اور اقتصادی دباؤ کے تحت 1963 میں بند کردیا گیا۔ اخبار بند ہونے کے بعد مولانا اور ان کے خاندان کو شدید ترین مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن انھوں نے ہندوستان کے دبے کچلے لوگوں کے حقوق کے لیے اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ اس زمانے میں نئی دنیا میں شمع کی طرح معمہ بھی چھپتا تھا اور ہر ماہ کسی نہ کسی آدمی کو 21 ہزار نقد انعام دیے جاتے تھے۔ روزنامہ نئی دنیا کے معمے کے صحیح حل کی چوری ایک سازش کے تحت کی گئی اور پانچ آدمی صحیح حل لے کر حاضر ہوئے۔ یہ بہت بڑا خسارہ تھا۔ نئی دنیا کا سب کچھ بک گیا اور اخبار بھی بند ہوگیا۔ یہ راہی صاحب کی زندگی کا وہ پہلو ہے جو وہ کسی سے ساری زندگی کہہ نہیں پائے۔ نئی دنیا کے بند ہونے کے بعد گھر میں فاقہ کشی شروع ہوگئی۔ راہی صاحب اپنے آٹھ بھائی بہنوں میں سب سے بڑے تھے اس لیے روزگار کے حصول کے لیے 1963 سے 1966 تک اپنے پھوپھی زاد بھائی، جن کی صاحبزادی سے ان کی شادی ہوئی تھی، کے یہاں اپنے بچوں کو لے کر مرزا پور چلے گئے۔ وہاں انھوں نے 120 ایکڑ زمین لے کر چکن فارمنگ شروع کی۔ یہاں چار سال تک مرغی خانے میں بڑی محنت کی اور جیسے ہی مولانا عبدالوحید صدیقی رحمتہ اللہ علیہ نے اردو ماہنامہ 'ہما' نکالنے کا ارادہ کیا تو مرزا پور سے ساری چیزیں چھوڑ کر دہلی آگئے۔ انھوں نے 1967 میں نئی دہلی سے ہما اردو ڈائجسٹ جاری کر کے اشاعتی صنعت میں انقلاب برپا کردیا۔ ہما کو پورے ملک میں بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے ہدیٰ اسلامی ڈائجسٹ، ہدف تاریخی ڈائجسٹ، اور پھر ہندی میں پہلا اسلامی رسالہ طٰہٰ بھی جاری کیا۔ ہدیٰ اور طٰہٰ کی ایڈیٹنگ وہ تادم مرگ کرتے رہے۔ نئی دنیا کے ساتھ ساتھ راہی صاحب نے اردو میں روزنامہ ہمت اور روزنامہ طاقت بھی نکالا تھا جو بازار میں خوب فروخت ہوتا تھا۔ یہ روزنامہ اس لیے نکالا جاتا تھا کہ اگر حکومت نئی دنیا پر پابندی لگائے تو یہ اخبار اس کی جگہ پر بازار میں پیش کردیا جائے۔ انھوں نے 1962 میں بھائی چارہ کے نام سے پندرہ روزہ اخبار بھی شائع کیا تھا۔ 1968 سے 1970 کے دوران ایک ماہنامہ ہزار داستان بھی شائع کیا۔ ماہنامہ ہدف اسلامی، اور ہندوستانی تاریخ پر مبنی رسالہ تھا۔ انھوں نے 1974 میں آل انڈیا مسلم پروگریسیو فرنٹ بنایا، جس کے وہ بانی صدر تھے۔ پھر آل انڈیا اردو جرنلسٹ کانگریس بنائی۔ ان دونوں تنظیموں نے کافی سرگرم رول ادا کیا، وہ 1974 سے تاعمر پریس کونسل آف انڈیا کے ممبر بھی رہے۔

وہ 1975 سے نیشنل رائٹرس ایسوسی ایشن کے بھی سرپرست تھے۔ 1980 سے 1982 تک انجمن سیر گل فروشاں کے ممبر رہے اور شیواجی کالج کی گورننگ باڈی کے ممبر بھی رہے۔ وہ 1981 سے تاحیات نیشنل سیکولر یونین

کمیٹی آف اسلام کی صد سالہ تقریبات کے ممبر بھی رہے۔ وہ دہلی حج کمیٹی اور دہلی وقف بورڈ کے ممبر بھی رہے۔ فتح پوری مسلم پبلک لائبریری کے چیئرمین بھی تھے۔ انھوں نے 1947 کے فسادات کے زمانے میں بھائی چارہ لیگ بنائی تھی جس کا کام سماجی ہم آہنگی اور فرقہ وارانہ فساد کو روکنا تھا۔ راہی صاحب انڈیا اسلامک کلچرل سنٹر کے بانی ممبروں میں سے ایک رہے ہیں۔ انھوں نے انڈیا اسلامک کلچرل سنٹر کے قیام میں سرگرم حصہ لیا تھا اور چودھری محمد عارف کے ساتھ اندرا گاندھی اور بیٹے گاندھی سے مل کر اس کے قیام کی راہ ہموار کی تھی۔

راہی صاحب کی صحافت

راہی صاحب اردو کے واحد صحافی ہیں جنھیں اندرا گاندھی نے انٹرویو دیا یہ انٹرویو ایک تاریخ ساز اہمیت کا حامل ہوا جو جنوری 1980 کے ہما اردو ڈائجسٹ کے سالنامے میں شائع ہوا۔ راہی صاحب نے ہندی میں اسلامی صحافت کی بنیاد رکھی اور اردو کی اسلامی صحافت میں بھی ایک ریکارڈ قائم کیا۔ ہدیٰ 48 سال سے مسلسل پابندیٔ وقت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ اس کا ایک شمارہ بھی تاخیر سے نہیں چھپا ہے۔ اسی طرح ہندی ماہنامہ ہما بھی 1985 سے تواتر کے ساتھ چھپ رہا ہے اور گزشتہ 31 سال میں اس کا ایک شمارہ بھی ناغہ نہیں ہوا ہے۔ مولانا مودودی کا رسالہ ترجمان القرآن 1930 میں شروع ہوا تھا جس کی اشاعت میں 1947 میں رکاوٹ آگئی تھی پھر جب دوبارہ شروع ہوا تو 1964 میں رکاوٹ آگئی لیکن مولانا راہی کے رسالوں میں کوئی رکاوٹ نہیں آئی۔ انھوں نے ایک حکمت عملی کے تحت یہ رسالے شروع کیے تاکہ جو لوگ دینیات، اسلامی تاریخ اور اسلامی تہذیب ومعاشرت کی مہنگی کتابیں نہیں خرید سکتے انھیں کم پیسوں میں پوری اسلامی اور مذہبی امور کی معلومات فراہم ہو جائے۔ جو کام پوری ایک اسلامی یونیورسٹی نہیں کر سکتی وہ کام ماہنامہ ہدیٰ اور ہما نے کر دکھایا۔ ہدیٰ اور ہما کے سیکڑوں وقیع نمبر نکالے گئے اور ایسے ایسے موضوعات پر نمبر شائع کیے گئے جو بالکل اچھوتے تھے۔ ہدیٰ کو تو خیر صرف مسلمان پڑھتے ہیں جبکہ ہما غیر مسلم حضرات بھی نہ صرف پڑھتے ہیں بلکہ اس سے استفادہ بھی کرتے ہیں۔

راہی صاحب مولانا ابوالکلام آزاد کے مداح اور ان کے نظریے کے مبلغ تھے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ ہندوستان کی جدو جہد آزادی کی تاریخ پڑھنی ہے تو انڈیا ونس فریڈم پڑھو۔ مولانا آزاد نے 1910 سے 1925 کے درمیان جس قسم کی صحافت کی تھی اور جس نظریے کی ترویج الہلال اور البلاغ کے ذریعے کی تھی مولانا راہی نے 1950 سے 2015 تک اسی نظریے کو فروغ دیا اور اس کی تبلیغ کی۔ جب راہی صاحب ہما کے ایڈیٹر تھے تو انھوں نے ہما کا غالب نمبر، اردو نمبر اور ملیگزہ نمبر شائع کیا تھا جس کا ثانی آج تک کوئی دوسرا نہیں نکال سکا ہے۔ ان نمبروں کو لوگ آج بھی چالیس پچاس سال بعد سنبھال کر رکھتے اور اس سے استفادہ کرتے ہیں۔ ہما کا جوش نمبر تاریخی حوالے کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ برصغیر میں ایسے نمبر کسی نے نہیں نکالے جتنے راہی صاحب نے شائع کیے۔ ان کے رسالوں کے نمبر 65 سال پہلے بھی ہاتھوں ہاتھ بک جاتے تھے اور آج کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے زمانے میں بھی ہاتھوں ہاتھ نکل جاتے ہیں۔ ان کے قارئین کی جتنی تعداد 50 سال پہلے تھی الحمد للہ اس تعداد میں کمی نہیں آئی ہے بلکہ دن بدن بڑھ رہی ہے۔

ہفت روزہ ہمارا قدم راہی صاحب کی سرپرستی اور نگرانی میں شائع ہوتا تھا۔ اس نے شہرت اور مقبولیت کے معاملے میں بلٹز ممبئی، نشیمن بنگلور کو بہت پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ ہمارا قدم کے علاوہ ہندی میں خواتین کا ماہنامہ ہنی اور اردو ماہنامہ 'پاک دامن' گھریلو خواتین کے لیے

اسلامی ڈائجسٹ کے طور پر بھی شروع کیا تھا جو ایک دو سال میں بند ہو گئے۔

یہ بات بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ راہی صاحب نے عملی سیاست میں بھی حصہ لیا تھا۔ اپنی جوانی میں انھوں نے پرانی دہلی سے مشہور زمانہ خاتون لیڈر شمعدرا جوشی کے خلاف الیکشن لڑا تھا لیکن کامیاب نہیں ہو سکے۔

راہی صاحب نے 1982 میں حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی اس کے ساتھ ہی انھوں نے داڑھی رکھ لی۔ اس سے پہلے وہ کلین شیو ہوا کرتے تھے۔ لباس پائجامہ بھی ٹخنوں سے اوپر اور کرتا کھادی کا سفید کرتا، پاجامہ، زیب تن کرتے اور سر پر کشتی دوپلی ٹوپی اوڑھتے تھے۔ ان کی آواز بہت دلنشیں اور لہجہ بہت دھیما ہوتا تھا۔ چہرے کی مسکراہٹ اور آنکھوں میں ہمدردی و غم گساری کی نرمی، طویل قامتی اور سینے میں محبت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر مخاطب کو چند منٹ میں اپنا گرویدہ بنا لیتا تھا۔ ان کے تبحر علمی کا ایک زمانہ معترف رہا ہے۔ ان کا قلم جب صفحہ قرطاس پر چلتا تو ہیرے موتی بکھیرتا تھا۔ آخری عمر میں طویل قامتی کی وجہ سے سیدھ ثمر دار درخت کی طرح جھک گیا تھا لیکن عزائم اور ارادے اسی طرح چٹان تھے۔ ان کی آنکھیں اسلامیان ہند کی سربلندی کے خواب دیکھتے دیکھتے بجھ گئی تھیں لیکن ان میں شکست خوردگی اور تھکن کا دور دور تک شائبہ نظر نہیں آتا تھا۔ ان کے حوصلے آخری دنوں میں بھی جوان تھے۔ 6 ماہ پہلے بیمار ہوئے۔ ان کا بایاں پھیپھڑا کینسر سے متاثر تھا۔ ہر ممکن علاج معالجہ ہوا لیکن افاقہ نہیں ہو سکا۔ 4 دسمبر کو کوما میں چلے گئے اور 6 دسمبر کو خاموشی سے داعی اجل کو لبیک کہا۔ وہ بے انتہا صابر و شاکر آدمی تھے۔ اپنے مخالفوں کے خلاف بھی لب کشائی نہیں کرتے تھے۔ انھیں اپنی قوم اور ملت کی بڑی فکر تھی۔ وہ بازار کی سیاست کے بجائے خانقاہ کی سیاست کے قائل تھے۔ اپنے حصے کا سارا کام انھوں نے بحسن و خوبی انجام دیا اور قبرستان شیخ پیران نزد بستی حضرت نظام الدین میں آسودۂ رحمت ہیں۔ پسماندگان میں اہلیہ محترمہ ثروت صدیقی کے علاوہ 5 بیٹے اور ایک صاحبزادی اور پورا خاندان ہے۔

■

Ahmed Sohail Siddiqui,
J-42,Ground Floor, A.F. Enclave Thokar-4,
Jamia Nagar, Okhla New Delhi-110025
Mob:8527022786
emailsiddiquiahmadsohail@gmail.com

قمر جہاں

اردو صحافت میں خواتین کا حصہ

خواتین ہمارے سماج کا ناگزیر حصہ ہیں، جنھیں نصف بہتر کا درجہ حاصل ہے۔ آج وہ مردوں کے دوش بدوش زندگی کے تقریباً ہر شعبے میں گامزن ہیں۔ خواتین کی کارکردگی اور محنتِ شاقہ کے نقوش کہاں مرتسم نہیں ہیں؟ ایک زمانہ تھا جب صحافت، انجینئرنگ اور فوج میں خواتین نہیں ہوتی تھیں، مگر عہدِ حاضر میں ہر شعبے میں وہ موجود ہیں اور اپنے فرائض بحسن و خوبی انجام دے رہی ہیں۔

'صحافت' کو جمہوریت کا چوتھا ستون کہا جاتا ہے اور سچ پوچھیے تو عہدِ حاضر میں اس چوتھے ستون کی اہمیت اس قدر بڑھ گئی ہے کہ میڈیا ہی 'چوتھی ریاست' بن گئی ہے۔ دنیا جو واقعی اب ایک عالمی گاؤں میں مبدل ہو چکی ہے، جہاں ان دنوں عوامی ذرائع ابلاغ یعنی ماس کمیونیکیشن کا ایک جال سا بچھ گیا ہے، انٹرنیٹ، کمپیوٹر، الیکٹرونک وسائل (E-mail)، فیکس، موبائل، فون، ریڈیو، ٹی وی، ویڈیو کانفرنسنگ، سٹیلائٹ چینلوں نے پورے معاشرے کو اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا ہے اور بچے بچے کھیل کھیل میں وہاں تک پہنچ گیا ہے۔ اس بدلی ہوئی صورتِ حال میں ہماری خواتین بھی بتدریج کافی ترقی یافتہ ہو گئی ہیں۔ نئی تعلیم یافتہ لڑکیاں ہوں یا لڑکے، ان میں ذہنی و علمی بیداری کے لحاظ سے کوئی حدِ امتیاز نہیں ہے۔

'صحافت' بھی خواتین کی دلچسپی اور کارکردگی کا محبوب و پسندیدہ موضوع ہے۔ غور کیا جائے تو عہدِ رواں میں صحافت کے بھی کئی شعبے ہیں، عام طور سے انھیں دو شاخوں میں تقسیم کیا گیا ہے یعنی پرنٹ میڈیا اور برقی میڈیا مگر حقیقت یہ ہے کہ الیکٹرونک میڈیا اور پرنٹ میڈیا ترسیل و ابلاغ کی دو علیحدہ شاخیں ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے قریب ہیں اور یہی بات یہ ہے کہ پرنٹ میڈیا کو بھی الیکٹرونک میڈیا کا ہی تعاون حاصل ہے۔ زمانۂ قدیم کی طرح اب چھاپہ خانہ یا کاتب وغیرہ کی ضرورت نہیں رہی۔ اب کمپیوٹر کمپوزنگ کا دور ہے جو خاصی ترقی یافتہ شکل ہے۔ کتب و رسائل کی اشاعت کا مرحلہ ہو یا اخبارات کی طباعت کا، یہ تمام کام عہدِ حاضر میں جناتی کرشمے کی طرح تیز تر ہو گئے ہیں۔ اس نئے ماحول میں ہماری خواتین جرنلسٹ بھی کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ خواتین صحافی خواہ پریس میڈیا میں ہوں یا نیوز چینل (برقی میڈیا میں) تعداد ان کی بڑھتی ہی جا رہی ہے اور خوشی کی بات یہ ہے کہ معیار و مذاق میں بھی وہ اپنے دیگر ساتھیوں کے ہم پلہ ہیں۔

آئندہ صفحات میں چند نام درج کیے جا رہے ہیں جن کی خدمات کا اعتراف کیا جانا چاہیے۔ موضوع چونکہ اردو صحافت ہے، لہٰذا ہماری نظرِ انتخاب ایسی خواتین پر ہے جو اردو صحافت میں اپنی پہچان بنا چکی ہیں۔ اس سلسلے میں ایک اہم نام جناب عبدالستار دلوی کی صاحب زادی محترمہ شیریں دلوی کا ہے۔

وہ بمبئی میں اقامت پذیر ہیں اور 'اودھ نامہ' بمبئی کی ایڈیٹر رہی ہیں۔ محترمہ شیریں دلوی Associate Journalist کے علاوہ ٹیلی ویژن سے بھی وابستہ رہی ہیں۔ Form against opperation of Women کی صدر کے عہدے پر فائز تھیں۔

دوسری صحافی عالیہ نازکی ہیں، جن کا آبائی وطن کشمیر ہے۔ تعلیم دہلی میں JNU سے حاصل کی تھی۔ بی بی سی (BBC) کے اردو پروگرام 'شہر '81' کو پیش کرتی تھیں۔ یونیسکو سے انھیں ایک خطاب Shapping the future of Journalism کے نام سے ملا تھا۔ وہ اپنے وقت کی ایک مقبول و معروف صحافی ہیں۔

مدھیہ پردیش میں خالدہ بلگرامی کا نام اولیت کے لحاظ سے خاص امتیاز رکھتا ہے۔ شاذیہ دہلوی India Today میں اپنی نمایاں کارکردگی کے لیے پہچان رکھتی ہیں۔ اسی طرح محترمہ وسیم راشد اردو اخبار 'چوتھی دنیا' دہلی کی معاون مدیرہ ہیں اور اپنی صحافتی خدمات کے لیے پہچانی جاتی ہیں۔ ریحانہ اختر کا تعلق مشہور 'عالمی سہارا' چینل سے ہے۔ نائب مدیر نازیہ نوشاد حالیہ دنوں میں

پٹنہ سے شائع ہونے والے مقبول اخبار 'راشٹریہ سہارا' میں اپنی نمایاں کارکردگی سے اپنی شناخت قائم کرچکی ہیں۔ محترمہ اس اخبار کی نائب مدیر ہیں۔ زرّیں فاطمہ مشہور اردو اخبار 'انقلاب' پٹنہ سے وابستہ ہیں، موصوفہ اس اخبار میں نائب مدیر کے عہدے پر فائز ہیں اور اردو صحافت میں ان کی دلچسپی خصوصی ہے۔ عہد حاضر میں اردو صحافت کا نصب العین ملک کے اندر قومی یکجہتی کو فروغ دینا اور سیکولرزم کی خصوصیات کو اجاگر کرنا ہے۔ ایک وقت تھا کہ بنگلہ زبان کے ساتھ سب سے پہلے اردو اخبارات نے ہی قوم کو آزادی کے خواب دکھائے تھے اور آزاد ہندوستان کے خواب کو اپنی مسلسل کوششوں سے شرمندۂ تعبیر کیا تھا۔ جنگِ آزادی کی تاریخ میں اردو اخبارات کے نام سنہری حرفوں میں لکھے گئے ہیں۔ اس کے مشہور اخبارات میں قومی آواز، نوائے وقت، ہندوستان، ریاست، رہبر ہند وغیرہ بے شمار اردو اخبارات کے نام ہمارے ماضی کی شاندار وراثت ہیں۔

اردو اخبارات کے حوالے سے چند نام اور ذہن میں آرہے ہیں۔ ان تمام خواتین صحافی کی خدمات یقیناً قابلِ تعریف ہیں۔ اخبار 'نوائے وقت' کی مدیرہ عارفہ صبیحہ 'نوید وقت' کی ایمان محمد جو پہلی خاتون صحافی ہیں جنھوں نے غزہ و اسرائیل جنگ کی تصویر کشی کرکے اپنا نام War Photo Journalist میں درج کرلیا ہے۔ محترمہ ثوبی خاں کرائم جرنلسٹ کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ 1948 میں فاطمہ بیگم نے لاہور سے پہلا اردو اخبار 'خاتون' کے نام سے نکالا تھا۔ ان کے علاوہ زاہدہ حنا، پروین شاکر، عاصمہ چودھری، زبیدہ مصطفیٰ، زیب النساء، فرحت صدیقی غرض بہت نام ہیں جو اخبارات اردو میں خواتین صحافی کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ ان میں ایک اہم نام محترمہ فوزیہ شاہین کا ہے جو اخبار 'جنگ' سے وابستہ ہیں۔ BBC on line urdu service کی اپنی کارکردگی کے لیے محترمہ فوزیہ شاہین کو ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔ یونیسکو سے Women Media of Pakistan کا خطاب حاصل کرچکی ہیں۔ مشہور افسانہ نگار زاہدہ حنا، اور شاعرہ پروین شاکر بھی 'جنگ' میں کالم نویس کی حیثیت سے مشہور رہی ہیں۔ یہ دونوں ممتاز و مقبول نام اپنے آبائی وطن کے لحاظ سے ہندوستانی ہیں۔ عاصمہ چودھری اخبار 'جوان' میں ہیں اور جنگ گروپ میں نائب مدیر تھیں۔ ثمیرہ عزیز پہلی سعودی خاتون ہیں جو میڈیا میں کام کررہی ہیں۔ 'آواز' میں مینیجنگ ایڈیٹر ہیں۔ ساتھ ہی اردو نیوز (سعودی سے) کی سپروائزنگ ایڈیٹر اور گوشہ خواتین کی انچارج ہیں۔

صوبۂ بہار میں تسنیم کوثر ایک طویل مدت تک ٹی وی پر نیوز ریڈر رہی ہیں۔ محترمہ اچھی افسانہ نگار ہیں۔ 'مہنسائی' ان کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ خواتین میں بیشتر نام آج الیکٹرونک میڈیا میں چمک رہے ہیں۔ اخبارات

عہد حاضر میں اردو صحافت کا نصب العین ملک کے اندر قومی یکجہتی کو فروغ دینا اور سیکولرزم کی خصوصیات کو اجاگر کرنا ہے۔ ایک وقت تھا کہ بنگلہ زبان کے ساتھ سب سے پہلے اردو اخبارات نے ہی قوم کو آزادی کے خواب دکھائے تھے اور آزاد ہندوستان کے خواب کو اپنی مسلسل کوششوں سے شرمندۂ تعبیر کیا تھا۔ جنگ آزادی کی تاریخ میں اردو اخبارات کے نام سنہری حرفوں میں لکھے گئے ہیں۔

سے وابستہ خواتین صحافی ہیں تو ضرور مگر مردوں کے مقابلے میں ان کی تعداد بہت کم ہے۔ اپنی قلمی صلاحیت کے اعتبار سے بھی یہ خواتین ایم جے اکبر اور احمد سعید خاں وغیرہ کے مقابلے میں نہیں آتی ہیں۔ دراصل اردو سے آشنا خواتین نے صحافت کو بہت بعد میں لائقِ توجہ سمجھا ہے۔ اس کے لیے جس آزاد ماحول اور کھلے ذہن و دماغ کی ضرورت ہے اس سے ہماری خواتین اب قریب ہورہی ہیں۔ اب تو باضابطہ صحافت کی تعلیم مختلف یونیورسٹیوں میں ہورہی ہے۔ مردوں کے ساتھ خواتین بھی صحافت میں سند حاصل کررہی ہیں۔ ویسے اس کورس کے لیے جن سہولیات کی ضرورت ہے وہ فی الحال ہر یونیورسٹی میں دستیاب نہیں ہیں۔ خاص کر اردو مضمون میں بڑی تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ نہ تو اس فن کے ماہر اساتذہ ہیں نہ دیگر سہولیات میسر ہیں— برقی میڈیا میں خواتین صحافی کی تعداد دنوں دن بڑھتی جارہی ہے لیکن اردو زبان سے دوری اردو صحافت کے عمومی معیار کو مجروح کررہی ہے۔ مثل مشہور ہے کہ "بات کہنے کو بھی سلیقہ چاہیے" ہمارے خیال میں اردو ادب سے ناواقفیت نے حسنِ گفتار میں کمی پیدا کی ہے۔ جب کہ صحافت کے پیشے میں زبان دانی ایک ضروری شرط ہے، خاص کر اردو شعر و ادب سے واقفیت زورِ خطابت کے لیے ضروری ہے۔

صحافت کی ایک اہم شاخ جرائد و رسائل کی اشاعت بھی ہے۔ خواتین کی ایک بڑی تعداد زمانہ دراز سے مدیرہ یا معاون مدیرہ کی حیثیت سے مختلف و متنوع اردو رسائل و جرائد میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ حقیقی طور سے ان میں سے بیشتر کے نام صرف نام تک ہی ہیں، کام کے معاملے میں ان کا صحافتی شعور ایک دم ناپختہ ہے۔

ادبی صحافت میں ہمارے فیض لگاہ 1910 میں مس ذہرا انڈرا کا ذکر کیا جاتا ہے جو اخبار 'پھول' کی ایڈیٹر تھیں اور حقوقِ نسواں ہے

زوردار مضامین لکھا کرتی تھیں۔ ان کے کئی ناول بھی یادگار ہیں۔ دوسرا اہم نام محمدی بیگم کا ہے۔ موصوف خود اپنے عہد کی اچھی ادیبہ اور ناول نگار تھیں۔ اردو کے ممتاز ڈرامہ نگار امتیاز علی تاج کی والدہ اور مولوی سید ممتاز علی کی اہلیہ تھیں۔ ان کی ادارت میں خواتین کا مقبول عام جریدہ 'تہذیب نسواں' پنجاب (لاہور) سے نکلتا تھا۔ اس میں بیشتر خواتین قلمکاروں کی تحریریں ہوتی تھیں۔

آزادی سے قبل اگست 1943 میں بنگلور سے 'نیا دور' کا اجرا ہوا، جس کی ادارت ممتاز شیریں اپنے خاوند صمد شاہین کے ساتھ کرتی تھیں۔ ممتاز شیریں اردو ادب میں کئی حیثیتوں سے ممتاز ہیں۔ فکشن نگار ہونے کے ساتھ فکشن کی بہترین ناقد، اردو انگریزی دونوں زبانوں کے ادب پر یکساں دسترس، منظوم شاعری میں ماہر اور ایک دانشور خاتون صحافی کی حیثیت سے وہ ہمیشہ یاد کی جائیں گی۔

مقبول عام رسالہ ماہنامہ 'آجکل' دہلی میں محترمہ نرگس سلطانہ معاون مدیرہ کی حیثیت سے ایک عرصے سے کام کررہی ہیں اور اپنی اعلیٰ کارکردگی سے متاثر کررہی ہیں۔

خواتین کا رسالہ 'بزم ادب' علی گڑھ جس کی مدیرہ مشہور شاعر خلیل الرحمٰن اعظمی کی اہلیہ راشدہ خلیل ہیں۔ یہ رسالہ سال میں ایک بار ماہ جنوری میں منظرِ عام پر آتا ہے۔ اب تک اس کے کل 17 یا 18 شمارے آچکے ہیں۔ ادبی لحاظ سے بزمِ ادب خواتین کے ادب میں انفرادیت قائم کرچکا ہے۔ اس میں صرف خواتین کی ہی نگارشات شائع ہوتی ہیں۔

جنوبی ہند کا کثیرالاشاعت و مقبول عام جریدہ 'روشن شعاعیں' جو ماہنامہ کی صورت پابندی کے ساتھ بنگلور سے شائع ہورہا ہے، اس میں پرنٹر پبلشر اور ایڈیٹر کی حیثیت سے محترمہ فریدہ رحمت اللہ ہیں، تقریباً 26 سال سے شائع ہونے والا دلچسپ معلوماتی مجلہ ہے جس میں مذہبی، ادبی سیاسی علمی و سائنسی غرض تمام موضوعات کا احاطہ کیا جارہا ہے۔ مجلس مشاورت میں بھی تمام نام خواتین کے ہیں۔ ہمارے پیشِ نظر خواتین صحافی میں محترمہ فریدہ رحمت اللہ کافی مشہور و مقبول ہیں۔

شہر الٰہ آباد سے شائع ہونے والا سہ ماہی 'پہچان' خالص ادبی و تنقیدی مزاج کا حامل ہے اور ادب میں اس کی واقعی ایک پہچان ہے۔ اس کی ادارت محترمہ زیب النسا اور اشفاق نعیم کرتی ہیں۔ حیدرآباد سے نکلنے والا مشہور و خالص ادبی رسالہ 'شعر و حکمت' کتاب وہ دور سوم) مرتبین میں شہریار اور مغنی تبسم کے ساتھ اختر جہاں بہ حیثیت ایڈیٹر اور شفیق فاطمہ شعریٰ معاون کی حیثیت سے جلوہ افروز تھیں۔ ایک زمانے میں 'سوغات' بنگلور میں محمود ایاز کے ساتھ ان کی اہلیہ مریم ایاز کے علاوہ شائستہ یوسف بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔— کتابی سلسلہ سہ ماہی 'آمد' پٹنہ میں مدیر اعزازی خورشید اکبر ہیں اور مدیرہ ان کی بیگم عقیلہ فردوسی ہیں۔ عہد حاضر میں اردو کا یہ ایک معیاری رسالہ ہے، جس میں ادب کے زندہ لہو کی گردش آپ محسوس کرسکتے ہیں۔

'کوہسار جرنل' (بھاگلپور) میں ڈاکٹر مناظر عاشق کے ساتھ مینا جوگن 'مباحثہ' (پٹنہ) میں پروفیسر وہاب اشرفی کے پہلو بہ پہلو محترمہ نسیما اشرفی کو بہ حیثیت خاتون صحافی آپ دیکھ سکتے ہیں۔ حالیہ بیسویں صدی میں مدیرہ شمع

افروز زیدی اور 'پاکیزہ آنچل' میں رخسانہ صدیقی بہ حسن و خوبی مدیرہ کے فرائض انجام دے رہی ہیں، اور عوامی ادبی حلقے میں یہ دونوں رسائل خاصے مشہور و مقبول ہیں۔ 'بانو' (دہلی) اب بند ہے مگر خواتین میں کئی خانے میں اپنی پہچان رکھتا تھا، اسی طرح عصمت، حریم، خاتون مشرق وغیرہ میں بھی خواتین کی صحافت کے نمونے موجود ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی کا جدیدیت کا ترجمان رسالہ 'شب خون' کی مدیرہ ایک طویل عرصے تک فاروقی کی اہلیہ جمیلہ شاہین تھیں۔ کرناٹک اردو اکادمی کی سکریٹری اور اکادمی کے رسالہ کی مدیرہ محترمہ فوزیہ چودھری ہیں۔ 1966 میں بمبئی سے 'قمر' رسالہ نکلا تھا جس کی مدیرہ شاعرہ مینا ناز تھیں اور معاون شاد گنگاوی تھے۔

اب ذرا عظیم آباد کی طرف آیئے اور ماضی میں جائیے۔ دسمبر 1967 میں پٹنہ شہر سے 'زیوز' خواتین کا مقبول ترین جریدہ محترمہ سلمیٰ جاوید کی ادارت میں شائع ہوتا تھا اور 73-1972 تک باقاعدگی سے محترمہ 'زیوز' کو آراستہ کرتی رہیں۔ سلمیٰ اردو کی اچھی اسکالر اور افسانہ نگار تھیں۔ ماہ منیر خاں کی صاحب زادی تھیں ان کے بڑے بھائی رضوان احمد خاں مدیر اعزازی کی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ خود ایک مشہور و بے باک تھے۔ 'عظیم آباد ایکسپریس' موصوف کی شعلہ بیانی کے لیے آج بھی مشہور ہے۔

شہر گیا سے نکلنے والا رسالہ ماہنامہ 'آہنگ' جس کے چیف ایڈیٹر کلام حیدری تھے۔ مدیر کے کالم میں خوشاب حق کا نام دیکھنے کو ملتا ہے۔ روزنامہ 'سنگم' پٹنہ جو آج بھی باقاعدگی سے شائع ہورہا ہے۔ قائم شدہ ایڈیشن 1974 میں ایڈیٹر کی حیثیت سے جہاں آرا صاحبہ تھیں۔ پٹنہ سے نکلنے والا روزنامہ 'ان دنوں' کی مدیرہ نکہت سلطانہ ہیں۔ 91-1990 میں یہ روزنامہ صرف ایک روپے کی قیمت میں اپنے قارئین کے ذوق کی تسکین کرتا تھا۔ ہفتہ وار 'دلہن کے رنگ' پٹنہ میں قاضی عبدالوارث کے ساتھ خورشید جہاں ہیں۔ پندرہ روزہ اخبار 'گدھ' پٹنہ 1978 میں معصوم اشرفی کے ساتھ محترمہ شمشاد جہاں کو دیکھ سکتے ہیں۔ رسالہ 'مفاہیم' دور اول گیا 1979 میں اختری جبیں صاحبہ، تاج انور اور شاہین نکہر کی معاون ہیں۔ 'زیب النسا' نام سے ایک رسالہ 1937 میں ناگپور سے شائع ہوا تھا۔ مدیرہ کا نام بھی زیب النسا ہی ہے۔

مجھے اس بات کا احساس ہے کہ ناموں کی اس کھتونی میں خواتین صحافی کی خدمات کا عکس نمایاں نہیں ہوسکا ہے اس لیے کہ ہر نام کے ساتھ کوئی نہ کوئی اہم نام بھی سامنے آگیا ہے۔ البتہ اردو صحافت کی عام صورت حال کے پیشِ نظر یہ تو کہا ہی جاسکتا ہے کہ اردو صحافت کا معیار ابھی بھی بہت تسلی بخش نہیں ہے۔ یہاں ادبی و شعری حصہ ضرور بہت زرخیز ہے مگر سائنسی اور آئے دن ہونے والی نئی تحقیقات سے اردو صحافت کو رنگین اور کارآمد بنانے کی ضرورت ہے۔ ہماری خواتین صحافی اس طرف آسانی سے توجہ دے سکتی ہیں۔

■

Prof. (Mrs.)., Quamar Jahan,3- Bhikhanpur Hatia, Bhagalpur - 812001 (Bihar)

ادبی رسائل سے شہر ممبئی کا ٹوٹتا رشتہ

ریاست مہاراشٹر کا دارالخلافہ ممبئی جسے ہندوستان کے اقتصادی وصحافتی دارالحکومت ہونے کا درجہ اور عروس البلاد کا لقب حاصل ہے، اپنی ادب نوازی نیز شعرا و ادبا پروری کے لیے گزشتہ کئی صدی سے مشہور ہے۔ اردو ادب کے ابتدائی ادوار سے ہی شہر ممبئی کا ادب اور ادیب سے گہرا تعلق رہا ہے اور ہندوستان کے دیگر کئی بڑے شہر مثلاً دہلی، لکھنؤ، بھوپال، آگرہ، حیدرآباد، بنگلور، پٹنہ اور کلکتہ کی طرح اس شہر نے بھی اردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج میں نمایاں کردار ادا کیے ہیں۔ اس ضمن میں اردو اخبارات کی ایک طویل فہرست ماجد قاضی کی تصنیف 'ممبئی کے اردو اخبارات' (1834 تا 2005) میں درج ہے جسے ممبئی کی اردو پرستی کا ثبوت خیال کیا جاسکتا ہے۔ اخبارات کے علاوہ ادبی رسائل و جرائد کا بھی اس شہر سے قدیم رشتہ رہا ہے۔

ممبئی کے کچھ ایسے قلمکاروں کے نام بھی ورنچہ ذہن پر دستک دے رہے ہیں جن کا تعلق صرف ادب اور صحافت سے رہا ہے۔ مثلاً سجاد ظہیر، ظ انصاری، عبداللہ کمال، محمود ایوبی، کالی داس گپتا رضا، سلمیٰ صدیقی، یوسف ناظم، قیصر الجعفری، انور خان، ساجد رشید، واجدہ تبسم، مرتضیٰ نشاط، ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی، سرفراز آرزو، عبدالاحد ساز، شمیم طارق، سلام بن رزاق، انور قمر، مقدر حمید، شکیل رشید، ندیم صدیقی، حامد اقبال صدیقی، اعجاز صدیقی، سعید حمید، شاہد لطیف، م ناگ، فضیل جعفری، اسد رضا اور افتخار امام صدیقی وغیرہ۔ ان جیسے مزید کئی قلمکار ہیں جو ممبئی کے اردو اخبارات نیز ادبی رسائل و جرائد کے اشاعتی سفر کا اٹوٹ حصہ رہے ہیں۔ مذکورہ بالا ناموں میں سے متعدد قلمکار ہنوز فعال ہیں اور اپنا تخلیقی سفر پوری شدت و محویت کے ساتھ طے کر رہے ہیں۔ حالانکہ سلام بن رزاق نے دو ایک فلمیں اور ٹی۔ وی سیریل بھی تحریر کیے ہیں تاہم ان کی شناخت ادب کے حوالے سے قائم ہے۔

ممبئی سے شائع ہونے والے ادبی رسائل کی فہرست میں ماہنامہ 'شاعر' سب سے اوپر نظر آتا ہے لہٰذا ہم اسے میر کارواں کہہ سکتے ہیں۔ گو کہ شاعر کا اجرا سنہ 1930 میں آگرہ میں ہوا تھا اس کی اشاعت کا دوسرا دور 1950 میں ممبئی میں شروع ہوا جو ہنوز نہایت طمطراق کے ساتھ جاری ہے۔ اپنے اس طویل اشاعتی سفر میں شاعر دنیائے ادب میں آئے بہت سے نشیب و فراز اور مد و جزر کا گواہ رہا ہے۔ ترقی پسندی کے دور سے لے کر جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے متفرق منظرناموں کو اس رسالے نے اپنے صفحات پر محفوظ کیا ہے۔ اپنے وقت کے بھی بڑے اور معتبر خامہ کار اس کے اوراق پر جگہ پاتے رہے ہیں۔ شاعر کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی رہی ہے کہ اس نے نووارد قلمکاروں کو بھی ہمیشہ اپنے دامن میں جگہ دے کر ان کی راہنمائی کی ہے اور اگلے دنوں کے لیے راستے ہموار کیے ہیں۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ بہت سے شعرا و ادبا کے تخلیقی سفر کو شاعر کی بدولت ہی سمت و رفتار ملی ہے۔

سنہ 660 تا 90 کے درمیانی زمانے میں شاعر کے علاوہ ممبئی سے شائع ہونے والے دیگر ادبی رسالوں میں گفتگو، اظہار، نوائے ادب، سنگن، قلم، نیا ورق اور مہاراشٹر اردو اکادمی کا رسالہ امکان قابل ذکر ہیں۔ 'گفتگو' ایک سہ ماہی مجلہ تھا جو ترقی پسند مصنفین کے افکار و نظریات کا ترجمان تھا۔ سنہ 1967 میں عالمی شہرت یافتہ شاعر علی سردار جعفری کی ادارت میں جاری ہونے والے اس رسالے کا سفر 13 برسوں پر محیط تھا۔ اس کا آخری شمارہ 1980 میں شائع ہوا تھا۔ ماہنامہ 'سنگن' کا اجرا 1965 میں الیاس نگر میں ہوا تھا۔ منفرد فکر و نظر کے صحافی محسن کنول کی ادارت میں اس رسالے کا اشاعتی سفر نہایت آب و تاب کے ساتھ 19 سالوں تک جاری رہا۔ اس کا اختتامی شمارہ ایک ضخیم نماہب عالم نمبر کی صورت میں 1984 میں اشاعت پذیر ہوا تھا۔ معروف قلمکار الیاس شوقی کی ادارت میں سہ ماہی 'قلم' قریب آٹھ برسوں تک ممبئی کے ادبی افق پر جلوہ افروز رہا۔ پہلے یہ رسالہ ماہنامہ تھا۔ چار پانچ شماروں کے بعد اسے سہ ماہی کر دیا گیا تھا۔ 'نیا ورق' کے مدیر ساجد رشید تھے جن کے انتقال کے بعد اب یہ رسالہ ان کے صاحب زادے شاداب رشید کی ادارت میں اپنا سفر طے کر رہا ہے۔ 'نوائے ادب' انجمن اسلام (ممبئی) کا تاریخی رسالہ ہے جسے محترم نجیب اشرف نے جاری کیا تھا۔ بعدازاں اس کے کچھ اہم شمارے معروف قلمکار شمیم طارق کی ادارت میں منظر عام پر آئے اور اب یہ رسالہ پروفیسر عبدالستار دلوی کی زیر ادارت محو سفر ہے۔ خوش فکر شاعر آنجہانی صاحب ہوت 'فن و شخصیت' کے عنوان سے شخصیات نمبر نکالتے تھے۔ اس کے چھ یا سات شمارے شائع ہوئے جن میں فیض احمد فیض، ساحر، جوش، مجاز، شکیل بدایونی اور جگجیت سنگھ نمبر شامل ہیں۔ رسالہ 'اظہار' معروف شاعر و نقاد باقر مہدی کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔

ان کے علاوہ کچھ نیم ادبی نیز فلمی و ادبی رسائل کے سراغ بھی ملتے ہیں جن سے ممبئی کا ادبی منظرنامہ روشن تھا۔ ورجنوں کامیاب فلموں کے مصنف آغا جانی کشمیری ہفت روزہ رسالہ 'مصور' نکالتے تھے۔ شوکت علی ملک کی ادارت میں 'زاویہ' شائع ہوتا تھا۔ ڈاکٹر نائک کا رسالہ ماہنامہ 'نقشِ کوکن' عوام و خواص دونوں میں یکساں طور پر مقبول تھا جس کے مدیر خود ڈاکٹر نائک تھے۔ سنہ 83 یا 84 میں ڈاکٹر صاحب سے ڈونگری چارنل کے علاقے میں واقع 'نقشِ کوکن' کے دفتر میں میری ایک مختصری ملاقات ہوئی تھی جو میرے لیے آگے چل کر مشعل راہ ثابت ہوئی تھی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اپنا ایک مضمون 'خدا کی تلاش' انھیں مطالعہ کے لیے پیش کیا تھا جسے جلد ہی انھوں نے 'نقش کوکن' میں شائع فرما کر میری فکر کو حوصلہ اور قلم کو اعتبار عطا کیا تھا۔ مسرت کی بات ہے کہ ماہر تعلیم جناب مبارک کاپڑی کی ادارت میں 'نقشِ کوکن' کا سفر اب بھی جاری ہے۔ ہر چند کہ نوائے ادب، امکان، نیا ورق اور نقش کوکن کے علاوہ درج بالا سبھی رسائل اپنا اشاعتی سفر تمام کر کے ماضی کا حصہ بن چکے ہیں تاہم اردو ادب کی ترقی و فروغ میں ان کی جو کارگزاری رہی ہے اسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ یہ تمام رسالے ممبئی کے اردو ادب کی تاریخ میں اپنا ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔

ماجد قاضی نے اپنی تحقیقی کتاب میں چند

غیر معروف رسائل کا ذکر بھی کیا ہے جن کا تذکرہ میں اپنی گفتگو میں ضروری سمجھتا ہوں۔ ان کے مطابق ہفت روزہ 'کہکشاں' ابتدا میں خالص فلمی پرچہ نہیں تھا بلکہ یہ ایک ہلکا پھلکا نیم ادبی تفریحی رسالہ تھا جس میں افسانے، ڈرامے، طنز و مزاح کے نمونے اور فلموں پر تبصرے وغیرہ ہوتے تھے۔ مالیگاؤں کی اردو لائبریری میں اس کے چند شمارے محفوظ ہیں۔ سنہ 1949 اور 1952 کے دوران اس کے مدیر ساجد پرویز تھے۔ پندرہ روزہ رسالہ 'آکاش' انجم انصاری کی ادارت میں نکلا تھا۔ انصاری صاحب علمی و ادبی مضامین، افسانے اور معاصر شعرا کے کلام ترتیب دیتے، ایک مختصر اداریہ تحریر کرتے اور رحیمی پریس میں طبع کرواتے تھے۔ اس رسالے کا سنہ اجرا کتاب میں درج نہیں ہے۔ یہ پرچہ بہ مشکل ایک ڈیڑھ سال تک زندہ رہ سکا۔ اکبر نقوی کی ادارت میں فلمی جریدہ 'شیبا' کا اجرا سنہ 1977 میں ہوا تھا جسے نقوی صاحب 1980 تک چلاتے رہے۔

'ریما' پندرہ روزہ فلمی رسالہ تھا جو 1980 میں جاری ہوا تھا اور ایک سال کے اندر ہی 1981 میں یہ پرچہ بند ہوگیا۔ اس کے شعبۂ ادارت میں سعید حمید اور اسلم کرت پوری شامل تھے۔ ہفت روزہ 'کارٹون' ایک مزاحیہ رسالہ تھا جو 1955-56 کے آس پاس جاری ہوا تھا۔ اس کے مدیر کا نام کتاب میں درج نہیں ہے۔ ریاض جرولی جو اس وقت روزنامہ انقلاب سے وابستہ تھے، وہ اپنا مزاحیہ کلام علامہ ہرفن کے نام سے اکثر اس رسالے میں پیش کرتے تھے۔ اس کے علاوہ بقول افسانہ نگار انیس عادل 'شگوفہ' نام کا ایک فلمی و ادبی ماہنامہ بھنڈی بازار سے نکلا تھا جس کے مدیر آئی ایم چودھری تھے۔ سنہ 1980 کی دہائی میں علی عمر اسٹریٹ بھنڈی بازار سے 'ماہنامہ نسرین' شائع ہوتا تھا۔ یہ ایک فلمی و ادبی ماہنامہ تھا جس میں فلمی خبروں کے علاوہ دو ایک کہانیاں اور چند غزلیں بھی شریک اشاعت ہوتی تھیں۔ اس کے مدیر محمد شفیع کھتری تھے۔ مجلس مشاورت میں حسرت جے پوری، ایم اے حجازی، رفیعہ شبنم عابدی، انیس عالم امروہوی اور مسیح جعفر کے نام شامل ہیں۔ اس ماہنامہ کی قیمت فی شمارہ ایک روپیہ تھی۔ اتفاق سے اس کا مئی 1983 کا ایک شمارہ راقم کے پاس محفوظ ہے۔

ممبئی میں سنہ 80 کے بعد کا زمانہ بھی اردو رسائل کے حوالے سے نہایت خوش رنگ اور خوشگوار نظر آتا ہے۔ اگرچہ کچھ رسائل کا سفر اختتام پذیر ہوا تو کچھ نئے پرچے جاری بھی ہوئے۔ اس طرح اس شہر کی ادبی فضا کی کشش و جاذبیت اپنی جگہ بدستور قائم رہی۔ برقی میڈیا کی سحر طرازی سے دنیا ابھی محفوظ تھی۔ چنانچہ دیگر ممالک کی طرح ہندوستانی معاشرے میں بھی رسائل و جرائد کے مطالعے کا رواج عام تھا۔ سماج کے اعلیٰ طبقوں کے علاوہ متوسط الحال گھرانے کے مرد و خواتین نیز نوجوان بچے بچیاں بھی ذوق و شوق سے رسائل پڑھتے تھے۔ اس دور کے رسائل میں ڈاکٹر یونس اگاسکر کی ادارت میں شائع ہونے والا سہ ماہی 'ترسیل' جس کا اشاعتی سفر ہنوز جاری ہے، اپنی ایک الگ علمی و ادبی شناخت رکھتا ہے۔ قمر صدیقی اور عبید اعظم اعظمی کی زیر ادارت شائع ہونے والے رسالہ 'اردو چینل' کا اردو دنیا میں اپنا ایک منفرد معیار و مقام ہے۔ مشہور افسانہ نگار مظہر سلیم کا سہ ماہی 'تمثیل' اور فاروق سید کی ادارت میں نکلنے والا بچوں کا رسالہ 'گل بوٹے' بھی قابل توجہ ہیں اور اپنا اشاعتی سفر شاندار طریقے سے طے کر رہے ہیں۔ ممبئی سے اپنا سفر جاری رکھنے والے رسائل و جرائد کے کارواں میں ماہنامہ 'شاعر' کو اب بھی میر کارواں کا درجہ حاصل ہے۔ سنہ 1930 میں اپنے سفر کا آغاز کرنے والا یہ رسالہ وقت کے مختلف اتار چڑھاؤ اور حالات کے ان گنت تغیرات سے متاثر ہوئے بغیر اپنا اشاعتی سفر آب و تاب کے ساتھ طے کر رہا ہے۔ مدیر شاعر افتخار امام صدیقی جو کہ اپنی اختراعی سوچ و فکر کے لیے پوری اردو دنیا میں مشہور ہیں، اپنی ادارتی مہارت سے 'شاعر' کے ہر شمارے کو یادگار بنا دیتے ہیں۔

گزشتہ چند برسوں کے دوران کچھ نئے رسائل بھی منصۂ شہود پر وارد ہوئے ہیں جن سے ممبئی کے ادبی منظرنامے کی چمک دمک میں مزید اضافہ ہوا ہے۔ پنویل نوی ممبئی سے محمد ضیاء اللہ انصاری ماہنامہ 'تحریر نو' نکالتے ہیں۔ اس کے مدیر ظہیر انصاری ہیں جو اپنے بیباک اداریے کے سبب اپنی ایک الگ پہچان بنا چکے ہیں۔ ان کی ادارت میں رسالہ ماہ بہ ماہ ترقی کی نئی منزلیں طے کر رہا ہے۔ ممبئی کے مضافاتی علاقہ کرلا سے معروف شاعر، اسکرین رائٹر اور فلمی نغمہ نگار ضمیر کاظمی کی زیر ادارت ماہنامہ 'تریاق' بھی پابندیٔ وقت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ اس کے مدیر اعلیٰ ضمیر کاظمی ہیں جبکہ مدیر میر صاحب حسن اور مدیر معاون فیض الحسن ہیں۔ اردو فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام شائع ہونے والے اس رسالے نے چند ہی برس کے عرصے میں اپنی ایک منفرد شناخت قائم کر لی ہے۔ حال ہی میں اردو فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام سہ ماہی 'شناخت' بھی جاری ہوا ہے جس کے مدیر میر صاحب حسن ہیں اور معاون مدیر انیس عادل ہیں۔ اس دوران مشہور شاعر و صحافی اشعر نجمی کی ادارت میں سہ ماہی جریدہ 'اثبات' بھی بڑے ہی شان و شوکت کے ساتھ منظر عام پر آیا۔ اس جریدے کو اردو کے عالمی شہرت یافتہ ناقد و دانشور شمس الرحمٰن فاروقی کی علمی سرپرستی حاصل تھی جس کے باعث ادبی حلقوں میں اس کا کچھ خاص احترام و اکرام کے ساتھ استقبال ہوا۔

شہر ممبئی ہمیشہ ہی اپنے سیکولر کردار اور Pluralistic مزاج کے لیے مشہور رہا ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ یہاں ہندوستان کے تقریباً سبھی صوبہ جات سے آئے مختلف مذاہب کے لوگ آباد ہیں جو تفریق مذہب و ملت کے باوجود ایک دوسرے سے میل جول کر آپسی محبت و بھائی چارگی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ شہر ممبئی صرف اردو ادب کے لیے ہی نہیں بلکہ ہندی اور انگریزی ادب کے لیے بھی ہمیشہ زرخیز رہا ہے۔ 70 تا 80 کی دہائی میں ہندی اور انگریزی کے بھی متعدد رسائل و جرائد یہاں سے نکلتے رہے ہیں جن میں افسانے، کہانیاں نیز شاعری وغیرہ بھی شائع ہوتی تھیں۔ ٹائمز آف انڈیا گروپ کا 'دھرم یگ' ہندی کا بے حد مقبول و معتبر رسالہ تھا جو آج بھی حافظے کے ورق پر محفوظ ہے۔ اس کے مدیر ہندی ادب کی جانی مانی شخصیت دھرم ویر بھارتی تھے۔ دوسرا ہندی رسالہ بعنوان 'ساریکا' کملیشور کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ انگریزی میں The Mirror، The Readers، Digest، The Eve's Weekly، Illustrated شائع ہوتے تھے۔ ان سبھی رسائل میں کہانیاں، نظمیں اور ادبی مضامین کو اہتمام کے ساتھ جگہ دی جاتی تھی۔ The Mirror میں 'عباس اسکوپ' کے زیر عنوان خواجہ احمد عباس کا مستقل کالم شائع ہوتا تھا۔ ان میں سے صرف ریڈرس ڈائجسٹ کا اشاعتی سفر ہنوز جاری ہے۔ باقی سبھی رسائل اوراق ماضی پر منتقل ہو چکے ہیں۔ مگر المیہ یہ ہے کہ ریڈرس ڈائجسٹ میں اب ادب شائع نہیں ہوتا۔ علاوہ بریں ہندی میں بھی ممبئی سے اب کوئی ایسا رسالہ نہیں نکلتا جس میں ادب کو جگہ دی جاتی ہو۔ ان حقائق کی روشنی میں اگر ہم غور کریں تو برقی میڈیا کی یلغار کے باوجود ہندی اور انگریزی ادب کے مقابلے میں شہر ممبئی میں اردو زبان و ادب کا منظرنامہ نہایت خوشنما اور اطمینان بخش ہے کہ یہاں سے آج بھی قریب درجن بھر ادبی رسالے شائع ہوتے ہیں جو اس حقیقت کی روشن دلیل ہیں کہ اس شہر میں اردو زندہ ہے۔ یہاں تخلیق کاروں کے ساتھ ساتھ تخلیقی ادب پڑھنے والوں کی بھی تشفی بخش تعداد موجود ہے۔ لہٰذا کہہ سکتے ہیں کہ ادب، ادیب اور ادبی رسائل سے شہر ممبئی کا جو رشتہ ماضی میں تھا وہ اب بھی برقرار ہے۔

■

Mirzaq Mirza, Flat No 212, 1st Floor, Park View-2, Yari Road, Versova, Andheri (w) Mumbai - 61

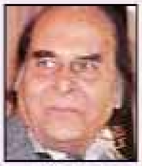

زبیر رضوی

کرسٹی اور ہندوستانی مصوری

عالمی سطح پر دنیا کے فنی نمونوں اور نوادرات کا نیلام کرنے والے ممتاز ادارے Christie کے سربراہ جیمس کرسٹی نے پہلے نیلام کا ہتھوڑے کے چوٹ کے ساتھ لندن میں 5 دسمبر 1966 کو آغاز کیا تھا، اس نیلام میں پہلی بار شیشے پر بنی چار ہندوستانی پکچرس بھی شامل تھیں اس طرح ہندوستان اور ہندوستانی آرٹ کے نمونوں کی ہندوستان سے باہر نیلامی اور کرسٹی کے ساتھ رابطہ کی شروعات ہوئی اور یورپی آرٹ شائقین کی ایک بڑی تعداد آرٹ میں ہندوستان کی ثروت مندی سے واقف اور متعارف ہوئی، 1781 میں جارج سوم نے ملکہ چارلوٹ (Charlotte) کو بطور تحفہ دینے کے لیے کرسٹی سے Ivory فرنیچر کا ایک پورا Suit خریدا اور اسے ملکہ کی نذر کیا ملکہ اس ہندوستانی فنی نمونے کی دلکشی اور اس کے فنی حسن سے ایسی متاثر ہوئیں کہ انھوں نے مشرقی فنکاری کے کافی نمونے خرید کر اپنے نوادرات کے ذخیرے کا حصہ بنالیے، Ivory فرنیچر آج بھی برطانوی ملکہ کی آرام گاہ بکنگھم پیلس میں موجود ہے، وقت کے ساتھ ساتھ کرسٹی کے ہندوستان کے ساتھ تجارتی تعلق ان برسوں میں برابر استوار ہوتے رہے اور تسلسل کے ساتھ وسعت پذیر ہوتے گئے۔ 1994 میں کرسٹی نے دنیا کے پہلے نیلام ہاؤس کے روپ میں ممبئی میں اپنا آفس کھولا اور بیسویں صدی کی ہندوستانی پینٹنگس کا پہلا سالانہ نیلام اگلے سال لندن میں کیا، اس نیلام کو Vision of India کا نام دیا گیا تھا، اس نیلام میں ہندوستانی جیولری، اس کے نادر نمونے اور دوسرے فنی نمونے فروخت کی غرض سے رکھے گئے تھے، کرسٹی کے ذریعے ہندوستانی فنی نمونوں اور فنکاری کے تعارف کے اس نئے سلسلے نے اکیسویں صدی میں کچھ اور دروازے کھول دیے چنانچہ 1996 میں The Pando Collection of Water Colours of India کے عنوان سے تھامس اور ولیم ڈینیل کی طرف سے ہندوستانی آرٹ ورک کی فروخت کا جو اہتمام کیا گیا تھا اس میں مجموعی فروخت 1,287,756 امریکی ڈالر تھی، یہ ہندوستانی فنی نمونوں کی پذیرائی کا ایک اہم اور مثالی موڑ تھا جب ملین ڈالر سے زیادہ قیمت کرسٹی کے نیلامی کے ذریعے ملی تھی۔

جنوبی ایشیا اور جنوب مشرقی ایشیا کے فنون کی اس بڑھتی ہوئی مانگ کے پیش نظر کرسٹی نے 1998 میں نیویارک میں ہندوستانی اور جنوب مشرقی ایشیا کا ایک شعبہ قائم کیا، اس عرصے میں ہندوستانی آرٹ اور اس کے معاصر آرٹ میں عالمی دلچسپی کتنی بڑھی اس کا اندازہ لگانے کے لیے ذرا ان اعداد و شمار پر نظر ڈال لیں جو اس افزودیت کا اشاریہ ہیں۔ 2000 میں ہندوستانی آرٹ اور معاصر آرٹ کے نمونوں کی کرسٹی کے نیلامی کے ذریعے مجموعی مالی بازیافت یعنی فروخت 656,300 تھی اور صرف دو سال کے وقفے کے بعد 2002 میں مجموعی فروخت 841,418 امریکی ڈالر تک پہنچ گئی۔ ہندوستانی پینٹر طیب مہتہ پہلے ہندوستانی مصور تھے جن کی پینٹنگ Celebration کو پہلی ہندوستانی پینٹنگ کے طور پر اس وقت تک کی سب سے بڑی قیمت 320,000 امریکی ڈالر ملی تھی، 2001 کے بعد فروخت میں 73% اضافہ ہوا، یہ اضافہ ہندوستانی آرٹ اور معاصر آرٹ کی نیلامی فروخت میں بھی دیکھا گیا۔ کرسٹی کے عالمی نیلام کے اب تک کے سلسلوں میں فروخت کا عالمی ریکارڈ اس وقت قائم ہوا جب چولا عہد کے کانسے کے بنے بھگوان شو کے مجسمے کو 724,300 امریکی ڈالر میں فروخت

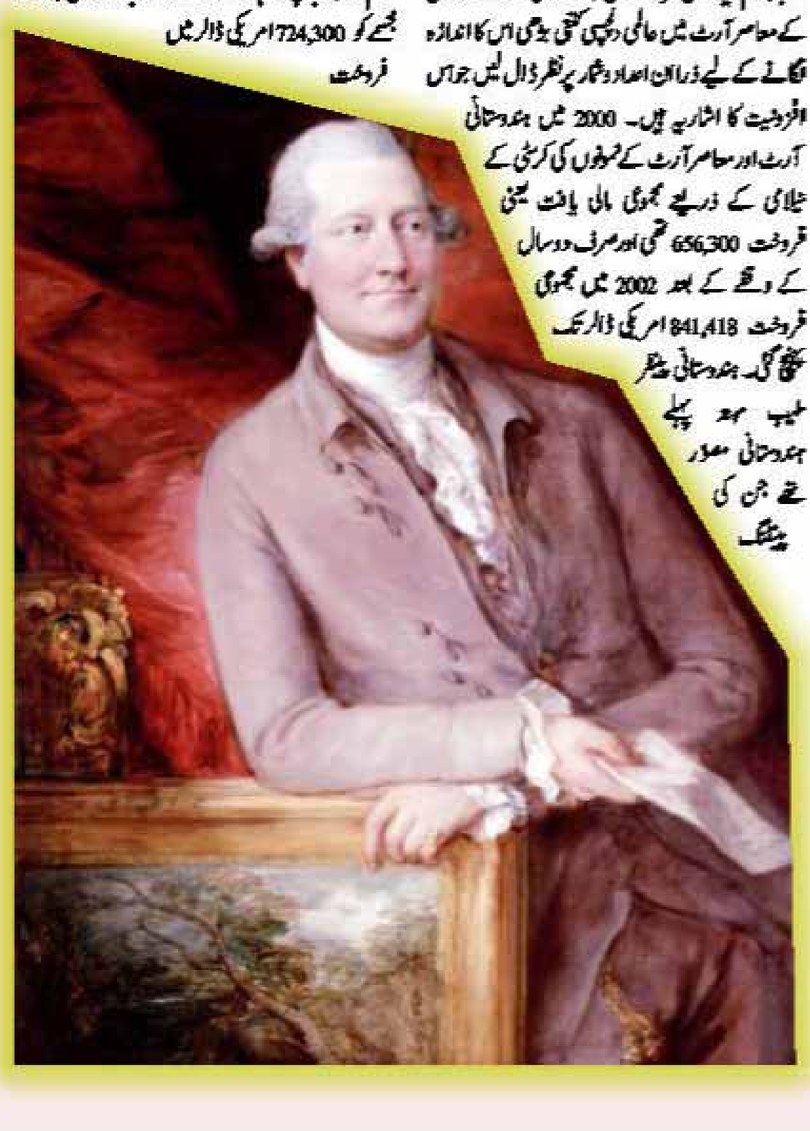

کیا گیا۔ دوسرا عالمی نیلام لندن میں Arts of India Sale نامی اس نیلام میں ہوا جب ہیرے جواہرات جڑے سونے کے مغل عہد کے ایک جام کو 038,411 امریکی ڈالر اور سترھویں صدی کے ہیرے جڑے اور ترشے Emeraldset کو 682,500 امریکی ڈالر میں فروخت کیا گیا تھا۔

اوپر مذکورہ نیلامی قیمت میں یہ اضافہ برابر جاری رہا۔ ایک اور سنگ میل اس وقت بنایا گیا جب پینٹر طیب مہتہ کی Mahisasura کو 1,584,000 امریکی ڈالر میں فروخت کیا گیا، اس روشنی میں دیکھا جائے تو عالمی مارکٹ میں ہندوستان کے معاصر آرٹ سے تعلق رکھنے والے طیب مہتہ کی پینٹنگس نے دوبار سب سے زیادہ قیمت حاصل کرکے ایک امتیاز اپنے نام کیا تھا۔ عالمی مارکٹ میں معاصر ہندوستانی آرٹ کو سربلند کرنے میں طیب مہتہ کے کلیدی رول کو یاد رکھنا ضروری ہو گیا ہے۔

طیب مہتہ کی مذکورہ پینٹنگ اس وقت دوسرے نمبر پر آ گئی جب پینٹر ایم ایف حسین کی پینٹنگ Battle of Ganga and Jamuna کو جو Heraitz کے Collection کا حصہ تھی، مارچ 2008 کے کرسٹی کے نیویارک والے نیلام میں 1.6 ملین امریکی ڈالر میں سب سے مہنگی پینٹنگ کے طور پر نیلام کیا گیا، اب یہ چونکا دینے والی بات بھی جان لیں کہ 2007 تک کرسٹی کو صرف ہندوستانی آرٹ کے جدید عصری نمونوں کی نیلامی سے جو رقم ملی وہ 36,021,000 امریکی ڈالر تھی، اس ایک مثال سے اندازہ ہوگا کہ کس قدر تیزی کے ساتھ جدید عصری آرٹ کے ہندوستانی نمونوں کی مارکٹ اور قیمت میں اضافہ ہو رہا ہے، مثال ہے جدید ہندوستانی پینٹر اٹل ڈوڈیا کی جن کی Vishal نامی پینٹنگ کو کرسٹی کے نیلام میں 2002 میں 11,491 امریکی ڈالر کے عوض نیلام کیا گیا تھا لیکن 2007 میں اسی پینٹنگ کی قیمت 398,876 امریکی ڈالر تھی۔

عالمی سطح پر ہندوستانی آرٹ کی اس پھیلتی اور بڑھتی ہوئی مقبولیت کا ایک سبب یہ ہے کہ دنیا کے مختلف خطوں میں جو خوشحال ہندوستانی آباد ہیں ان میں اپنے چھوڑے ہوئے وطن سے کسی نہ کسی سطح پر جڑنے کا جذبہ اور احساس بڑھ رہا ہے اور اپنے ہم وطنوں اور دوسری قوموں کے درمیان اپنا سماجی امیج اور مرتبہ بلند کرنے اور یہ تاثر دینے کے لیے کہ وہ آرٹ کے ہندوستانی نمونوں کی قدر و قیمت جاننے والا علم اور شوق رکھتے ہیں اسی لیے وہ ان کی سرپرستی کو اپنا تہذیبی فرض تصور کرتے ہیں نیز اس سلسلے میں Investment بھی زیاں کا سودا نہیں ہے کہ ان کی نئی نسل میں بھی اپنے بڑوں کی طرح اپنے آرٹ اور اس کی روایتوں کے محافظ اور وارث بننے کا جذبہ پروان چڑھ رہا ہے اور اپنے ملک کے فنی نمونوں کی قدر و منزلت جاننے اور پہچاننے کے لیے وہ اس سلسلے کی ساری جانکاری اور علم حاصل کر لینا ضروری سمجھ رہے ہیں۔

کرسٹی اور سوتھ بی نامی ان نیلام گھروں کے خیال میں دنیا کی ہندوستانی مصوری سے بتدریج توجہ ہندوستان کی دوسری کلاؤں کی طرف منتقل ہو رہی ہے لیکن اس کے لیے اسی طرح کی فضا سازی کرنی ہوگی جیسی ہندوستانی مصوری کے لیے کی گئی۔ مصوری کے نمونوں کی نیلام سازی میں کرسٹی اور سوتھ بی نے جن رکاوٹوں کو دور کرنے کی کوشش کی اور نمونوں کی خرید کرنے والوں کو حقیقی اور اصلی نمونے دیے جانے کی جو ضمانت دی ہے اس نے پینٹنگس کو جمع کرنے والوں میں ایک اعتماد اور بھروسہ پیدا کیا ہے۔

کرسٹی نے آرٹ اور فنون کے اس ایشیائی خطے کو توسیع دیتے ہوئے اس میں برصغیر ہند و پاک کے ساتھ جاپان، چین، سنگاپور اور کوریا کے آرٹ شائقین اور وہاں کے فنی نمونوں کی نیلامی کو اپنی سرگرمیوں کے دائرے میں لے لیا ہے۔ Pan Asian Audience کو وسعت دینے کے خیال سے اس Region میں ہانگ کانگ کو مرکز بنا کر ہر دو سال کے بعد نیلام کرنے کی بنیاد ڈال دی ہے، اس طرح بین الفنون اور بین الجہتی اختلاط کو فروغ دینے کی ایک فضا اور ماحول بنایا ہے، اس ایشیائی گروپ کی تشکیل پر ان سب کی نظر پڑنے لگی ہے جنہیں ایشیائی آرٹ اور معاصر ایشیائی آرٹ کے نمونوں کو دیکھنے، انھیں پسند کرنے اور ان کی تحسین و تعریف کرنے کا شوق ہو رہا ہے اور جو اس خطے کے فنی نمونوں کو بطور Collection اپنی نجی تحویل میں رکھنے سے دلچسپی رکھتے ہیں۔

ہمارے پڑھنے والوں کے لیے یہ بات دلچسپی کا باعث ہوگی کہ کرسٹی یہی نہیں کر رہی ہے کہ وہ ہندوستانی فنی نمونوں کو باہر کی دنیا سے متعارف کرانے کے لیے ہی تگ و دو کر رہی ہے، وہ یہ بھی کر رہی ہے کہ ہندوستان، فن کے بہترین عالمی نمونوں کی نیلامی کا مرکز بنے۔ چونکہ ایسی سرگرمیوں کے لیے ہندوستان میں کرسٹی اپنے لیے زمین ہموار کر چکی ہے، اکتوبر 2007 میں ہندوستان میں عالمی فنی نمونوں کی نیلامی اس سلسلے کی ایک کڑی تھی اس کے علاوہ پہلا عالمی نیلام گھر ہونے کے روپ میں Asian Contemporary اور Southeast Asian Art Sale کا جائزہ لینے کے لیے ممبئی میں چینی، جاپانی، انڈونیشیائی، کورین اور فلپائن آرٹسٹوں کو مدعو کیا تھا۔ اس سے پہلے اس ایشیائی خطے میں آرٹ سے متعلق ایسی تجارتی سرگرمیوں کی ضرورت کا احساس نہیں ہوا تھا، یقینی طور سے Pan Asian آرٹ کے شائقین کو جدید معاصر آرٹ میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی لینے پر مائل کرتا ہے تاکہ آرٹ کی عالمی مارکٹ پر یہ ایشیائی خطہ اپنے آرٹ کے فنی نمونوں کی فراہمی اور ان کی پیداوار کا ایک قابل بھروسہ گودام گھر بن سکے۔

آرٹ کے نمونوں کو نیلام کرنے والے ایک اور گھرانے OSIAN نے موڈرن آرٹ کے چالیس ایسے نمونے جمع کیے تھے جنہیں ممبئی کی 9 ستمبر والی نیلامی میں اونچے داموں میں بیچا گیا۔ دلچسپ بات ہے کہ ہندوستانی آرٹ کے کوئی پچیس ایسے شعبے ہیں جس میں ہندوستانی فنکاروں کی ہنرمندیوں کی ساحری کو دیکھا جا سکتا ہے، مگر ان دنوں صرف ہندوستانی مصوری کے جدید نمونے ہی عالمی توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔ کرسٹی اور سوتھ بی نامی ان نیلام گھروں کے خیال میں دنیا کی ہندوستانی مصوری سے بتدریج توجہ ہندوستان کی دوسری کلاؤں کی طرف منتقل ہو رہی ہے لیکن اس کے لیے اسی طرح کی فضا سازی کرنی ہوگی جیسی ہندوستانی مصوری کے لیے کی گئی۔ مصوری کے نمونوں کی نیلام سازی میں کرسٹی اور سوتھ بی نے جن رکاوٹوں کو دور کرنے کی کوشش کی اور نمونوں کی خرید کرنے والوں کو حقیقی اور اصلی نمونے دیے جانے کی جو ضمانت دی ہے اس نے پینٹنگس کو جمع کرنے والوں میں ایک اعتماد اور بھروسہ پیدا کیا ہے۔ نمونوں کی پوری جانچ، ان کی انشورنس، تکنیکی ضابطوں کی تکمیل، قانونی تحفظ اور کاغذات کی صحت اور ہر طرح کی جعل سازی سے مبرا نمونے کی ضمانت نے نیلام گھروں میں آنے والوں کی تعداد کو گھٹنے نہیں دیا اور آج بھی آرٹ کے نمونوں کے لین دین کے کاروبار میں سرمایہ کاری منافع بخش تصور کی جاتی ہے۔

■

ماخذ: ترقی پسند ہندوستان کے معاصر پینٹرز: انور رضوی، سنہ اشاعت: 2015 ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

انیس امروہوی

بانکا فلمی نغمہ نگار
ساحر لدھیانوی

ہندوستانی سنیما کی تاریخ میں کئی فلمی نغمہ نگاروں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر فلموں کے مناظر کے تناظر میں اور موسیقار کی دھن کی پابندی کرتے ہوئے بے شمار فلمی نغمے ہمارے فلمی ستاروں کے ہونٹوں پر سجائے ہیں۔ اُن میں سے کچھ نغمہ نگار تو خاص طور پر فلمی انداز میں ہی گیت لکھتے رہے اور چند خصوصی طور پر ادبی شاعری کی چاشنی کے ساتھ فلمی نغموں کو سنیما کے شائقین کے دل و دماغ میں اُتارتے رہے۔ گزشتہ زمانے میں زیادہ دور نہ جاتے ہوئے ہم یہاں شکیل بدایونی، مجروح سلطان پوری، حسرت جے پوری، شیلندر، راجندر کرشن اور ساحر لدھیانوی کا نام خاص طور پر لینا ضروری سمجھتے ہیں۔ ان سب میں بھی ساحر لدھیانوی اکلوتے ایسے فلمی نغمہ نگار رہے ہیں جنھوں نے اپنی تقریباً تمام ادبی کاوشوں کو فلموں میں بڑے سلیقے سے استعمال کیا ہے اور سنیما کے ذریعے اُردو زبان کو عوام و خواص کے دلوں میں ایک خاص گوشہ بنانے کا موقع فراہم کیا ہے۔ دیکھا جائے تو فلمی نغموں میں ساحر کی لفظیات بالکل علیحدہ طریقے اور لہجے میں ادا ہوتی ہے، جس کی وجہ سے ہم کسی بھی نغمے کو سنتے وقت اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ نغمہ ساحر کا تحریر کردہ ہے۔ کئی خصوصیات کے حامل اور مختلف لہجے کے اس بانکے نغمہ نگار کے 95ویں یوم پیدائش پر ساحر کو یاد کرتے ہوئے اُن کی زندگی اور اُن کی فلمی خدمات کا جائزہ پیش کر رہے ہیں۔

"آؤ کہ کوئی خواب بُنیں کل کے واسطے...." کل کے لیے خواب بُننے والا وہ مرد مجاہد، وہ فولادی ارادوں والا انسان، جس نے کبھی حالات سے ہار نہیں مانی، جس نے انتہائی مایوسی اور کشمکش کے دنوں میں بھی اُمید کی روشنی اپنے دل و دماغ میں بسائے رکھی، اب ایک ایسے خواب میں ڈوبا ہوا ہے، جس کی تعبیر وہ کسی سے بھی معلوم نہ کر سکے گا۔

ساحر لدھیانوی کے دادا فتح محمد لدھیانہ کے ایک بہت بڑے رئیس زمیندار تھے۔ ساحر لدھیانوی کے والد کا نام چودھری فضل محمد تھا۔ چودھری فضل محمد نے 1920 میں ایک معمولی خاندان کی لڑکی سردار بیگم سے نکاح کر لیا جبکہ اُن کی پہلے سے ہی کئی بیویاں موجود تھیں۔ مگر وہ اپنے علاقے کے ایک بڑے جاگیردار تھے اور کئی کئی بیویاں رکھنا اُن کے لیے بڑی شان و شوکت کی بات تھی۔ سردار بیگم کشمیری نسل کی تھیں۔ اس طرح 8 مارچ 1921 کو سردار بیگم سے جو بیٹا پیدا ہوا، چودھری فضل محمد نے اُس کا نام عبدالحی رکھ دیا۔ چند برسوں کے بعد ہی سردار بیگم کا اپنے شوہر فضل محمد سے جھگڑا ہو گیا اور وہ عبدالحی کو ساتھ لے کر اپنے بھائیوں کے گھر چلی گئیں۔ اُس وقت عبدالحی کی عمر صرف سات برس تھی جب چودھری فضل محمد نے اُس کو اپنی سرپرستی میں لینے کے لیے عدالت میں درخواست لگا دی۔ عدالت میں جب عبدالحی سے پوچھا گیا کہ وہ والدین میں سے کس کے ساتھ رہنا چاہتا ہے تو اس نے اپنی کم سن ماں کی طرف اشارہ کر دیا اور اس طرح عبدالحی ہمیشہ کے لیے اپنے باپ سے دستبردار ہو کر اپنی ماں کے حصے میں آ گیا۔

شہر لدھیانہ، جسے عبدالحی کے مولد ہونے کا فخر حاصل ہے، عبدالحی نے جب اس شہر کے تہذیبی اور سماجی ماحول میں شعور کی آنکھیں کھولیں تو وہاں ایک طرف زوال یافتہ جاگیرداریت کی فرسودہ باقیات تھیں اور انگریزی سامراج کے زیرِ سایہ ایک نیم سرمایہ دارانہ صنعتی نظام تشکیل پا رہا تھا، اور دوسری طرف بے زمین کسان تھے جنھیں بھر پیٹ روٹی بھی مشکل سے میسر آتی تھی۔ عبدالحی کے ذہن پر ان سب حالات کا تاثر بچپن سے ہی تھا۔

لدھیانہ کے خالصہ اسکول میں 1928 میں عبدالحی کا داخلہ ہو گیا اور جب 1937 میں وہ ہائی اسکول کر کے انٹر میں داخل ہوا تو شعر و شاعری کی طرف راغب ہو گیا اور پہلا شعر کہہ کر عبدالحی ساحر لدھیانوی بن گیا۔ یہاں اس کی ادبی تربیت ہریانہ کے ایک اُستاد فیاض ہریانوی نے کی، جو خود بھی شعر و شاعری کا ذوق رکھتے تھے۔ 1939 میں انٹر پاس کرنے کے بعد عبدالحی عرف ساحر لدھیانوی نے تعلیمی سلسلہ مزید جاری رکھتے ہوئے لدھیانہ کے گورنمنٹ کالج میں داخلہ لے لیا۔ شعر و شاعری سے شوق رکھتے ہوئے ساحر نے یہاں سیاسیات اور معاشیات کے مضامین پڑھنے میں بھی خاصی دلچسپی دکھائی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب ہندوستان کی تحریکِ آزادی اپنے شباب پر تھی اور انگریز بھی اپنے ظلم و جبر کا استعمال اسلحہ اور سازشوں کے زور پر کھل کر کر رہے تھے۔ اُدھر باپ کی ظالمانہ روش سے ساحر کے دل میں جاگیردارانہ نظام کے تئیں نفرت کا بیج پہلے ہی بویا جا چکا تھا۔ لہٰذا یہ سب چیزیں ساحر کی شاعری میں اس طرح گھل مل گئیں کہ اس کا رجحان بھی حالاتِ حاضرہ کی بھٹی میں تپ کر اس کے شعروں میں ڈھلنے لگا۔

ساحر اپنی والدہ کی سرپرستی اور نگرانی میں تعلیم پاتے رہے۔ اسکول اور کالج میں اُن کا شمار اچھے اور محنتی طالب علموں میں ہوتا تھا۔ اردو اور فارسی کی تعلیم انھوں نے

مولانا فیاض ہریانوی سے حاصل کی اور اُن ہی کے فیض تربیت سے نہ صرف ساحر کو ان زبانوں پر عبور حاصل ہو گیا بلکہ شعر و ادب میں بھی انھیں خاصی دلچسپی پیدا ہو گئی۔

ساحر کا ابھی کالج میں بی اے کا پہلا ہی سال تھا کہ کالج کے پرنسپل کی لڑکی سے اُسے عشق ہو گیا۔ جس کی پاداش میں ساحر کو کالج سے نکال دیا گیا۔ برسوں بعد جب ساحر ہندوستان کا ایک بڑا شاعر اور فلمی دنیا کا مقبول ترین نغمہ نگار بن گیا تو اسی کالج میں اس کے اعزاز میں ایک جلسہ ہوا، جہاں ساحر نے اپنی مشہور زمانہ نظم 'نذرِ کالج' پڑھی، جس کے آخری مصرعے یوں تھے:

معصومیوں کے جرم میں بدنام ہی سہی
تیرے طفیل مورد الزام ہی سہی
اس سرزمین پہ آج اک بار ہی سہی
دنیا ہمارے نام سے بیزار ہی سہی
لیکن ہم ان فضاؤں کے پالے ہوئے تو ہیں
گر یاں نہیں تو یاں کے نکالے ہوئے تو ہیں

بی اے کے آخری سال میں وہ لدھیانہ سے لاہور منتقل ہو گئے، جہاں انھوں نے دیال سنگھ کالج میں داخلہ لے لیا اور اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر چنے گئے۔ ساحر کا اولین مجموعۂ کلام 'تلخیاں' زمانۂ طالب علمی ہی میں شائع ہو چکا تھا اور وہ ایک اُبھرتے ہوئے نوجوان شاعر کی حیثیت سے ادبی دُنیا میں اپنی شناخت قائم کر چکے تھے۔

1944 میں طالب علمی کا ہی زمانہ تھا جب ساحر لدھیانوی کا پہلا شعری مجموعہ 'تلخیاں' شائع ہوا۔ ساحر کا یہ مجموعہ اتنا مقبول ہوا کہ شاید 'دیوانِ غالب' کے بعد اردو شاعری میں سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتاب 'تلخیاں' ہی ہے۔ اس مجموعے کے اب تک پچاس سے زیادہ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، جس کے پہلے ہی صفحے پر ساحر کا یہ شعر درج ہے.....

دُنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

اس ایک شعر سے ہی ساحر کی شاعری کا رنگ و آہنگ اپنا تعارف کرا دیتا ہے۔ اس سے پہلے اور نہ بعد میں کسی اردو شاعر کو یہ امتیاز حاصل ہوا کہ اتنی کم عمر میں اتنی بڑی تعداد میں کسی کا کوئی شعری مجموعہ فروخت ہوا ہو۔

لدھیانہ گورنمنٹ کالج سے نکالے جانے کے بعد جب ساحر لاہور چلے گئے اور وہاں دیال سنگھ کالج میں داخلہ لے لیا تو اس کے ساتھ ہی لاہور میں مکتبہ اردو والوں کے رسالے 'ادبِ لطیف' میں چالیس روپے ماہانہ تنخواہ پر ساحر ایڈیٹر بھی مقرر ہو گئے۔ لاہور ہی میں ساحر کو 'سویرا' اور 'شاہکار' رسالوں کی ادارت کے مواقع بھی ملے۔ اُس وقت تک پنجابی کی مشہور شاعرہ اور ناول نگار امرتا پریتم کی شادی ہو چکی تھی اور وہ آل انڈیا ریڈیو لاہور میں اناؤنسر تھیں۔ لاہور سے پہلے ساحر کی ایک ملاقات امرتا پریتم سے امرتسر کے قریب پریت نگر کے ایک ادبی سالانہ جلسے میں ہو چکی تھی۔ لاہور میں امرتا اور ساحر کی دوستی ادبی حلقوں میں کافی گفتگو کا موضوع بنی رہی۔ خود امرتا پریتم نے اپنی سوانح 'رسیدی ٹکٹ' میں ساحر سے اپنی دوستی کے واقعات بڑی ایماندارانہ بے باکی کے ساتھ

> **1949 میں ساحر جب دُوسری بار بمبئی گئے تو وہاں ہندوستانی کلامندر کی فلم 'آزادی کی راہ پر' کے لیے گانے لکھوانے کی غرض سے فلمساز کلونت رائے نے ساحر کو بلوایا تھا۔ اس فلم کے چار گانے ساحر نے لکھے تھے۔ پہلے گانے کے بول تھے..... 'بدل رہی ہے زندگی.....' مگر ان گانوں کو زیادہ مقبولیت نہیں ملی۔ 1950 میں ساحر نے مستقل طور پر دہلی کو الوداع کہہ کر بمبئی میں سکونت اختیار کر لی اور فلمی نغمہ نگاری پر پوری توجہ لگائی۔ 1949 کے بعد فلمی زندگی کی مصروفیات نے ساحر کو اِس طرح گھیر لیا کہ تخلیقی شاعری کے لیے مناسب وقت نکالنا اُن کے لیے مشکل ہو گیا**

تحریر کیے ہیں۔

1982 سے 1988 کے درمیان، میں خود جب 'اسٹار پبلی کیشنز' کے فلمی ماہنامہ 'مووی اسٹارز' میں مدیر تھا تو بارہا امرتا پریتم کے یہاں میرا جانا ہوا، اور مجھے یہ اعزاز بھی حاصل رہا کہ میں نے کئی بار امرتا اور امروز کے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چائے پی ہے۔ جب بھی میں امرتا پریتم کے گھر گیا، میں نے ہر بار چاروں طرف، وہاں کے در و دیوار پر، ڈرائنگ روم میں اور امروز کی پینٹنگ میں، وہاں کی سجاوٹ اور فرنیچر میں، غرض ہر جگہ ساحر کی موجودگی کو محسوس کیا ہے۔ میں نے امرتا پریتم کے بیٹے کے چہرے پر ہر بار ساحر کے نقوش کی جھلک محسوس کی ہے۔ ایک بار جب میں نے امرتا سے یادگار کے طور پر آٹوگراف کی فرمائش کی تو انھوں نے پنجابی زبان میں لکھا:

"پرچھائیوں کے پیچھے بھاگنے والو! چنے میں جو آگ سلگتی ہے، اس کی کوئی پرچھائی نہیں ہوتی۔"

یہ محض اتفاق ہو سکتا ہے کہ بمبئی میں ساحر کے مکان کا نام بھی 'پرچھائیاں' تھا اور اس کی ایک مشہور نظم کا عنوان بھی۔ بہرحال، یہاں میرا مقصد امرتا پریتم اور ساحر کی دوستی کی تفصیلات میں جانے کا ہرگز نہیں ہے۔ کچھ دنوں کے بعد ساحر لدھیانہ آ گئے اور پھر جنوری 1946 میں بمبئی چلے گئے۔ ہندوستان کی آزادی کے نتیجے میں جو فرقہ وارانہ آگ پھیلی، اس میں ساحر بھی جھلسے کیونکہ ان کی ماں سردار بیگم فسادات میں کہیں کھو گئیں۔ ساحر بمبئی چھوڑ کر لاہور گئے اور کافی جدوجہد کے بعد ماں کو تلاش کر لیا۔ ستمبر 1947 میں جب ساحر دوبارہ لاہور گئے تو تقسیم ہند کے نتیجے میں امرتا پریتم اپنے شوہر اور سسرال والوں کے ساتھ ہندوستان آ چکی تھیں۔ ساحر بھی جون 1948 میں لاہور سے دہلی منتقل ہو گئے اور تقریباً ایک برس تک دہلی میں رہے۔ دہلی میں ساحر لدھیانوی بدر صاحب اور محمد یوسف جامعی صاحب کے ادارے حالی پبلشنگ ہاؤس سے وابستہ ہو گئے اور یہیں سے انھوں نے ماہنامہ 'شاہراہ' کا اجرا کیا۔ پرکاش پنڈت اس رسالے کے اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے۔ اسی درمیان ساحر سے امرتا کی دوستی میں شدت آ گئی، اور شاید یہی وہ زمانہ تھا جب امرتا پریتم کی اپنے شوہر سردار پریتم سنگھ سے علیحدگی ہو گئی تھی۔ شاید امرتا پریتم بھی ساحر سے شادی کرنا چاہتی تھیں مگر ساحر اپنے ماضی کی تلخیوں سے ذہنی طور پر آزاد نہیں ہو سکے تھے۔ جب امرتا پریتم نے دل سے دُعا کی کہ اس کا ہونے والا بیٹا ساحر کی شکل لے کر پیدا ہو، خدا نے اس کی دعا قبول کی اور امرتا نے بھی اس دوران ساحر کو اتنا سوچا کہ جب اس کا بیٹا پیدا ہوا تو اس کی شکل کافی حد تک ساحر سے ملتی تھی۔

جب 1948 میں ساحر نے دہلی سے ماہنامہ 'شاہراہ' کا اجرا کیا تو اس کے ساتھ ہی رسالہ 'پریت کی لڑی' کی بھی ادارت کی۔ ان رسائل کے ذریعہ انھوں نے نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی اور رہنمائی کی۔ 1949 میں ساحر جب دُوسری بار بمبئی گئے تو وہاں ہندوستانی کلامندر کی فلم 'آزادی کی راہ پر' کے لیے گانے لکھوانے کی غرض سے فلمساز کلونت رائے نے ساحر کو بلوایا تھا۔ اس فلم کے چار گانے ساحر نے لکھے تھے۔ پہلے گانے کے بول تھے..... 'بدل رہی ہے زندگی.....' مگر ان گانوں کو زیادہ مقبولیت نہیں ملی۔ 1950 میں ساحر نے مستقل طور پر دہلی کو الوداع کہہ کر بمبئی میں سکونت اختیار کر لی اور فلمی نغمہ نگاری پر پوری توجہ لگا دی۔ 1949 کے بعد فلمی زندگی کی مصروفیات نے ساحر کو اس طرح گھیر لیا کہ تخلیقی شاعری

کے لیے مناسب وقت نکالنا اُن کے لیے مشکل ہو گیا۔ اس کی علاوہ انھوں نے اس طرح کی کہ فلمی گیتوں کو اپنے تخلیقی اظہار کا ذریعہ بنالیا اور فلموں کے لیے انھوں نے جو گیت اور غزلیں لکھیں، ان میں اپنے سیاسی اور سماجی تصورات کے اظہار کی بھی گنجائش نکال لی۔

1958 میں ساحر لدھیانوی نے فلمساز رمیش سہگل کی فلم 'پھر صبح ہوگی' کے لیے گیت لکھے۔ یہ فلم عالمی شہرت یافتہ ناول نگار دوستوسکی کے مشہور زمانہ ناول 'کرائم اینڈ پنشمنٹ' کے مرکزی خیال پر بنائی گئی تھی۔ راجکپور کے پسندیدہ میوزک ڈائریکٹر شنکر جے کشن اس فلم کا میوزک تیار کرنے والے تھے۔ مگر ساحر نے کہا کہ اس فلم کا میوزک وہی بنائے گا جس نے مذکورہ ناول پڑھا ہوگا۔ تب موسیقار خیام کو اس فلم کا میوزک دیا گیا اور انھوں نے ساحر کے نغمہ..... 'وہ صبح کبھی تو آئے گی.....' کی دھن تیار کی، اور مکیش نے اس نغمے کو بہت خوبصورت انداز میں گایا ہے۔ اس کے بعد کئی فلموں میں ساحر کے گیتوں کو خیام نے اپنی دھنوں سے سجایا جن میں 'کبھی کبھی' بھی ایک اہم فلم ہے۔

ساحر نے نہ صرف یہ کہ اپنی شاعری کے معیار کو گرنے نہیں دیا، بلکہ فلمی شاعری کے معیار کو بھی بلند کیا اور اس بدذوقی کی روک تھام کی جسے فلم بینوں پر مسلط کیا جا رہا تھا۔ فلمی دُنیا سے وابستہ ہونے کے بعد اگرچہ ان کی شعر گوئی کی رفتار نسبتاً کم ہو گئی لیکن شاعر کی حیثیت سے ان کی مقبولیت میں کبھی کوئی کمی نہیں ہوئی۔ بہت کم ادیبوں اور شاعروں کو ان کی زندگی میں اتنی شہرت اور عزت حاصل ہوتی ہے جس کے وہ مستحق ہوتے ہیں۔ اس معاملے میں ساحر لدھیانوی اردو شاعروں میں سب سے زیادہ خوش قسمت رہے ہیں۔ ساحر اپنے دور میں نہ صرف ہندوستان کے سب سے محبوب اور ہردلعزیز شاعر تھے، بلکہ عالمی اہمیت کے شعراء میں انھوں نے اپنا مقام پیدا کر لیا تھا۔ دُنیا کی مختلف زبانوں جیسے انگریزی، فرانسیسی، چیک، روسی، فارسی اور عربی میں اُن کی شاعری کے ترجمے کیے جاچکے ہیں۔

ساحر جتنے بڑے شاعر تھے، اُتنے ہی عظیم انسان بھی تھے۔ ان کی زندگی اور ان کے فن میں کوئی بھید بھاؤ نہیں تھا۔ اپنی شاعری میں انھوں نے انسان اور انسانیت کا جو تصور پیش کیا ہے، وہ خود بھی اُس معیار پر بڑی حد تک پورا اترتے تھے۔

انھوں نے اپنی ادبی شاعری میں جہاں عورت کی عزت و عصمت کی حمایت کی ہے، وہیں اپنے فلمی گیتوں میں بھی وہ عورت پر ہونے والے ظلم و ستم کے خلاف کھل کر آواز اُٹھاتے ہیں۔ فلم 'پیاسا' کا نغمہ..... 'یہ کوچے یہ نیلام گھر دلکشی کے.....' اور فلم 'سادھنا' کا نغمہ..... 'عورت نے جنم دیا مردوں کو.....' اور فلم 'انصاف کا ترازو' میں ساحر کا لکھا گیت..... 'لوگ عورت کو فقط جسم سمجھ لیتے ہیں.....' اس بات کے بہترین شاہد ہیں۔ وہ زندگی بھر جنگ و جدل کے خلاف رہے۔ وہ جانتے تھے کہ سیاستداں اکثر اپنے سیاسی مقاصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے ہزاروں بے گناہوں کا خون بہا دیتے ہیں۔ در حقیقت وہ قاتل اور لٹیرے ہیں، وہ انسانی جان کی قیمت نہیں جانتے۔

ساحر کی ایک مشہور نظم 'چکلے' سننے کے بعد اس وقت کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ حالانکہ یہ نظم ساحر کے لاہور کے زمانے کی ہے مگر آزادی کے بعد یہ نظم ہندوستانی فلم 'پیاسا' میں شامل ہوئی تو پورے برصغیر ہندو پاک میں دھوم مچ گئی۔ اکثر مشاعروں میں لوگ ساحر سے فرمائش کر کے یہ نظم سنا کرتے تھے۔ اس نظم کی تخلیق سے متعلق ساحر کے بہت ہی قریبی دوست حمید اختر صاحب نے اظہر جاوید کی کتاب 'ناکام محبت: ساحر لدھیانوی کے ابتدائی نقوش' میں بطور پیش لفظ بعنوان 'خوش قسمت شاعر' اپنے مضمون میں لکھا ہے:

"ساحر لدھیانوی کی خوش بختی میں تو کسی کو شبہ نہیں ہونا چاہیے۔ اس نے اپنی ابتدائی زندگی میں اپنے لیے جو منزل متعین کی تھی اسے حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ میں یہ بات پہلے بھی ایک سے زائد بار لکھ چکا ہوں کہ اس نے کبھی بڑا شاعر بننے کی تمنا نہیں کی تھی۔ وہ اپنی شاعری کی ابتدائی منزلیں طے کر رہا تھا، اس وقت بار بار یہی کہتا تھا کہ وہ فلمی نغمہ نگاری میں نام پیدا کرے گا اور اسی ذریعہ سے دولت، عزت اور شہرت حاصل کر کے رہے گا۔ اس کا یہ سارا ابتدائی زمانہ میرے ساتھ ہی گزرا تھا۔ مجھے لاہور کے بازارِ حسن میں 'ٹبی' نام کی گلی میں تقریباً ایک ہفتہ روزانہ اُس کے ساتھ دو تین چکر بھی لگانے پڑے۔ اس گلی میں جہاں جسم فروش عورتیں بیٹھتی تھیں، وہ روزانہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک دو تین چکر لگاتا تھا۔ اس نے اس دوران کبھی بھی وہاں جسم کے حصول کی کوشش کی، نہ ہی کسی ایکا دُکا عورت سے بات کی، البتہ چند پھیروں کے بعد اُس کی شاہکار نظم 'چکلے' وجود میں آ گئی، جس کا ٹیپ کا مصرع ہے:

"ثناخوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟"

ساحر شروع سے ہی انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستہ ہو گئے تھے، مگر ساحر کی انقلابی اور سیاسی شاعری حد سے بڑھی ہوئی جذباتیت اور نعرہ بازی سے پاک ہے۔ انھوں نے بے خوفی کے ساتھ دو ٹوک انداز میں براہ راست اپنے خیالات اپنی شاعری کے ذریعے پیش کر دیے ہیں۔

ساحر کی شاعری محض زلف و رخسار کی آئینہ دار نہیں بلکہ پُر خیال ہے اور وہ انسان کو ذہنی خوراک مہیا کراتی ہے۔ اس کے دل و دماغ میں نئی نئی فکر کے بیج بوتی ہے، نئے احساسات کو جنم دیتی ہے۔ وہ دراصل ساحر کی روح کی آواز ہے۔ وہ اس شاعر کی پکار ہے، جس نے اپنی زندگی لمحہ لمحہ انسانی محبت کے چراغ روشن کرتے ہوئے گزار دی۔ ساحر کی بے پناہ مقبول نظموں میں 'تاج محل' کو اتنا پسند کیا جاتا تھا کہ جب بھی کسی مشاعرے میں ساحر مائک پر آتے تھے تو لوگ 'تاج محل تاج محل' کہہ کر چلانے لگتے تھے۔ حالانکہ تاج محل پر ساحر سے پہلے اور بعد میں بھی کئی شاعروں نے نظمیں لکھی ہیں، مگر اردو شاعری میں ساحر تنہا ایسے شاعر ہیں جنھوں نے صدیوں سے محبت کی عظیم اور لافانی یادگار مانے جانے والے 'تاج محل' کے سائے میں اپنے محبوب سے ملنے سے انکار کر دیا اور تاج محل کے بارے میں ایک بالکل نیا اور انوکھا نظریہ عوام کے سامنے پیش کیا۔ حالانکہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس نظم کو لکھنے سے پہلے تک ساحر نے تاج محل دیکھا بھی نہیں تھا۔

ساحر لدھیانوی اور مجروح سلطانپوری سے پہلے فلمی نغمہ نگاری میں خالص ادبی قسم کی لفظیات اور ادبی نظموں کے استعمال کی قطعی گنجائش نہیں تھی، لیکن ساحر نے اپنی تمام ادبی نظموں کو فلموں میں اس خوبصورتی کے ساتھ استعمال کیا کہ وہ فلم کا حصہ ہی معلوم ہوتی ہیں۔ جیسے فلم 'گمراہ' میں سنیل دت نے مہندر کپور کی آواز میں ساحر کی نظم پڑھی..... 'چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں.....' یہ ساحر کا ہی جگر ہے جو وہ اس طرح اپنی محبوبہ سے مخاطب ہوتا ہے، ورنہ تو اردو شاعری محبوبہ کے ناز نخرے اُٹھانے اور اس کی خوشامدوں سے بھری پڑی ہے۔ اسی طرح فلم 'پیاسا' میں ان کی مشہور زمانہ نظم 'چکلے' بخوبی استعمال ہوئی ہے اور یہ دونوں نظمیں اسی فلم کا حصہ معلوم ہوتی ہیں۔ اسی طرح فلم 'لیلیٰ مجنوں' کے ایک نغمے کا یہ بند ملاحظہ ہو:

بہت رنجور ہے یہ غموں سے چور ہے یہ
خدا کا خوف کھاؤ، بہت مجبور ہے یہ

.....اب اس بند میں لفظ 'رنجور' ساحر لدھیانوی جیسا نغمہ نگار ہی استعمال کر سکتا ہے۔

ساحر اپنی زندگی میں ایک [illegible] تھے ہمارے روایتی

شاعروں اور ہماری روایتی شاعری کے لیے، ہمارے روایتی نغموں کے لیے اور ہمارے روایتی فرسودہ معاشرے کے لیے۔ اس نے اپنا قلم اٹھایا تو ماضی کی عشقیہ شاعری کو پسینہ آگیا۔ معاشرے کی فرسودہ روایات کی دھجیاں بکھر گئیں۔ ساحر نے اردو شاعری میں ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ انھوں نے خواص کے بجائے عوام کے لیے انقلابی شاعری کے دروازے کھول دیے اور اپنی شاعری کو عوامی رنگ میں پیش کیا۔ موجودہ زندگی کے مسائل اور استحصال کو جتنے خوبصورت اور سہل انداز میں ساحر نے پیش کیا ہے، کوئی دوسرا شاعر پیش نہیں کرسکا۔

ساحر لدھیانوی کو فلمی قوالی لکھنے میں ملکہ حاصل تھا۔ انھوں نے اب تک کی سب سے بہترین قوالیاں فلموں کو پیش کی ہیں۔ یاد کیجیے فلم 'وقت' کی وہ قوالی، جب بلراج ساہنی اپنی ہی بیگم کی تعریف یوں کرتے ہیں:

اے میری زہرہ جبیں، تجھے معلوم نہیں
تو ابھی تک ہے حسیں اور میں جواں

فلمی قوالیوں کے طویل سلسلے میں ساحر کی لکھی ایک قوالی ابھی بھی میل کا پتھر بنی ہوئی ہے اور آج بھی فن قوالی کی لاج بچائے ہوئے ہے۔ فلم 'برسات کی رات' کی محمد رفیع وغیرہ کی آواز میں گائی ہوئی یہ قوالی......

نہ تو کارواں کی تلاش ہے، نہ تو ہمسفر کی تلاش ہے
میرے شوق خانہ خراب کو، تیری رہ گزر کی تلاش ہے

فلم 'دھرم پتر' میں ہندوستانی قومی اتحاد کو اجاگر کرتی ہوئی ساحر کی لکھی یہ قوالی بھی لوگ آج تک بھول نہیں پاتے ہیں:

یہ مسجد ہے وہ بت خانہ چاہے یہ مانو چاہے وہ مانو
مقصد تو ہے دل کو سمجھانا چاہے یہ مانو چاہے وہ مانو

فلم 'سادھنا' میں ساحر لدھیانوی کی لکھی یہ قوالی آج بھی اسی طرح مقبول ہے:

آج کیوں ہم سے پردہ ہے......

......اور فلم 'تاج محل' کی یہ قوالی بھی ساحر کی پہچان بنی ہوئی ہے اور ابھی تک اس کی مقبولیت میں کوئی کمی نہیں آئی ہے:

چاندی کا بدن سونے کی نظر
اس پہ یہ نزاکت کیا کہیے

......اور فلم 'نیلی چھتری' کی یہ یادگار قوالی بھی ساحر کے ہی زور قلم کا نتیجہ ہے:

میں تیرے در پہ آیا ہوں......

فلم 'بہو بیگم' (1967) کی قوالی:

'کیسے میں تجھ کو ڈھونڈ کے لاؤں کہاں سے میں......'

بھی ساحر کی لکھی ہوئی قوالیوں میں مقبول ترین قوالی ہے۔ اس کی طرز موسیقار روشن نے ترتیب دی تھی۔

اسی طرح راج کپور اور نوتن کی فلم 'دل ہی تو ہے' میں ساحر لدھیانوی کی لکھی ہوئی ایک قوالی...... 'نگاہیں ملانے کو جی چاہتا ہے......' بے حد مقبول فلمی قوالی کہی جا سکتی ہے۔ اس فلم کے پروڈیوسر بی۔ ایل۔ راول اور ڈائریکٹر پی۔ ایل۔ سنتوشی تھے۔ موسیقار روشن کی دھنوں سے سجی یہ فلم 1963 میں نمائش کے لیے پیش ہوئی تھی۔ اس قوالی میں عید کے پرجوش تہوار کے موقع کے لیے ایک بند اس طرح کہا گیا ہے:

جس گھڑی میری نگاہوں کو تیری دید ہوئی
وہ گھڑی میرے لیے عیش کی تمہید ہوئی
جب کبھی میں نے ترا چاند سا چہرہ دیکھا
عید ہو یا کہ نہ ہو میرے لیے عید ہوئی

......اس قوالی میں ساحر نے جس طرح اس بند میں 'تمہید' کا لفظ استعمال کیا ہے، اسی طرح ایک اور بند میں 'اوجھل' اور 'تہمت' کے الفاظ اس طرح استعمال کیے ہیں:

وہ تہمت جسے عشق کہتی ہے دنیا
وہ تہمت اٹھانے کو جی چاہتا ہے
وہ جلوہ جو اوجھل بھی ہے سامنے بھی
وہ جلوہ چرانے کو جی چاہتا ہے

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ساحر کے بے شمار فلمی نغموں میں اردو کے ایسے مشکل الفاظ مل جاتے ہیں جو فلمی نغموں میں بہت کم مستعمل ہیں، مگر ساحر نے انھیں بہت خوبصورتی سے اپنے فلمی نغموں میں استعمال کیا ہے۔ مثال کے طور پر 'ضمیر و فلک، تہمت، اوجھل، تمہید، غرور، جرم الفت، قضا کے رستے، ترک وفا، جنگ و جدال، فتح و ظفر، ملکیت، کبر و غرور، زنگ، عرش، رہبر، ہدایت کی روشنی، میزان، ناگاہ، بشر، جینے کا شعور اور مرنے کا سلیقہ' وغیرہ۔ میرے خیال سے فلمی نغموں کے سلسلے میں جتنی بہترین قوالیاں ساحر لدھیانوی اور شکیل بدایونی نے لکھی ہیں، کسی دوسرے فلمی نغمہ نگار نے نہیں لکھی۔

ساحر اپنے قریبی دوستوں میں شہزادے کے نام سے مشہور تھے، لہٰذا بے پناہ مخلص ہونے کے باوجود ان میں خودداری اور انا کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، شاید اس لیے بھی کہ وہ بچپن سے ہی بہت ضدی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے زندگی کا بڑا حصہ محرومیوں اور نامرادیوں میں گزارا، مگر ان کی تخلیقات نے جو عزت اور شہرت، اور بعد میں دولت بھی ان کو دلوائی، وہ بہت کم ہی اردو شاعروں کے حصے میں آئی ہے۔

مشہور گلوکارہ سدھا ملہوترہ جب فلم انڈسٹری میں اپنی پہچان بنانے کے لیے جد و جہد کر رہی تھیں، جسے 'سٹرگل' کا زمانہ کہا جاتا ہے تو ساحر لدھیانوی نے ان کو کئی فلموں میں پروموٹ کیا، اور دھیرے دھیرے ان دونوں کے معاشقے کے قصے فلمی گلیاروں سے ہوتے ہوئے فلمی رسالوں کے بازاروں تک پہنچے اور چھپنے لگے۔ حالانکہ ہمیشہ کی طرح ساحر اس بارے میں خاموش رہے اور شاید بدنامی کے ڈر سے سدھا اس رشتے کو زیادہ دن نباہ نہ سکی، کیونکہ اسی دوران اس کی منگنی بمبئی کے کسی کماظر سے ہوگئی۔ انھیں دنوں ساحر کے دوستوں اور مداحوں نے 'ایک شام ساحر کے نام' ایک محفل کا انعقاد کیا۔ اس واقعے کو ابراہیم جلیس نے اپنے ایک مضمون میں اس طرح بیان کیا ہے:

"ساحر کو فلمی انڈسٹری میں 'شہزادہ' کے لقب سے پکارا جاتا ہے اور واقعی مقبولیت کے زمانے میں اس نے ایسی ہی شان اور آب سے وقت گزارا...... 'شام ساحر' کسی عالیشان بنگلے کے ٹیرس پر منائی گئی۔ چند دوستوں نے وہاں اظہار خیال کیا، موسیقاروں اور گلوکاروں نے ساحر کے مشہور گیت گائے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خود سدھا ملہوترہ نے ساحر کے گیت گائے۔ پروگرام کے آخر میں، ساحر نے اپنی نئی اور مشہور نظم خوبصورت موڑ سنائی:

چلو، اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں
نہ میں تم سے کوئی امید رکھوں دل نوازی کی
نہ تم میری طرف دیکھو غلط انداز نظروں سے
نہ میرے دل کی دھڑکن لڑکھڑائے میری باتوں میں
نہ ظاہر ہو تمھاری کشمکش کا راز نظروں سے

تمھیں بھی کوئی الجھن روکتی ہے پیش قدمی سے
مجھے بھی لوگ کہتے ہیں کہ یہ جلوے پرائے ہیں
مرے ہمراہ بھی رسوائیاں ہیں میرے ماضی کی
تمھارے ساتھ بھی گزری ہوئی راتوں کے سائے ہیں

تعارف روگ ہو جائے تو اس کا بھولنا بہتر
تعلق بوجھ بن جائے تو اس کا توڑنا اچھا
وہ افسانہ جسے انجام تک لانا نہ ہو ممکن
اسے اک خوبصورت موڑ دے کر چھوڑنا اچھا

اس شام کی روداد بیان کرنے والے کہتے ہیں کہ ساحر کی اس نظم نے وہاں پر موجود ہر شخص کی آنکھوں کو نم کر دیا تھا اور ماحول پر ایک پر کیف سناٹا طاری ہوگیا تھا۔ ہر شخص جذباتی تھا اور خاموش بھی۔ سدھا ملہوترہ اپنے آنسوؤں اور جذبات کو روک سکنے اور سنبھالنے میں ناکام ہو رہی تھی۔ وہ

اپنی جگہ سے اٹھی اور کچھ کہے سنے بغیر، چپ چاپ فلیٹ کی سیڑھیوں سے اُتر کر اپنی کار میں جا بیٹھی۔ دُوسری طرف ساحر بھی بے قراری اور بے بسی کی کیفیت میں اپنی جگہ سے اُٹھے اور پلٹ کر کسی کی طرف دیکھے بغیر ہی سیڑھیاں اُتر گئے۔ سڑک پر سُدھا اپنی کار میں اور ساحر اپنی کار میں بیٹھ کر دو مختلف سمتوں کی جانب روانہ ہو گئے۔ سارے ماحول اور تمام محفل کو اجنبی بنا کر دونوں اپنی اپنی منزلوں کی جانب چلے گئے اور پھر کبھی ایک دوسرے سے نہیں ملے۔ بعد میں اِسی سچویشن کو فلم 'گمراہ' میں سُنیل دت، اشوک کمار اور مالا سنہا پر بڑی خوبصورتی سے فلمایا گیا ہے اور ساحر کی وہی مقبول ترین نظم پیش کی گئی ہے۔

ساحر بہت ہی مقبول شاعر تھے — ساحر کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ایک بار ساحر کو دہلی جانا تھا، پدم شری ایوارڈ وصول کرنے کے لیے۔ حسبِ معمول وہ اپنی کار میں بیٹھے، اپنی والدہ اور بہن کے ساتھ جا رہے تھے کہ اک مقام پر اُن کی کار کو روک لیا گیا اور روکنے والے نے کہا:

''ساحر صاحب، آپ جانتے ہیں میں کون ہوں؟''

ساحر نے انکار میں سر ہلایا تو اُس نے کہا..... ''میں ڈاکو مان سنگھ ہوں جس کے پیچھے پوری حکومت کی مشینری لگی ہوئی ہے اور بڑے بڑے جس کے نام ہی سے کانپ اُٹھتے ہیں۔'' ظاہر ہے ساحر اور خواتین گھبرا گئے ہوں گے۔

مان سنگھ نے بڑے مہذب انداز میں کہا:

''ساحر جی، ہم آپ کے مداح ہیں۔ فلم 'مجھے جینے دو' ہم نے بیسیوں بار دیکھی ہے، فلم ہماری ہی زندگی کی کہانی ہے مگر آپ کے نغموں نے تو ہمیں دیوانہ کر رکھا ہے۔ ہمیں اطلاع تھی کہ آپ اس راستے سے گزر رہے ہیں، آپ سے ملنے کا کوئی اور ذریعہ نہیں تھا...... آپ بلا جھجک ہمارے ساتھ آئیں، کچھ دیر ہمارے مہمان رہیں، یہ خواتین بھی عزت آرام سے رہیں گی......''

ساحر نے بتایا تھا کہ ڈاکو مان سنگھ اتنا مہذب، اتنا شائستہ، اور ایسا خوش لباس تھا کہ اُسے دیکھ کر ڈاکو ماننے کو جی ہی نہیں چاہتا تھا...... ساحر اور اُن کی فیملی اُن کے ساتھ ہو لی۔ ڈاکوؤں کے ڈیرے پر جس طرح ساحر کا استقبال کیا گیا، ایسا کسی صدر یا بادشاہ کا نہ ہوا ہوگا۔ خواتین کو احترام سے ایک طرف بیٹھایا گیا۔ ساحر صاحب کے لیے ولایتی شراب اور رقص کی محفل جمی تھی اور مان سنگھ نے نہ صرف 'مجھے جینے دو' بلکہ ساحر کی دیگر کئی فلموں کے اَن گنت گیتوں کے ریکارڈ سنوائے...... بہت ادب سے ساحر سے بھی کلام سننے کی فرمائش کی گئی اور ساحر ڈاکوؤں کو انسان سمجھ کر اپنا کلام سناتے رہے۔

کیا ایسی مقبولیت اور ہر دل عزیزی کسی دوسرے فلمی نغمہ نگار شاعر کو نصیب ہوئی ہے۔ خواجہ احمد عباس، بہت تیکھے اور بے باک فلمی نقاد تھے۔ اُنھوں نے 'ٹریبیون' میں ساحر کی ہی زندگی میں ایک انگریزی مضمون میں لکھا کہ ساحر ہندو پاک کے مقبول ترین شاعر ہیں۔'

اداکارہ نرگس کو شاعری سننے کا بہت ہی ذوق و شوق تھا۔ وہ بچپن ہی سے فلمی ماحول میں کام کرتی رہی تھیں۔ اُن کی پرورش ہی ایسے ماحول میں ہوئی تھی کہ اُن کے بچپن میں ہی بڑے بڑے شاعر اُن کے گھر آتے تھے۔ اُن کی والدہ جدن بائی اکثر اپنے گھر پر شعری نشستیں کرواتی تھیں، جن میں جوش، جگر، ماہر القادری اور دیگر ممتاز شاعر جایا کرتے تھے۔ ایسی ہی ایک محفل میں بے بی نرگس نے جوش ملیح آبادی سے آٹوگراف مانگا۔ جوش نے آٹوگراف بک دیکھی تو اس میں جگر، ماہر وغیرہ کے نام بھی پڑھے ہوں گے۔ انھوں نے آٹوگراف دیا اور لکھا......

'آٹوگراف بک ایسا اصطبل ہے جس میں گھوڑے اور خچر ایک ساتھ بندھے ہوئے ہوتے ہیں۔'

ساحر لدھیانوی کو 1963 میں سب سے پہلے فلم 'تاج محل' کے نغموں کے لیے فلم فیئر ایوارڈ سے نوازا گیا اور دوسری بار 1976 میں فلم 'کبھی کبھی' کے لیے فلم فیئر ایوارڈ ملا۔ حکومت ہند کی طرف سے انھیں 1971 میں پدم شری سے نوازا گیا اور ان کے تیسرے شعری مجموعہ 'آؤ کہ کوئی خواب بُنیں' کے لیے 1972 میں سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ سے نوازا گیا۔

نرگس نے ساحر پر فلم فیئر میں انگریزی میں ایک مضمون لکھا جس میں ساحر کے 'پیاسا' کے گیتوں کی اتنی تعریف کی، اتنی تعریف کی کہ بے شمار لوگ حسرت سے جلنے لگے۔ نرگس نے اس فلم میں کام نہیں کیا تھا، مگر یہ اُس کی اعلیٰ ظرفی تھی کہ اُس نے فلم کی بھی تعریف کی اور گیتوں کے بارے میں لکھا کہ میں اُنھیں اب تک سیکڑوں بار سن چکی ہوں اور سیکڑوں بار سنتی رہوں گی۔

اپنے زمانے کے مقبول فلمساز وہدایتکار گرودت بھی ساحر کی شاعری سے بے حد متاثر تھے اور وہ اپنی فلموں کے نغمے ساحر سے ہی لکھواتے تھے۔ یہاں تک کہ انھوں نے اپنی مشہور زمانہ فلم 'پیاسا' میں ساحر کی زندگی کی جھلک بھی پیش کی اور نہ صرف یہ کہ اس فلم کے نغمے بہت مقبول ہوئے بلکہ یہ فلم گرودت کی زندگی کی کامیاب ترین فلم ثابت ہوئی۔ کافی عرصے بعد یش چوپڑا نے بھی اپنی فلم 'کبھی کبھی' میں ساحر کی زندگی کی عکاسی کی اور اس فلم کے نغمے بھی ساحر نے ہی تحریر کیے تھے۔ فلم 'کبھی کبھی' یش چوپڑا کی بے حد کامیاب فلموں میں سے ایک ہے۔

ساحر لدھیانوی کو 1963 میں سب سے پہلے فلم 'تاج محل' کے نغموں کے لیے فلم فیئر ایوارڈ سے نوازا گیا اور دوسری بار 1976 میں فلم 'کبھی کبھی' کے لیے فلم فیئر ایوارڈ ملا۔ حکومت ہند کی طرف سے انھیں 1971 میں پدم شری سے نوازا گیا اور ان کے تیسرے شعری مجموعہ 'آؤ کہ کوئی خواب بُنیں' کے لیے 1972 میں سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس کے بعد مہاراشٹر اردو اکیڈمی اور مہاراشٹر اسٹیٹ ایوارڈ سے بھی ان کو نوازا گیا۔

ساحر ایک نظم نگار کی حیثیت سے زیادہ شہرت رکھتے ہیں اور انھوں نے زیادہ تر نظمیں ہی لکھی ہیں، لیکن صنف غزل میں بھی ان کی اپنی انفرادیت نمایاں ہے اور وہ اس معروضے کی نفی کرتے ہیں کہ ایک نظم نگار شاعر اچھا غزل گو نہیں ہوسکتا۔ ساحر کو غزل گوئی سے فطری مناسبت بھی ہے، کیونکہ ان کی نظمیں بھی تغزل سے خالی نہیں ہوتیں۔

ساحر نے فلموں کے لیے جو گیت لکھے ہیں ان میں سے اکثر گیت عام فلمی گیتوں کی ڈگر سے ہٹے ہوئے ہیں۔ کہیں بھی یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہ فرمائشی گیت ہیں اور کسی داخلی تحریک کے بغیر موسیقار کی دی ہوئی دُھنوں پر لکھے گئے ہیں۔ ان میں شعریت کے ساتھ ساتھ جذبے واحساس کی شدت بھی پائی جاتی ہے۔

اپنی طرز کا یہ واحد اور مقبول ترین شاعر 25 اکتوبر 1980 کو سانجھ ڈھلے 57 برس کی قیدِ حیات سے نجات پاکر اور اپنے الفاظ کا جادو پوری آب وتاب کے ساتھ لوگوں کے دل ودماغ پر چلتا ہوا چھوڑ کر چُپ چاپ گہری اور ابدی نیند سوگیا...... کبھی نہ جاگنے کے لیے۔ مگر اس کی شاعری لوگوں کو ہمیشہ جگاتی رہے گی۔ خود ساحر کے الفاظ میں:

جسم کی موت کوئی موت نہیں ہوتی ہے
جسم مر جانے سے انسان نہیں مر جاتے ہیں
دھڑکنیں رکنے سے ارمان نہیں مر جاتے
ہونٹ جم جانے سے فرمان نہیں مر جاتے
جسم کی موت کوئی موت نہیں ہوتی ہے

■

Anees Amrohvi F - 5, 1st Floor, Jawahar Park (W), Laxmi Nagar, Delhi - 10092
Ph:011-22442572,9811612373

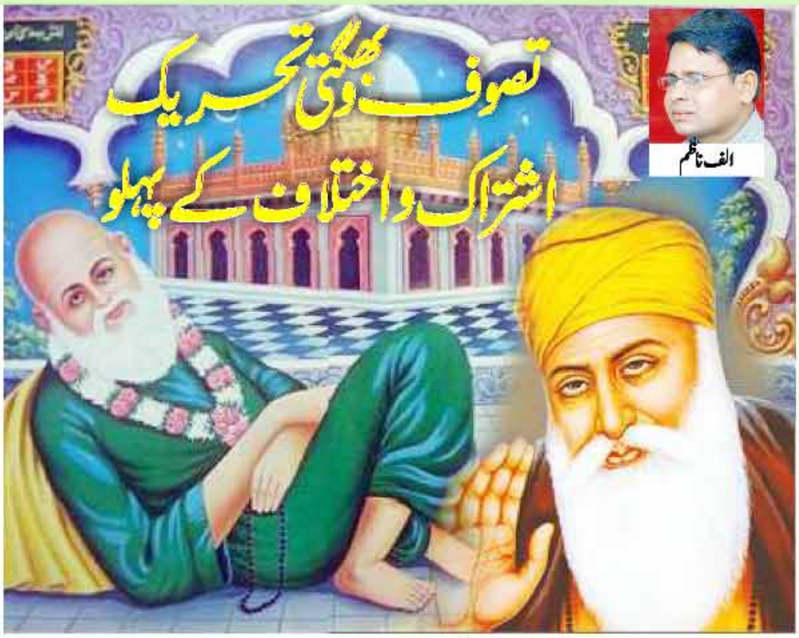

فلسفیانہ اور مذہبی پس منظر میں تصوف و بھگتی دو الگ الگ رجحان و رویہ معلوم ہوتے ہیں لیکن ذرا گہرائی میں جاکر ان کے باطنی افکار و اعمال کو دیکھیں تو ان میں ایک خاص طرح کی روحانی ہم آہنگی اور فکری وحدت کے نشانات واضح ہونے لگتے ہیں۔ یہ مماثلت نہ صرف افکار واقدار کی سطح پر نمایاں ہے بلکہ ان کے آغاز و ارتقا میں معاون، سماجی، سیاسی ونفسیاتی صورت حال میں بھی ایک خاص قسم کی ہم آہنگی دکھائی دیتی ہے۔

افکار و اقدار کی سطح پر دیکھیں تو صوفیا اور بھگت دونوں ہی اصولی اعتبار سے توحید پر زور دیتے ہیں، دنیا کے وجود کو حقیقی نہیں مانتے، اس بات کے قائل ہیں کہ کثرت دراصل وہم غیریت سے پیدا ہوتی ہے اور جب یہ وہم مٹ جاتا ہے تو کثرت میں وحدت کا جلوہ دکھائی دینے لگتا ہے۔ دونوں کسی نہ کسی حد تک فنا کے قائل ہیں اور تزکیۂ نفس اور نفس کشی کے ذریعے کسی ایسی منزل تک پہنچنا چاہتے ہیں جہاں خواہش اور احساسات مطیع ہوجائیں اور عارف اس مقام تک پہنچ جائے جہاں اسے اپنی ذات، ذاتِ مطلق سے الگ معلوم نہ ہو۔ علم سے زیادہ وجدان اور منطق سے زیادہ کشف و تجربہ سے معرفت حاصل ہوتی ہے۔ دونوں ہی عمل فی سبیل اللہ کے قائل ہیں اور عام محسوسات کو حجاب سمجھتے ہیں۔ دونوں کا رجحان انبساط کامل کے لیے ترکِ لذّت بلکہ کسی قدر جبر و قنوت کی طرف ہے، شاہانِ وقت سے ایک خاص قسم کا فاصلہ رکھنا پسند کرتے ہیں اور اپنے افکار وخیالات کی ترسیل کا ذریعہ مقامی بولیوں کو بناتے ہیں۔ مذہب کی ظاہر پرستی و تنگ نظری پر سخت تنقید کرتے ہیں۔ انسان دوستی پر زور دیتے ہوئے مذہب و ملت سے ماورا ہوکر مساوات پر مبنی سماجی نظام قائم کرنے کی وکالت کرتے ہیں اور ان سب سے بڑھ کر ان کے مشترکہ اعمال وافعال کا ہی نتیجہ ہے کہ ہندوستان میں حقیقی معنوں میں سیکولر ذہن وفکر کو عوام میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ دونوں تحریکوں میں اشتراک کی نوعیت اس حد تک ہے کہ بعض اوقات یہ فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کون صوفی ہے اور کون بھگت۔ مثلاً کبیر کے متعلق علی سردار جعفری کا یہ قول ملاحظہ فرمائیں:

"کبیر داس ایک مسلمان صوفی تھے جو ہندو بھگتی کی زبان میں بات کر رہے تھے۔"1

یا پھر علامہ اقبال کا یہ قول ملاحظہ فرمائیں:

"مسلمانوں و ہندوؤں کی تاریخ میں ایک عجیب و غریب ذہنی مماثلت ہے۔ جس نقطۂ خیال سے سری شنکر نے گیتا کی تفسیر کی اسی نقطۂ خیال سے شیخ محی الدین ابنِ عربی اندلسی نے قرآن شریف کی تفسیر کی۔"2

صوفیوں اور بھگتوں کی مشترکہ کاوشوں پر شمیم طارق لکھتے ہیں:

"بھگتی کے انتر گیان و سیرت کے عرفان اور احسان کے معنی میں تصوف کے باطنی احساس و وجدان میں قدر مشترک کی تلاش یا ان تینوں کو ایک ہی بحر عقیدہ کے تین مختلف لہروں کا سنگم سمجھنے والوں نے رام اور رحیم کی ہم رنگی پر اصرار کرتے ہوئے ایک ایسے مذہب دل کی طرف توجہ دلائی ہے جو مذہب کی تفریق کو ختم کر کے انسانی وحدت کو ٹکڑیوں میں تقسیم ہونے سے بچائے اور رسوم وقیود کے بجائے مشاہدات ومعرفت پر توجہ دے تاکہ درمیان کا پردہ اور درمیانی شخص (ملا، پروہت، پادری وغیرہ) ہٹے اور مالک کون ومکاں اپنے عیال (الخلق عیال اللہ) کے دلوں تک بغیر کسی توسط کے پہنچ جائے۔"3

خالص سماجی و سیاسی پس منظر میں صوفیوں اور بھگتوں کے افکار وخیالات کا جائزہ لینے پر پتہ چلتا ہے کہ دونوں اپنے جیسوں کی غلامی، خصوصاً بادشاہوں، امیروں اور جاگیرداروں کی اطاعت سے بے نیاز ہوکر جسمانی محنت و مشقت سے روزی کمانے، تھوڑے پر قناعت کرتے ہوئے صبر وشکر کی زندگی گزارنے اور دنیا میں رہتے ہوئے علائق دنیا سے پاک رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ خاک نشینی اور فقر و استغنا جو صوفیوں کا محبوب موضوع رہا ہے، بھگتوں نے بھی اسے خوب فروغ دیا۔ کمبھن داس کی یہ چوپائی اسی خیال کی خوبصورت ترجمانی کرتی ہے۔

سنتن کو کہاں سیکری (راج دربار) سوں کام
آوت جات پنہیاں (جوتی) ٹوٹی، بسری گیوہری نام
جن کو دیکھے دکھ اپجت تنکو کرپے پری سلام
کمبھن داس لال گردھر بنو (بغیر) اور سبے بے کام

علامہ اقبال نے جن بنیادوں پر تصوف کو اپنی تنقید کا ہدف بنایا وہ ہیں اس میں مضمر یاس و مایوسی، کنارہ کشی، زندگی سے فرار اور بے عملی کو ترغیب دینے والے تصورات۔ بھگتی کے متعلق بھی ناقدین کچھ ایسا ہی خیال رکھتے ہیں۔ بقول محمد حسن:

"بھگتی نے حالات کے مقابلے کی دعوت نہیں دی۔ اس نے طاقت سے مخالف قوتوں کو للکارنے کی ہمت نہیں بخشی۔ ہاں ان حالات اور مصائب کو برداشت کرنے کی طاقت اور حوصلہ ضرور دیا۔ یہ ایک طریقے پر روحانی گریز اور فرار کی تحریک تھی جو حالات کا مقابلہ کرنا نہیں سکھاتی تھی۔ ان کے باوجود زندہ رہنے اور خود کو آسودہ اور مطمئن رہنے کا گر ضرور بتاتی تھی۔ اس نے مایوسی کی طرف فلسفیانہ رُخ اختیار کیا اور مصیبتوں کو بہت ہلکا کردیا۔ باطنی آسودگی پر زور دیا اور عقیدت اور اعتقاد کی نئی شمع روشن کی۔"4

ملوک داس اور کبیر کے درج ذیل اشعار تو گویا ان تصورات کے لیے سند کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اجگر کرے نہ چاکری پنچھی کرے نہ کام
داس ملوکا کہہ گئے سب کے داتا رام

ہمن ہے عشق مستانہ ہمن کو ہوشیاری کیا
رہیں آزادیاں جگ سے ہمن دنیا سے یاری کیا

تصوف و بھگتی کے مشترکہ افکار و اقدار پر نظر ڈالیں تو ان میں جو سب سے قوی نظریہ دکھائی دیتا ہے وہ ہے خدا سے عشق یا پریم کا نظریہ۔ واضح رہے جہاں عموماً مذہب کی بنیاد خوفِ خدا، خوفِ جہنم، قیامت کا خوف اور روزِ محشر کا خوف جیسے نظریوں پر استوار ہے وہاں خدا سے محبت، اس سے وصال کا جذبہ، اس سے روٹھنے اور منانے کا خیال تصوف و بھگتی کی مشترکہ دین ہے۔ صوفیوں کی شاعری میں لفظ عشق کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ بھگتوں نے بھی خواہ وہ سگن وادی ہوں یا نرگن وادی، پریم کو ہی نروان کا واحد ذریعہ قرار دیا ہے۔ بلبھ چاریہ جو سگن بھگتی (کرشن) کے بانیوں میں تھے، نے پریم ہی کو حاصلِ زندگی قرار دیا۔ بقول محمد حسن "ان کے نزدیک عقیدت اور پوجا سے زیادہ اہمیت "محبت" کی ہے۔"[5]

یہ دراصل بھگتی اور تصوف کی مشترکہ روایت ہی ہے جس نے ہندستان میں حقیقی معنوں میں سیکولر ذہن کو پیدا کیا۔ ایک طرف جہاں متعدد صوفیا کرام نے رادھا بن کر کرشن کے پریم میں برہا کے گیت گائے ہیں وہیں بھگتوں نے اسلامی افکار و خیالات اور اسلامیات پر مبنی سماجی نظام کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا۔ مسلمان شعرا نے ہندو تہذیب کو اپنی شاعری میں جگہ دی۔ صوفیوں میں کرشن بھگتی کا یہ سلسلہ قطبن سے شروع ہو کر ملک محمد جائسی، عثمان، قاسم شاہ، نور محمد، شاہ برکت اللہ، رس کھان وغیرہ سے ہوتا ہوا دورِ جدید کے شاعر حسرت موہانی سے جا ملتا ہے۔ حسرت موہانی ایک صاحبِ طرز غزل گو شاعر، بے باک صحافی، صوفی اور مجاہدِ آزادی کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ کرشن سے اپنی عقیدت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

"حضرت شری کرشن علیہ الرحمہ کے باب میں فقیر اپنے پیر اور پیروں کے پیر حضرت سید عبدالرزاق ہانسوی قدس اللہ سرہ کے مسلکِ عاشقی کا پیرو ہے۔"[6]

کرشن کو اپنی شاعری میں بھی حسرت یاد کرتے ہیں:

من تو سے پریت لگائی کنہائی
کاہو اور کی سرت اب کاہے کا آئی
گوکل ڈھونڈا برندابن ڈھونڈا
برسا نے لگ گھوم کے آئی
تن من دھن سب ہار کے حسرت
متھرا نگر چل دھونی رمائی

کچھ ایسا ہی رویہ ان سگن وادی بھگتوں کا بھی رہا ہے جنھوں نے کرشن اور رام کو اپنے عشق کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ اس سلسلے میں محمد حسن رقمطراز ہیں:

"وہ (بھگتی) صرف رام چندر جی اور کرشن کو دیوتاؤں کی طرح دور سے پوجتی نہیں بلکہ انھیں اپنی روزمرہ زندگی میں اپنے افسانوں کے کرداروں اور عظیم انسانوں کی طرح شامل کر لیتی ہے.... بھگتی تحریک ایک ایسے خدا کا تصور پیش کرتی ہے جو انسانوں سے با وقار دوری اور فاصلہ قائم رکھنے کے بجائے ان ہی میں شامل ہوتا ہے۔ ان سے محبت کرتا ہے، ان کی زندگی کا ایک جز بن جاتا ہے۔ بھگتی تحریک مذہب میں اقرار باللسان اور رسوم و عبادات کی ادائگی سے زیادہ عقیدت اور عشقِ خداوندی پر زور دیتی ہے۔"[7]

حالانکہ یہ سچ ہے کہ سگن و نرگن وادیوں میں عشق کے اظہار کے طریقوں پر سخت اختلافات پائے جاتے ہیں اور دونوں ایک دوسرے پر جہاں ممکن ہو تنقید کرنے سے باز نہیں آتے ہیں۔ مثلاً:

دسرتھ سُت سب لوک بکھانا، رام نام کا مرم ہے آنا

دوسری طرف سگن وادی، نرگن وادیوں سے پرے جا کر کہتے ہیں:

سرگن کی سیوا کروں نرگن کو کر گیان
نرگن سرگن سے پرے تہیں ہمارا دھیان

یہاں سگن و نرگن اور تصورِ عشق حقیقی و عشق مجازی میں جو باطنی ربط ہے وہ توجہ طلب ہے۔ کبیر اور تلسی کی طرح ولی بھی محض عشق بازی کو سب سے بہتر شغل قرار دیتے ہیں، خواہ وہ حقیقی ہو یا مجازی:

شغل بہتر ہے عشق بازی کا
کیا حقیقی کا کیا مجازی کا

اسی طرح 'دویت واد' اور 'ادویت واد' اور وحدت الوجود و وحدت الشہود بھی ایسے تصورات ہیں جن میں بہت حد تک مماثلتیں پائی جاتی ہیں۔ ایک اور تصور جو بھگتی میں خاصا مشترک ہے وہ ہے گرو ششیہ اور مرشد و مرید کا رشتہ۔ دونوں ہی فلسفوں میں گرو یا مرشد کو خدا کے بعد سب سے اہم مقام عطا کیا گیا ہے۔ بھگتی شاعری میں اس کا اظہار کہیں زیادہ شدت کے ساتھ کیا گیا ہے تبھی تو کبیر کہتے ہیں:

بلہاری گرو آپنے گھڑ گھڑ سو سو بار
مانس سے دیوتا کیا کرت نہ لاگی یار

صوفیوں کا بھی مشہور قول ہے:

"من لا شیخ لہ فشیخہ الشیطان" (جس کا کوئی پیر نہیں اس کا پیر شیطان ہے)

باہمی اثرات کی بنا پر دیکھیں تو صوفیوں کے مختلف فرقوں میں یوگ، دھیان (مراقبہ)، کنڈلی جاگرن (لطائف)، پرانیام (حبسِ دم)، جپ (ورد)، سمادھی (ارتکاز)، بھجن، کیرتن و نرتیہ (رقص و موسیقی)، ست سنگ (سماع)، سلوک کے اشغال و یوگک کریاؤں اور ذکر کی مختلف منزلوں میں بہت سی مماثلتیں تلاش کی جا سکتی ہیں۔ ساتھ ہی بجریانی سدھوں، کپالک تانترکوں، ناتھ پنتھیوں اور تصوف کے فرقہ ملامتیہ کے افکار و اعمال میں پائی جانے والی مماثلتیں بھی توجہ طلب ہیں۔ یہاں تصوف کے متعلق میکش اکبر آبادی اور بھگتی تحریک کے متعلق پروفیسر پرشوتم اگروال کے خیالات کے اقتباسات دلچسپی سے خالی نہ ہوں گے۔

"تصوف رسم پرستی، ظاہر بینی اور دین کے دعوے داروں اور ان کے زیرِ اثر حکومتوں کے استبداد و استحصال کے خلاف ایک باغیانہ تحریک ہے۔"[8]

"تاریخی نقطۂ نظر سے بھگتی تحریک جاگیردارانہ سختی اور مذہبی استحصال کے خلاف عوامی وقار کی تحریک تھی۔"[9]

اشتراک کے ان تمام پہلوؤں کے باوجود ان میں کچھ بنیادی اختلافات بھی ہیں جن میں کچھ کی نوعیت آپسی قسم کی ہے جو ان کے مختلف فرقوں کے درمیان زیرِ بحث ہیں۔ ان میں خصوصاً آتما سے پرماتما کا ملن (جمع)، نروان (عرفان)، آواگمن (تناسخ)، اوتار (رسول)، سگن وادیوں کا نظریہ اجسام، الوہیت اور ایسے ہی چند دیگر تصورات و اعمال ہیں، جن میں باہمی اختلافات کے پہلو تحقیق طلب ہیں۔

حواشی:

1. بحوالہ شمیم طارق، صوفیا کا بھگتی راگ، مضمون مطبوعہ ماہ نامہ کتاب نما، نئی دہلی، 2003، ص 33
2. بحوالہ محمد شریف بقا، دیباچہ مثنوی اسرار خودی، لاہور، اشاعت اول، 1915، ص 12
3. شمیم طارق، تصوف اور بھگتی کی گمشدہ شعری روایت، مضمون مطبوعہ ماہ نامہ آجکل دہلی، اگست 2002، ص 44
4. محمد حسن، ہندی ادب کی تاریخ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 1983 ص 54
5. ایضاً ص 123
6. بحوالہ شمیم طارق، تصوف اور بھگتی کی گمشدہ شعری روایت، مضمون مطبوعہ ماہنامہ آجکل، دہلی اگست 2002 ص، 41
7. محمد حسن، ہندی ادب کی تاریخ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 1983، ص 55
8. میکش اکبر آبادی، مسائل تصوف، انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی، 2000، ص 48
9. پروفیسر پرشوتم اگروال، کبیر کی بھگتی کا سماجک ارتھ (ہندی)، وانی پرکاشن، دہلی، 1995، پیش لفظ سے

■

Dr. Alif Nazim Aman Gate, Abu Bakar Nagar,
Deoria - 274001 (UP)

عبدالناصر فاروقی

پپیتا

طبی افادیت سے بھرپور ایک خوش ذائقہ پھل

پپیتا جسے انگریزی میں پپایا (Papaya) اور Tree melon اور نباتی زبان میں Carica papaya کہتے ہیں، ایک لمبوتری شکل کا سبز زردی مائل یا نارنجی زردی مائل پھل ہے جو ایک درخت نما بڑے پودے سے حاصل کیا جاتا ہے۔ اس کا وزن بعض اوقات ڈھائی کلو تک کا ہوتا ہے۔ یہ خوش ذائقہ ہوتا ہے لیکن اس میں معمولی سی کڑواہٹ بھی پائی جاتی ہے۔ ایسے گرم مقامات جہاں پر رطوبت زیادہ پائی جاتی ہے یہ پھل بکثرت پیدا ہوتا ہے۔ میکسکو، وسطی امریکہ، تھائی لینڈ، افریقہ اور ایشیائی ممالک اور آسٹریلیا میں اس کی اچھی پیداوار ہوتی ہے۔ اسے Paw Paw اور Papaw جیسے الفاظ سے بھی جانا جاتا ہے۔ یہ پھل زمانہ قدیم سے استعمال میں آرہا ہے اور اسے روزمرہ کی زندگی میں دوا کے طور پر بھی مقبولیت حاصل ہے۔ بعض قبائلی لوگ اس کے درخت کی پرستش بھی کرتے ہیں۔ اسے شجر حیات(Tree of life) کے نام سے بھی موسوم کرتے ہیں۔ امریکہ دریافت کرنے والے کرسٹوفر کولمبس (1451-1506) کا یہ ایک پسندیدہ پھل تھا۔ اس نے اسے فرشتوں کا پھل قرار دیا تھا۔ اس کے بارے میں یہ حکایت مشہور ہے کہ جب وہ بحری جہاز کے طویل سفر کے بعد اپنے عملہ کے ساتھ امریکہ کی زمین پر اترا تو وہاں کے باشندوں نے والہانہ انداز میں اس کا استقبال کیا اور اس کے اعزاز میں ایک پرتکلف دعوت کا انتظام کیا۔ غیر محتاط طریقے سے غذا کھانے کی وجہ سے ان لوگوں کا پیٹ خراب ہوگیا اور بدہضمی لاحق ہوگئی تو وہاں کے باشندے جنگل سے پپیتا کو لائے اور اسے استعمال کرایا جس کے نتیجے میں وہ لوگ اپنے مرض سے نجات پاگئے۔

پپیتا دراصل اسپینی زبان کا لفظ ہے اور اسی نام سے یہ پھل ہندوستان میں مشہور ہوگیا ہے۔ اسے پورے سال بازار سے دستیاب کیا جاسکتا ہے، لیکن گرمی کے اوائل میں یہ اپنے شباب پر پایا جاتا ہے۔ پپیتا کے درخت میں پورے سال پھل آتے ہیں جو بیضوی یا ناشپاتی کی شکل کے ہوتے ہیں۔ بازار میں جو پھل پایا جاتا ہے وہ اوسطاً 20 انچ تک لمبا ہوسکتا ہے۔ اس کا گودا سنترے کے رنگ کا ہوتا ہے۔ پھل کے اندرونی حصے میں چھوٹے چھوٹے سیاہی مائل گول بیج پائے جاتے ہیں جن پر چپچپے مادے لگے ہوتے ہیں۔ پپیتا کے بیجوں کو کھایا بھی جاسکتا ہے لیکن ان میں سیاہ مرچ جیسی تلخی پائی جاتی ہے۔ بیج میں بو نہیں آتی۔ پھل کے تمام اجزا کڑوے ہوتے ہیں۔ اطبا نے بیج کا مزاج گرم خشک درجہ سوم اور بعض نے چہارم بتایا ہے۔ پپیتا چونکہ ذائقہ دار پھل ہے اس لیے لوگ اسے اپنی غذا کے ساتھ سلاد کے طور پر بکثرت استعمال کرتے ہیں۔

پپیتا کے درخت کا ہر حصہ چاہے وہ پھل ہوں، پتے ہوں یا بیج سبھی میں دوائی خصوصیات والے اجزا پائے جاتے ہیں۔ 100 گرام پپیتا میں مندرجہ ذیل غذائی عناصر پائے گئے ہیں:

توانائی	163 کلوجول
کیلوری	39 کلو
شکر	5-90
کاربوہائیڈریٹ	9.81 گرام
غذائی ریشے	1.8 گرام

چکنائی	0.14 گرام
پروٹین	0.61 گرام
وٹامن اے	328 مائیکروگرام (41%)
وٹامن بی 1	0.04 ملی گرام (3%)
وٹامن بی 2	0.05 ملی گرام (4%)
وٹامن بی 3	0.338 ملی گرام
وٹامن بی 4	0.1 ملی گرام
وٹامن بی 9	35 ملی گرام
وٹامن سی	61.8 ملی گرام
کیلشیم	24 ملی گرام
آئرن	0.10 ملی گرام
میگنیشیم	10 ملی گرام
فاسفورس	5 ملی گرام
پوٹاشیم	25 ملی گرام
سوڈیم	3 ملی گرام

تازہ پپیتے کے گودے میں سکروز، انورٹ شوگر، ریزن، پے پین، میلک ایسڈ، ٹارٹیرک ایسڈ اور سائٹرک ایسڈ بھی پائے جاتے ہیں۔ کچے اور پکے پپیتے دونوں میں Pectine کی وافر مقدار پائی جاتی ہے، اس کے علاوہ کیلشیم، وٹامن اے اور سی کی کثیر مقدار اور وٹامن بی کی قلیل مقدار بھی پائی جاتی ہے۔ پپیتے کے پھل اور بیجوں میں مانع جراثیم بھی پائے جاتے ہیں جو Staphylococcus aureus، Bacillus cereum، Escherichia Coli، Pseudomonas aeroginosa اور Shigella flexnem کے خلاف بہت اچھا اثر رکھتے ہیں۔

پپیتے کے طبی فوائد

(1) پپیتے کو جلدی امراض خاص طور پر مہاسوں اور جلدی تعدیوں کو روکنے کے لیے بطور کریم استعمال کیا جاتا ہے کیونکہ اس کے استعمال سے جلد کے بند مسامات کھل جاتے ہیں۔ Papain کی موجودگی کی وجہ سے مردہ خلیات تحلیل ہوجاتے ہیں جس سے جلد میں چمک اور تازگی پیدا ہوجاتی ہے۔ یہ زخموں کے اندمال میں بہترین کام کرتا ہے۔

(2) اس کے پھل میں ریشے دار اجزا کافی مقدار میں موجود ہوتے ہیں جو کولسٹرال کو کم کرنے میں مدد کرتے ہیں۔ اس میں موجود خامرات کولسٹرال کے آکسائیڈ بننے کے عمل کو روکتے ہیں۔ اس کی وجہ سے ہارٹ اٹیک اور دیگر امراض قلب تیز ذیابیطس سے حفاظت ہوجاتی ہے۔

(3) پپیتے میں پائے جانے والے مانع تکسید مادے قبل از وقت لاحق ہونے والے بڑھاپے کو روکتے ہیں۔ اس کے باقاعدہ استعمال سے آدمی جوان نظر آتا ہے۔

(4) پپیتے کے بیج کے استعمال سے آنتوں میں پائے جانے والے کیڑے ہلاک ہوجاتے ہیں۔

(5) پپیتے میں پایا جانے والا خامرہ Papain ہاضمہ میں مدد کرتا ہے اور قبض کو روکتا ہے۔

(6) پپیتے کے عرق کو باقاعدگی سے استعمال کرنے پر بڑی آنت میں موجود انفکشن دور ہوجاتا ہے کیونکہ مواد اور خلط کی صفائی ہوجاتی ہے۔

(7) اس میں کیلوری کی مقدار کم لیکن غذائیت زیادہ پائی جاتی ہے اس لیے جو لوگ موٹاپے سے پریشان ہیں انھیں باقاعدگی سے اس کو استعمال کرنا چاہیے۔

(8) پپیتے میں Carpain نام کا انزائم پایا جاتا ہے، جو قلب کے لیے بہت فائدہ مند ہے۔

(9) پپیتے میں Arginine بھی پایا جاتا ہے جو مردانہ بارآوری (Male fertility) کے لیے بہت ضروری ہے۔

(10) پپیتے میں چونکہ Bromelain بھی پایا جاتا ہے اس لیے اس کے خواص انناس کی طرح ہوجاتے ہیں، چنانچہ اس سے بدہضمی اور ناک و ہوائی خانوں کے اورام کو، جو سرجری کے بعد یا چوٹ لگنے کی وجہ سے لاحق ہوتے ہیں، دور کرنے میں بہت مدد ملتی ہے۔

(11) پپیتے میں Lycopene نام کا مانع تکسید مادہ بھی وافر مقدار میں پایا جاتا ہے جو پراسٹیٹ کینسر کو روکنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔

(12) پپیتے میں چونکہ کیلشیم بھی خوب پایا جاتا ہے اس لیے یہ ہڈیوں کو مضبوط بناتا ہے۔

(13) پپیتے میں موجود وٹامن سی، کیروٹین اور وٹامن ای جسم میں کینسر کے خلیات کی پیدائش کو روکتے ہیں۔

(14) پپیتے میں نشو و نما پانے والے بچوں کے لیے بھی ضروری اجزا پائے جاتے ہیں۔

(15) پپیتے کے رس کے باقاعدہ استعمال سے قولون نامی آنت میں موجود انفکشن ختم ہوجاتا ہے اور اس میں موجود مواد اور خلط کی صفائی ہوجاتی ہے۔

(16) ماہرین نے لنگور بندروں پر اس کے مانع حمل اثرات کی تحقیق کی ہے اور یہ پایا ہے کہ اس کا یہی اثر نوجوان مردوں پر بھی ہوتا ہے۔

(17) حاملہ عورتیں اگر روزانہ پپیتا استعمال کریں تو انھیں متلی و قے سے نجات مل جاتی ہے۔

(18) پپیتے میں دافع ورم خامرہ بھی پایا جاتا ہے اس لیے جن لوگوں کو جوڑوں کا ورم و درد لاحق ہوتا ہے انھیں آرام مل جاتا ہے۔ اس کے علاوہ تخلخل عظام (Osteoporosis) میں بھی مفید ہے۔

(19) چونکہ پپیتے میں وٹامن اے اور سی کی وافر مقدار پائی جاتی ہے اس لیے اس کے باقاعدہ استعمال سے جسم کی قوت مدافعت میں اضافہ ہوجاتا ہے جس سے نزلہ زکام اور بخار جیسی شکایات لاحق نہیں ہوتیں۔

(20) جن شیمپو میں پپیتا بھی شامل ہوتا ہے ان شیمپو کو استعمال کرنے سے سر کی خشکی دور ہوجاتی ہے۔

(21) عورتوں میں حیض کی دشواریاں بھی اس کے استعمال سے جاتی رہتی ہیں، حیض باقاعدگی سے آتا ہے اور درد حیض سے نجات مل جاتی ہے۔

(23) پپیتا جگر کے سرطان میں بھی بہت مفید ہے کیونکہ اس کے اندر ایسے اجزا بھی پائے جاتے ہیں جن کی مدد سے جگر کے سرطان کی نشو و نما رک جاتی ہے۔

(23) پپیتا گردوں کو زہروں کے اثر سے پاک کرتا ہے۔ اگر ناپختہ پپیتا کے پھل کے بیجوں کا آبی محلول اور عصارہ استعمال کیا جائے تو وہ مانع تکسید ثابت ہوتا ہے اور نقصان دہ مادوں سے گردوں کی صفائی کرتا ہے۔

(24) محققین نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ اس کا جوس جو برگ پپیتا سے حاصل کیا گیا ہو، ڈینگو بخار کو روکنے میں مدد کرتا ہے کیونکہ اس سے پلیٹ لیٹ کی مقدار میں اضافہ ہوجاتا ہے۔

(25) چونکہ اس میں وٹامن اے کی مناسب مقدار بھی پائی جاتی ہے اس لیے سگریٹ نوشی کرنے والے افراد میں نفاخ الریہ (Emphysema) لاحق ہونے کا خطرہ کم ہوجاتا ہے۔

(26) پپیتے کے پتوں اور پوست کے عصارہ کو مسوڑھوں کے امراض اور دانتوں کے درد میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

(27) پپیتے میں چونکہ Phytochemicals جیسے لیوٹین، کرپٹوزینتھن اور زی زینتھن وغیرہ بھی پائے جاتے ہیں جن سے آنکھ کی روشنی پر بہت اچھا اثر پڑتا ہے خاص طور پر ضعیف العمر اشخاص میں Macular degeneration سے حفاظت ہوجاتی ہے۔ تحقیق سے یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ جو عورتیں ان کیمیائی مادوں کو زیادہ استعمال کرتی ہیں ان میں HPV اور عنق الرحم کے سرطان پیدا کرنے والے وائرس کا تعدیہ کم واقع ہوتا ہے۔ وہ عورتیں جو روزانہ کم از کم ایک پپیتا استعمال کرتی ہیں ان میں HPV کے تعدیہ کے امکانات بہت کم ہوجاتے ہیں۔ پپیتے کا عرق عضلات کے انحطاط میں بھی مفید ثابت

ہوا ہے۔

(28) روسی سائنسدانوں نے اپنی تحقیق سے یہ معلوم کیا ہے کہ پپیتے میں پائے جانے والے مانع تکسید مادوں اور قدرتی خامرات کی موجودگی کی وجہ سے زخموں اور جلے ہوئے زخموں کے اندمال کی رفتار بڑھ جاتی ہے۔ جب چوہوں کو انکی اور بیدی گئیں جن میں پپیتا بھی شامل تھا تو ان کے جسم پر موجود زخم اپنی حجم میں آدھے سے بھی کم رہ گئے ان چوہوں کے مقابلے میں جن میں یہ علاج نہیں کیا گیا تھا۔

(29) ماہرین کے مطابق اس پھل میں اینٹی کینسر خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ محققین نے افزودہ رسولیوں کے خلاف پپیتے کی سرطان کش خصوصیات کے بارے میں دستاویز جمع کی ہیں۔ ان میں رحم، چھاتی، جگر، پھیپھڑے اور لبلبے کے سرطان کے ذریعے خلیات سے بننے والی رسولیاں بھی شامل تھیں۔ اس سلسلے میں پپیتے کے خشک پتوں کو جوش دے کر حاصل شدہ عرق کو سرطانی خلیات پر ڈالا گیا جس سے رسولی کو ختم کرنے والے سالموں کی پیداوار بڑھ گئی تھی اور جسم کے مدافعاتی نظام کی مدد سے ٹیومر کا انسداد ممکن ہو گیا تھا۔ کینسر کے علاج میں چونکہ ریڈیو تھراپی اور کیموتھراپی کا سہارا لیا جاتا ہے، اس لیے بعض اوقات مریضوں میں مضر اثرات کے طور پر منہ میں زخم اور نگلنے میں دشواری جیسے عارضے لاحق ہو جاتے ہیں۔ انھیں دور کرنے کے لیے ماہرین پپیتے میں پائے جانے والے خامرہ Papain پر تحقیق کر رہے ہیں جس سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ Papain کے استعمال سے نہ صرف ان عارضے میں فائدہ ہوتا ہے بلکہ جسم کی قوت مدافعت بھی قوی ہو جاتی ہے جس سے کینسر کے خلاف تحفظ فراہم ہو جاتا ہے۔

(30) Papain کے اندر ایک خصوصیت یہ بھی پائی جاتی ہے کہ وہ زندہ خلیات کو نقصان پہنچائے بغیر مردہ ساختوں کو تحلیل کرتا ہے۔ امریکہ کے بعض دواخانوں میں ایک مرہم دستیاب ہے جس میں ایک گرام Papain اور 100 ملی گرام یوریا موجود ہوتا ہے۔ یہ مردہ ساختوں کی صفائی کرکے مردار حصے کو رقیق بنا دیتا ہے جس سے جلد یا دیر میں بھرنے والے پریشر السر ٹھیک ہونے لگتے ہیں۔ پریشر السر کا ایک عمدہ گھریلو علاج یہ بھی ہے کہ پپیتا کے کچے پھل سے نکلنے والے دودھ میں پھاہا بھگو کر دن میں دو تین بار پٹی کرنے سے وہ بہت جلد مندمل ہو جاتے ہیں۔ کاہو پے چین زخموں کو بھرنے اور انھیں ٹھیک کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

(31) حکیم نجم الغنی خاں (وفات 1932) اس کے خواص و فوائد کے بارے میں تحریر کرتے ہیں کہ سرد اور بلغمی ہیضہ جس کے ساتھ قے اور دست ہو اس کا عرق پینے سے جاتا رہتا ہے۔ کیسی بھی سخت قے آتی ہو خواہ ہیضہ ہو یا نہ ہو، اس کے پینے سے بند ہو جاتی ہے۔ اگر گلاب کے ہمراہ پئیں کر دی جائے تو قے اور دست فوراً بند ہو جاتے ہیں اور معدہ کے درد اور ہچکی کو بھی نفع دیتا ہے۔ ایلاؤس کے لیے بھی مفید ہے اور فالج کو بھی فائدہ دیتا ہے۔ اگر کسی کو غشی اور بے ہوشی ہو تو اس کے دانت کسی چیز سے کھول کر اس کو گھس کر پلائیں۔ سانپ اور زہریلے کیڑے مکوڑوں کے زہر کو نفع ہو جاتا ہے۔ زہروں کا تریاق ہے۔ اگر زخم کا خون بند نہ ہوتا ہو اس کو پیس کر چھڑکیں۔ تپ لرزہ کی نوبت سے قبل چار گیہوں کے دانے کے برابر پانی میں پیس کر پینے سے تپ لرزہ دور ہو جاتا ہے اور ولادت میں دشواری کے وقت بھی اتنی ہی مقدار میں کھلانے سے فائدہ ہوتا ہے۔ اگر اس کو منہ میں رکھیں تو سینہ سے بلغم کو چھانٹا ہے اور نزلات کو دور کرتا ہے۔ اگر اس کو ورق ورق کرکے تل کے تیل میں جلا کر خارش اور آتشک کے زخموں پر ملیں تو فائدہ ہوتا ہے۔ اگر کسی نے زہر کھایا ہو تو اس کے روغن کو منہ میں ٹپکا ئیں۔ اگر کسی کے ہاتھ پاؤں فالج کی وجہ سے شل ہو گئے ہوں تو اس کے روغن کا ملنا مفید ہے۔ خون حیض بند ہو جانے پر 8 گیہوں بھر کی مقدار میں گھس کر پلانے سے خون حیض جاری ہو جاتا ہے۔ اگر گھنگھیرہ وغیرہ بدن پر چٹ جائے اور اس میں سوزش ہو تو اس کو پیس کر اس جگہ لیپ کرنے سے صحت ہو جاتی ہے۔ ریاح اور گٹھیا کو بھی نافع ہے۔ تقویت باہ کے لیے اس کی ترکیب بہت موثر ہے کہ 25 دانوں کو ریزہ ریزہ کرکے شراب میں ڈال کر 15 روز گرمی میں رکھیں۔ ہر روز شام کے وقت اس میں سے ایک ماشہ کھالیا کریں۔ اگر اسے پانی میں گھس کر رسولی پر لیپ کریں تو وہ تحلیل ہو جاتی ہے۔ پپیتا جب خام حالت میں ہوتا ہے تو اس سے ایک قسم کی رطوبت کا اخراج ہوتا ہے جس سے بعض لوگوں کو الرجی ہوتی ہے اور وہ خراش آور ثابت ہوتا ہے۔ پپیتے کے زیادہ استعمال سے Carotenaemia نام کی بیماری لاحق ہو جاتی ہے جس میں ہتھیلیاں، تلوے، ناک اور ہونٹوں کے کناروں پر زردی آجاتی ہے۔ بعض لوگ اسے غلطی سے یرقان سمجھتے ہیں حالانکہ یہ بے ضرر نقصان دہ حالت ہے جو پپیتے میں پائے جانے والے مادے Carotene سے پیدا ہو جاتی ہے۔

مذکورہ بالا بیان سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ پپیتا خوش ذائقہ اور لذیذ پھل ہونے کے ساتھ ہی طبی تاثیرات کا حامل ایک کثیر المقاصد قدرتی عطیہ ہے جسے باقاعدگی سے اگر مناسب مقدار میں استعمال کیا جائے تو اس سے ہم اپنی جسمانی قوت مدافعت میں اضافہ کرکے اپنے آپ کو مختلف قسم کی بیماریوں سے محفوظ رکھ سکتے ہیں۔

■

Dr. Abdus Nasir Farooqui Glory Apts. R-Z 2001-B/24, Tughlakabad Ext. New Delhi - 110019

انسانی نفسیات پر نباتات کے اثرات

رفیع الدین ناصر

جدید تحقیقات کی روشنی میں Miller- Mo Cone نے یہ بتلایا کہ نباتات انسانی، جسمانی اور نفسیاتی صحت پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اس پر مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اگر آپ مارننگ واک درختوں کے درمیانی والے علاقے میں کرتے ہیں تو اس سے آپ کی صحت پر بہت مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے تو نفسیاتی امراض دور ہوتے ہیں Mental stress کم ہوتا ہے اور کارکردگی پر آپ کی توجہ میں اضافہ ہوتا ہے۔

مختلف جدید تحقیقات نے یہ ثابت کیا کہ انسان اور نباتات کے رابطے کی وجہ سے انسان کی مختلف بیماریوں کا علاج ہوتا ہے اور بعض حالتوں میں جمالیاتی خصوصیات میں اضافہ ہوتا ہے۔ نیوزی لینڈ کی ہیلتھ کونسل نے بتلایا کہ جو اشخاص نباتات کے ساتھ کام کرتے ہیں ان کا معیار زندگی بلند ہوتا ہے۔ اس کو مدنظر رکھ کر نیوزی لینڈ میں Community gardens بنائے گئے ہیں، جس کو دیکھنے کا اتفاق خاکسار کو ہوا ہے۔ ان Community gardens میں پودوں کو سماج کے مختلف افراد کے رابطے میں لا کر ان کے مسائل کے حل نکالے جاتے ہیں۔

پورٹ لینڈ کے سائنس داں Kaplan نے اپنی مختلف تحقیقات کی روشنی میں یہ بتلایا کہ سبز نباتات کے رنگ، خوشبو اور ان کی خوبصورتی کی وجہ سے افراد میں تر و تازگی ہوتی ہے۔ Relaxation کی جس تیز ہوتی ہے ماحول سے لطف اندوز ہونے کا احساس بڑھ جاتا ہے اور انسان مکمل کر اپنے جذبات اور احساسات کو ظاہر کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر آپ ایک ہی طرح کے کام کرتے کرتے ہوئے بیزار ہوگئے اور آپ کی طبیعت خراب ہوگئی ہے تو ڈاکٹر آپ کو مشورہ دیتے ہیں کہ چند دنوں کے لیے کسی پرفضا مقام پر جا کر آ جائیں۔

عام طور پر اسکولوں، دواخانوں، آفسوں اور دیگر کام کی جگہوں پر پودے لگائے جاتے ہیں جبکہ دواخانے اور آفس میں کونڈوں میں پودے اگائے جاتے ہیں اس کی وجہ سے بہت سے نفسیاتی فائدے ہوتے ہیں جیسے کہ اسکول اور دفتر کی حاضری میں اضافہ ہوتا ہے، بلڈ پریشر قابو میں رہتا ہے، کام پر توجہ بڑھ جاتی ہے، صنعتوں میں پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے، معیار بہتر ہوتا ہے اور کیے گئے کام سے تسکین حاصل ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ۔

اگر ہم باغات، پارکس، جنگلات، کھیت، Botanical Gardens، Sancturies نباتات کے خاص علاقے جنھیں ہم Secred grooves کہتے ہیں ان کا تفصیلی جائزہ لیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ یہ تمام نہ صرف ہمارے ماحول کے لیے ضروری ہیں بلکہ یہ ہمارے اطراف کی خوبصورتی میں اضافہ بھی کرتے ہیں اور اگر ان کے فوائد کا گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو ہمارے لیے بہت سے نئے انکشافات ہوتے ہیں۔

آپ نے یہ مشاہدہ کیا ہوگا کہ مختلف تعلیمی پروگرام اور تقریبات کی میزبانی باغیچوں میں کی جاتی ہے۔ اس کا بنیادی فائدہ یہ ہوتا ہے کہ بچوں میں براہ راست ماحول سے رغبت پیدا ہوتی ہے، وہ ماحول کے تحفظ کے بارے میں سوچتے ہیں اور عملی اقدامات کرتے ہیں۔ یہ باغیچے نہ صرف بچوں کے لیے فائدہ مند ہیں بلکہ بڑوں کو بھی وہ ایک دوسرے سے ہم آہنگ کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ تفریحی پروگرام کے توسط سے اپنی صلاحیتوں کو ابھار کر نے کے مواقع فراہم کرتے ہیں۔ طبیعت میں تر و تازگی ہوتی ہے جس کی وجہ سے کئی نفسیاتی پریشانیوں کا ازالہ ہوتا ہے۔

کام کی جگہوں کے اطراف پودے رکھنے سے نفسیاتی طور پر افراد کام پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ تحقیقات سے یہ بھی ثابت ہوا ہے کہ کام کا معیار بلند ہوتا ہے۔ نتائج بہترین حاصل ہوتے ہیں جو درست بھی ہوتے ہیں اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ حافظے میں اضافہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے کام پر توجہ زیادہ مرکوز ہوتی ہے۔ مشیگن (Michigan) یونیورسٹی کی ایک تحقیق نے ثابت کیا کہ اگر گھر اور دفتر میں زیبائشی پودے (Ornamental plants) یعنی خوبصورتی بڑھانے والے پودے رکھے جائیں تو فرد کی یادداشت میں 20% اضافہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے کام پر توجہ زیادہ مرکوز ہوتی ہے اور ذہنی احساسات بڑھ جاتے ہیں۔

پھول زہراوی نباتات کا ایک اہم جز ہے۔ پھول والے نباتات خوبصورت دکھائی دیتے ہیں۔ گھر اور دفتر کے اطراف پھول والے پودے رہنے کی وجہ سے افراد کے Stress میں کمی واقع ہوتی ہے، کام کے موڈ میں اضافہ ہوتا ہے، مثبت توانائی میں اضافہ ہوتا ہے، انسان اپنے آپ کو محفوظ اور آرام دہ محسوس کرتا ہے۔ وہ اشخاص جو اپنے قریب پھول رکھتے ہیں وہ نسبتاً زیادہ خوش ہوتے ہیں، ذہنی دباؤ کی بیماریوں میں کم مبتلا ہوتے ہیں۔ پھول بے شک جمالیاتی خصوصیات میں اضافہ کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ آپ کی زندگی میں رجائیت پسند نقطۂ نظر (Optimistic outlook) کو حاصل کرنے میں مددگار

ہوتے ہیں۔اس کی وجہ سے آپ کی بصارت میں اضافہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے آپ اپنی خوشیاں دوبالا کرسکتے ہیں۔

پارک، باغیچے اور قدرتی سبز ماحول افراد کو صحت مند بہترین (Recreational) خدمات فراہم کرتے ہیں۔ جو افراد پارک یا باغیچے کے قریب رہتے ہیں نسبتاً ان کی جسمانی سرگرمیوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ وہ بغیر تھکے دیر تک کام کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ ان کو ورزش کرنے کے لیے آسانی سے کھلا ماحول اور بہترین ہوا ملتی ہے۔ وہ نفسیاتی دباؤ سے اپنے آپ کو دور رکھتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ زیادہ صحت مند رہتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی بیماریوں کو دور رکھتے ہیں، اس کی وجہ سے ان کے دواخانوں کے اخراجات بھی کم ہوجاتے ہیں۔

آپ نے اکثر مشاہدہ کیا ہوگا کہ دواخانوں کے اطراف میں بھی کثیر مقدار میں درخت لگائے جاتے ہیں۔ وارڈس اور مریضوں کے کمروں کے اطراف کونڈوں میں پودے رکھے جاتے ہیں۔اس کی وجہ سے مریضوں پر نفسیاتی اثرات ہوتے ہیں۔ تحقیقات بتلاتی ہیں کہ دواخانوں میں بازیابی کمرہ (Recovery room) یا مریض کے نظارہ میں اگر خوبصورت باغ یا درخت ہوں تو اس سے مریض تیزی سے شفایاب ہوتا ہے۔ وہ اپنے آپ میں تر و تازگی محسوس کرتا ہے، اس کی جمالیاتی خصوصیت میز ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو نفسیاتی طور پر خوشی محسوس کرتا ہے۔

تحقیقات سے یہ واضح ہوا ہے کہ جو اشخاص پودوں کے اطراف طویل وقت گزارتے ہیں وہ دیگر اشخاص کے ساتھ بہتر تعلقات برقرار رکھتے ہیں۔ ان کے سماجی تعلقات خوشگوار ہوتے ہیں۔اس کا مطلب ہوا کہ پودے نفسیاتی طور سے افراد میں آپس میں خوشگوار تعلقات میں اضافہ کرتے ہیں۔

پودے بڑوں کے ساتھ ساتھ بچوں پر بھی نفسیاتی طور سے مثبت اثرات مرتب کرتے ہیں۔ جدید تحقیقات کے نتائج سے یہ ثابت ہوا کہ وہ بچے جو اپنا زیادہ وقت پودوں کے اطراف میں گزارتے ہیں، وہ نسبتاً تیزی سے سیکھتے ہیں، ان کی توجہ زیادہ ہوتی ہے، وہ زیادہ رضا کارانہ طور سے اپنی سرگرمیوں پر توجہ دیتے ہیں اور اپنے ماحول کے تحفظ کے لیے زیادہ حساس ہوتے ہیں۔ بچوں کے سیکھنے کی جگہ کے اطراف اگر کثیر مقدار میں خوبصورت پودے لگائے جائیں تو اس کے نفسیاتی اثرات سے بچوں میں نئی چیزیں سیکھنے کی قابلیت بڑھ جاتی ہے اور اس کو بچے آسانی سے سمجھنے اور معلومات جمع کرنے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ ان پودوں کی جمالیاتی خصوصیت کی وجہ سے بچوں میں تخریب کاری کی حرکتوں میں بھی کمی واقع ہوتی ہے۔

تحقیقات سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اگر کلاس روم میں Indoor پودے رکھے جائیں تو طلبا کلاس میں رہنے کو ترجیح دیتے ہیں اور جسمانی و ذہنی قوت کارکردگی بڑھ جاتی ہے۔

ذہنی صحت انسان کے لیے بہت قیمتی سرمایہ ہے جو اشخاص اپنا زیادہ وقت قدرتی ماحول میں گزارتے ہیں ان کی ذہنی صحت بہت بہترین ہوتی ہے اور زندگی کو مثبت انداز سے دیکھتے ہیں۔ قدرتی ماحول میں رہنے کی وجہ سے انسان کی قوت حیات (Vitality) بڑھ جاتی ہے جس کے نفسیاتی اثرات کی وجہ سے ان کی ذہنی صحت پر بہت زیادہ مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ بطور خاص اس طرح کے اشخاص افسردگی (Depression) اور تناؤ (Stress) کا شکار نہیں ہوتے۔اس کے برخلاف جو افراد Stress یعنی تناؤ میں مبتلا ہوتے ہیں اگر وہ نباتات کی کاشت کاری، ان کی دیکھ ریکھ میں اپنا زیادہ وقت گزاریں تو اپنا Stress کم کرسکتے ہیں۔ مطالعہ یہ بتلاتا ہے کہ جو افراد Gardening اور پودے لگانے میں اپنا وقت صرف کرتے ہیں، ان میں ذہنی تناؤ کم ہوتا ہے۔ ان میں بیزارگی کی علامتیں کم ہوتی ہیں، وہ اپنے آپ کو پرسکون (Comfort) اور پر مسرت (Joyful) محسوس کرتے ہیں۔ روز مرہ کے مایوسی کے احساسات (Frustration) پر وہ قابو پاتے ہیں اور ساتھ ہی منفی خیالات سے اپنے آپ کو دور رکھتے ہیں۔

پہاڑوں پر چونکہ نباتات زیادہ ہوتے ہیں اس لیے یہاں پر رہنے والے افراد کا معیار زندگی بھی بلند ہوتا ہے۔ فطرتاً یہ افراد اپنے ماحول کے تحفظ کے لیے خود کوشاں رہتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے اطراف کے کاروبار میں اضافہ ہوتا ہے۔ سیاحوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔ اسی وجہ سے پہاڑی علاقوں میں رہنے والے افراد اپنے علاقوں سے ہجرت کرنے سے گریز کرتے ہیں کیونکہ کثیر آبادی، صنعتی ماحول اور سیمنٹ سے آلودہ ماحول میں نفسیاتی طور سے ان افراد کو بے چینی ہوتی ہے۔

پارکس اور Gardens کی وجہ سے مختلف افراد سماجی، تعمیری اور سیاسی سرگرمیوں کے لیے ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں، آپسی بھائی چارہ بڑھتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جرائم کم ہوتے ہیں اور نفسیاتی طور سے افراد ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قدرتی ماحول میں رہنے والے طبقات ایک دوسرے کے لیے بہت وفادار ہوتے ہیں۔

نباتات کے نفسیاتی اثرات صرف عام اشخاص تک ہی محدود نہیں رہتے بلکہ اس کا فائدہ ڈرائیورس اور Road safety کے لیے بھی بہت ہوتا ہے۔ راستوں کے اطراف یا Deviders میں پودے لگانے سے راستوں کی جمالیاتی خصوصیات بڑھتی ہیں جس کی وجہ سے ڈرائیورس نفسیاتی طور پر مطمئن رہتے ہیں، کم تھکاوٹ محسوس کرتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حادثات میں کمی واقع ہوتی ہے۔

نباتات کے طبی فوائد سے کم و بیش ہر شخص کچھ نہ کچھ حد تک واقف ہے لیکن ان نباتات کی کاشت کاری کرنے یا باغات یا کونڈے میں لگانے سے ایک طرح کا نفسیاتی سکون محسوس ہوتا ہے کیونکہ پودے انسانیت کی فلاح کا کام انجام دیتے ہیں۔ ان پودوں کا وجود مزید مثبت سائنسی تحقیقات کے لیے راہ فراہم کرتا ہے۔ پودوں کے تحفظ کے سائے میں ہم اپنی علمی معلومات کا تحفظ کرتے ہیں جو انسانیت کے لیے فائدہ مند ہے۔

حالیہ تحقیقات سے یہ بات واضح ہوئی ہے کہ Indoor پودوں کی وجہ سے ہمارا Indoor ماحول یکسر بدل جاتا ہے۔ صاف اور خوشگوار ہوا گھر کے اندر مہیا ہوتی ہے، بیماریاں دور ہوتی ہیں، نفسیاتی صحت میں مثبت اضافہ ہوتا ہے بیماریاں کم ہوتی ہیں، ہدف کی تکمیل اور حصول مقصد کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔

آسٹریلیا اور دنیا کے دیگر ممالک میں ہوئی تحقیقات سے یہ واضح ہوا ہے کہ سبز، تازہ قدرتی پودے کمروں کے اندر ہوا کے معیار کو بڑھاتے ہیں، مختلف بیماریوں سے محفوظ رکھتے ہیں ان کی وجہ سے خوشگوار ماحول بنتا ہے، ذہنی تناؤ اور منفی سوچ میں کمی واقع ہوتی ہے۔ آواز کی آلودگی میں کمی واقع ہوتی ہے، نفسیاتی ہم آہنگی میں اضافہ ہوتا ہے اور کام کی توجہ میں اضافہ ہوتا ہے۔

ان تمام تحقیقات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ دیگر بہت سے فائدوں کے ساتھ ساتھ نباتات، نفسیاتی طور سے انسانی زندگی پر بہت مثبت اثرات مرتب کرتے ہیں۔ ان کا مطلب جتنی بھی گہرائی سے کیا جائے کم ہی ہے، اس لیے ہم کو چاہیے کہ ہم جس ماحول میں رہتے ہیں وہاں پر Indoor اور Out door پودے زیادہ سے زیادہ تعداد میں لگائیں اور ان کی حفاظت کریں کیونکہ یہ انسانیت کی بقا کے لیے ضروری ہے اور انسانیت کی بقا میں ہی ہم سب کی بقا ہے۔

■

Dr. Rafiuddin Nazir, Maulana Azad College, Rafiq Zakaria Campus, Rauza Bagh, Aurangabad - 431001 (MS)

عظیم اقبال

زلزلے — اسباب و تدارک

"اے لوگو! ڈرو اپنے رب سے۔ بیشک بھونچال ایک بڑی چیز ہے۔" (سورۂ حج)

قرآن کریم کے سترہویں پارے کے اختتام پر "سورۂ حج" کے ابتدائی کلمات کے ذریعے زلزلے کے بھیانک ہونے کا ذکر ہوا ہے اور اس سے لوگوں کو خوف زدہ کیا گیا ہے۔ ہر چند کہ یہ اشارہ روزِ حشر کی جانب ہے، لیکن روزمرہ کی زندگی میں وقوع پذیر ہونے والے زلزلے کی تباہ کاریوں کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے۔

حیرت ناک طور پر ہر دن زلزلے کے پچاس جھٹکے آتے ہیں، تاہم ان کے متعلق ہم اس وقت سنتے اور جانتے ہیں، جب ان کی شدت زیادہ ہوتی ہے نیز زیادہ لوگ لقمۂ اجل بنتے ہیں۔

مستند دستاویزات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر سال 18 بڑے زلزلے آتے ہیں، جن کی ریکٹر پیمانے پر 7.0 سے 7.9 تک پیمائش ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں 8.0 یا اس سے زیادہ شدت کا ایک مزید زلزلہ آتا ہے۔ دستاویزات بتاتے ہیں کہ یہ زلزلے ان ویرانوں میں بھی آتے ہیں، جہاں لوگوں کی رہائش قطعی نہیں ہوتی۔ پہاڑ، ریگستان، سمندر سب زلزلوں کی زد میں آتے ہیں—

یہ عبرت ناک حقیقت ہے کہ تاریخ میں درج شدہ اب تک کا قوی ترین زلزلہ 2 فروری 1,56 کو وسطی چین کے شانگسی کے مقام پر آیا تھا، جس میں اندازاً 8,30,000 لوگ مارے گئے تھے۔

تمام عالم میں گزشتہ تین صدیوں کے دوران وقوع پذیر ہونے والے چند اہم زلزلوں کی تفصیل پر نظر ڈالی جا سکتی ہے۔ ہم ذیل میں اپنے ملک کے زلزلوں پر ایک نگاہ ڈالتے ہیں:

14 اپریل 2012 کو مہاراشٹر کے مقام رتناگری میں 4.9 شدت کا زلزلہ آیا۔ موت کی شرح صفر رہی۔ 2 مئی 2012 کو نئی دہلی میں 3.5 شدت کا زلزلہ آیا۔ اس میں بھی کسی کی موت کی خبر نہیں۔ پھر 16 اپریل 2013 کو ڈبروگڑھ (آسام) میں 4.6 شدت کا زلزلہ آیا۔ اس میں بھی کسی کی موت کی کوئی اطلاع نہیں۔ 1 مئی 2013 کو جموں و کشمیر میں 5.8 شدت کا زلزلہ آیا۔ اس کے جھٹکے شمالی ہندوستان میں دور دور تک محسوس کیے گئے۔ اس میں دو افراد کی موت ہوئی۔ سال 2013 میں مزید 3 اکتوبر کو گنگٹوک (سکم) میں 5.2 کی شدت کا زلزلہ آیا۔ اس میں بھی کوئی جان تلف نہ ہوئی۔ 2 نومبر کو نئی دہلی میں 3.1 شدت کا زلزلہ آیا۔ اس دن مختلف اوقات میں 3 بار جھٹکے آئے۔ 4 نومبر کو شمالی مغربی بنگال میں 4.7 شدت کا زلزلہ آیا۔ 5 دسمبر کو جموں و کشمیر میں 4.7 شدت کا زلزلہ آیا۔ ان سب میں کوئی جان تلف نہ ہوئی۔ ظاہر ہے، ہندوستان میں آنے والے زلزلے معمولی نوعیت سے لے کر بڑی نوعیت کے رہے ہیں۔

آخر یہ زلزلے آتے کیوں ہیں؟ آئیے ان کے اسباب تلاش کریں۔ سائنسدانوں کے ذریعے تسلیم شدہ ٹیکٹونک اصول (Tectonic Principle) کے بموجب زمین کے اوپر ٹھوس دکھائی دینے والی سطح دراصل مائع پر تیرتے مٹی کے تودے ہیں۔

قومی زیرِ زمین تحقیق ادارے (National Geological Research Institute) کے اہلکاران کے کہنا کہتے ہیں:

"زمین میں سات مختلف پلیاں یا پلیٹیں ہیں، جو متحرک رہتی ہیں اور چٹانوں کے نقطۂ اختلاط (Faults) کی دونوں سطحیں طاقت کی سمت کے مطابق عمودی طور پر بڑھ سکتی ہیں۔ اگر طاقت کسی مساوی سمت میں زیادہ ہے تو فالٹ (Fault) کی دونوں سطحیں ایک دوسرے سے جڑ کر

سرکتی ہیں۔ دنیا میں بیشتر زلزلے اسی بیلٹ سے آتے ہیں۔"

یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ ہندوستان برصغیر کی پلیٹ یوریشیائی (Eurasian) پلیٹ کے اندرون اور اس کے نیچے پانچ سینٹی میٹر فی سال کے حساب سے سرک رہی ہے۔ اس عمل سے ہمالہ کی تشکیل بھی ہوئی ہے۔ بلا روک ٹوک چلنے والے اسی عمل کے نتیجے میں برصغیر کے آر پار ساری دراڑیں چالو رہتی ہیں۔ دراڑیں کسی فالٹ (Fault) پر ٹکراتی ہیں تو بھاری قوت (Energy) کا اخراج ہوتا ہے جس سے فالٹ کھسک جاتے ہیں۔

اپنے ملک میں دو بڑے فالٹ ہیں۔ جنہیں اول، مین سنٹرل تھرسٹ (Main Central Thrust) اور دوئم، مین باؤنڈری فالٹ (Main Boundary Fault) کہتے ہیں۔ ہمالیائی خطے میں دو ہزار کیلومیٹر تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ہندوستانی پٹی شمال مشرق میں سالانہ پانچ سینٹی میٹر کی رفتار سے متحرک ہے۔

ماہرین کے بقول:

"پلیٹیں کھسکتی ہیں تو ہندوستانی پٹی، یوریشیائی پٹی کے نیچے آجاتی ہے۔ پھر ایک پٹی دوسری پٹی پر چڑھ جاتی ہے اب وہ نیچے والی پٹی پر دباؤ ڈالتی ہے۔ یہ دباؤ جب بڑھ جاتا ہے تو گھٹانے کے لیے پٹی کی مٹی کی شکل بدلتی ہے اور جس نقطے پر یہ عمل ہوتا ہے، وہاں زلزلے کے جھٹکے پیدا ہوتے ہیں۔"

مزید وضاحت کے لیے ایک مثال یہ بھی ہے کہ کسی شخص کو بھاری بوجھ اٹھانا پڑتا ہے تو وہ جسم کو جھکا کر یا ٹیڑھا میڑھا کر کے سارے جسم پر مساوی اور کل وزن رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ برصغیر کی پلیٹیں اسی طرح منظم ہوتی ہیں اور جنبش کے اسی عمل کے سبب زلزلہ ہوتا ہے۔

آپ نے بڑے بڑے باندھوں کا ذکر بھی سنا ہوگا۔ ان کی اونچائی کو لے کر تنازعات پیدا ہوتے رہے ہیں۔ کچھ زلزلوں کا باندھوں (Dams) سے قریبی تعلق رہا ہے۔ وسیع تر پانی کے ذخیرے سے متاثر زلزلے کی ہندوستان میں سب سے بڑی مثال مہاراشٹر کے کوئنا باندھ کی ہے۔

ایک ماہر کے بقول — "باندھ کی تعمیر سے قبل کوئنا کے علاقے میں زلزلے نہیں آتے تھے لیکن باندھ کی تعمیر کے بعد 1967 میں وہاں بھاری زلزلہ آیا اور اب بھی چھوٹے موٹے زلزلے آتے ہیں۔"

ایسے زلزلوں کے متعلق قیاس کیا جاتا ہے کہ پانی کے ذخائر سے پانی زمین کے گہرے پوروں میں رستا ہے اور بگل چٹانوں پر دباؤ پڑتا ہے۔ پانی رس کر جب نقصوں یا پلیٹوں کے درمیان پہنچتا ہے تو ان کے کھسکنے کے عمل اور

تاریخ	اوقات	مقام	عرض البلد	طول البلد	اموات	شدت
18 ستمبر 1737	23:59 IST	کلکتہ (مغربی بنگال)	7.29N	72.25E	100,000	7.6
16 جون 1819	18:45to18:50 مقامی	رَن آف کچھ، گجرات	23.0N	71.0N	1,543	8.2
31 دسمبر 1881	07:49 IST	انڈمان کے جزائر	8.52N	92.43E	1,50,000	7.9
12 جون 1897	15:30 IST	شیلانگ (آسام)	26°N	91°E	1,500	8.1
4 اپریل 1905	01:19 IST	کانگڑہ (ہماچل پردیش)	32.01°N	76.03°E	20,000	7.8
15 جنوری 1943	14:13 IST	نیپال اور بہار	27.55°N	87.09°E	8,100	8.7
31 مئی 1934	03:02 IST	کوئٹہ (بلوچستان)	28.866°N	66.383°E	30,000 سے 60,000 کے درمیان	7.7
26 جون 1941	08:50 IST	جزائر انڈمان	12.50°N	92.57°E	7,000	8.1
15 اگست 1950	19:22 IST	اروناچل پردیش	28.5°N	96.7°E	1,526	8.5
20 اکتوبر 1991	2:53 IST	اترکاشی (اتراکھنڈ)	30.73°N	78.43°E	2,000	7.0
30 ستمبر 1993	09:20 IST	لاتور (مہاراشٹر)	18.08°N	76.52°E	9,748	6.2
29 مارچ 1999	00:35 IST	چمولی (اتراکھنڈ)	30.408°N	79.416°E	103	6.8
26 جنوری 2001	08:50 IST	گجرات	23.6°N	69.8°E	20,000	7.6
2 دسمبر 2004	09:28 IST	مالدیپ	3.30°N	95.87°E	283,106	9.3
8 اکتوبر 2005	08:50 IST	کشمیر	34.493°N	73.629°E	1,30,000	7.6
6 اپریل 2006	23:29 IST	گجرات	23.3°N	70.4°E	صفر	5.5
25 نومبر 2007	04:40 IST	نئی دہلی	28.4°N	77.4°E	صفر	4.7
10 اگست 2009	01.21 IST	جزائر انڈمان	14.1°N	92.8°E	2.6	7.7
7 ستمبر 2011	23:28 IST	نئی دہلی	28.3°N	77.1°E	صفر	4.2
18 ستمبر 2011	18:10 IST	گنگٹوک (سکم)	27.723°N	88.064°E	118	6.9
5 مارچ 2012	13:09 IST	نئی دہلی	28.8°N	76.7°E	05	5.2
5 مارچ 2012	13:09 IST	نئی دہلی	28.6°N	77.0°E	صفر	3.6
14 اپریل 2012	09:20 IST	گجرات	23.0°N	73.1°E	صفر	4.1
2 مئی 2012	04:12IST	نئی دہلی	28.3°N	77.3E	صفر	3.5
10 اپریل 2013	17:10 IST	نئی دہلی	28.6°N	77.4°E	صفر	3.4
16 اپریل 2013	14:04 IST	ڈبروگڑھ، آسام	28.87°N	95.12°E	صفر	4.6
1 مئی 2013	12:27IST	جموں کشمیر	33.1°N	75.8°E	2	5.8
3 اکتوبر 2013	11:30 IST	گنگٹوک، سکم	26.1°N	88.7°E	صفر	5.2
12 نومبر 2013	00:41 IST	نئی دہلی	28.4°N	77.5°E	صفر	3.1
4 دسمبر 2013	18:35 IST	بنگال	26.1°N	89.5°E	صفر	4.7
21 مارچ 2014	18:41 IST	انڈمان نکوبار	7.6°N	94.4°E	صفر	6.7
21 اگست 2014	13:41 IST	کنگارا ما رد				

رگڑ کے بیچ تال میل پیدا ہو جاتا ہے۔

آپ پوچھیں گے کہ زلزلے کی پیش گوئی ممکن ہے؟ ہمارا جواب ہوگا۔ زلزلے کی پیش گوئی کا کوئی سائنسی طریقہ نہیں ہے، تاہم اس کے لیے ساری دنیا میں تحقیقات

جاری ہیں۔ جاپان، جہاں مسلسل زلزلے آتے رہتے ہیں، زلزلے کی پیشگی اطلاع دینے کا اہل نہیں ہے۔ جاپان اور امریکہ میں زلزلے کی پیش گوئی کے متعلق تحقیقات ہنوز جاری ہیں۔

یہ درست ہے کہ زلزلے سے قبل ریڈون (Radon) نامی ایک نادر گیس کے اخراج میں اضافہ ہوجاتا ہے، لیکن ہر بار زلزلے سے قبل ایسا نہیں ہوتا۔ اس لیے اس گیس کے اخراج اور زلزلے کے درمیان کوئی رشتہ قائم نہیں کیا جاسکتا۔

یہ بھی سچ ہے کہ زلزلے سے قبل کچھ جانوروں کی غیر معمولی حرکتیں بڑھ جاتی ہیں، لیکن ہمیشہ یہ غیر معمولی حرکتیں کسی زلزلے کا پیش خیمہ نہیں بنتیں۔

23 سے 50 کیلومیٹر زیرِ زمین جائزہ خطِ فتور (Fault Line) پر تجربے کیے جائیں تو کچھ قابل فہم باتیں رونما ہوسکتی ہیں۔ لیکن فالٹ لائن کی طوالت سے یہ بھی ایک ناقابل عمل معاملہ بن جاتا ہے۔

ریکٹر پیمانے (Scale) سے زلزلے کی شدت کی پیمائش ہوتی ہے۔ شدت میں ہر عدد کے اضافے کا مطلب ہے، دس گنا بڑی لہر (Wave) اور اس کی قوت میں تین گنا زیادہ اضافہ۔

گجرات بھج کے 2001 کا زلزلہ کئی اعتبار سے پراسرار تھا۔ اس میں سارے برصغیر کا علاقہ سو کیلومیٹر کی موٹائی والے ڈھال کی شکل میں کنیا کماری سے لے کر کشمیر تک، بلکہ بنگلہ دیش تک متزلزل ہوا تھا۔ اس زلزلے کا موازنہ 60 میگاٹن کے ہائڈروجن بم کے پھٹنے سے کیا جاسکتا ہے۔ اس سے جس قوت کا اخراج ہوا وہ 1980 کے سینٹ ہیللینا آتش فشاں (یو، ایس، اے) کے پھٹنے سے خارج قوت کے مساوی تھا۔

یہ درست ہے کہ بھج پٹیوں کے نقطۂ اختلاط پر واضح نہیں ہے۔ تیل کی کھدائی کے سلسلے میں بھج کے علاقے میں وسیع تر مطالعے کیے گئے تھے، لیکن زلزلے کے وسوسے کا کوئی اشارہ نہیں ملا تھا۔ کچھ ماہرین گجرات میں کچھ فالٹ لائن یا غیر متعلق خطوط کی نشاندہی کرتے ہیں۔ مثال کے لیے اللہ بندھ فالٹ (Allahbund Fault) لائن اس زلزلے کے مرکز سے زیادہ دور نہیں ہے۔ ماہرین ارضیات کے بقول کچھ کے اللہ بندھ کے علاقے کی تشکیل 1819 کے زلزلے کے بعد ہوئی۔ اس زلزلے کی پیمائش ریکٹر پیمانے پر 8.0 تھی۔ اللہ بندھ، کے علاقے کی تشکیل 5,000 مربع کیلو میٹر میں ہوئی، جبکہ زمین 15 فٹ تک نیچے دھنس گئی اور 15 سو مربع میل کے علاقے میں پچاس فٹ کی حد تک زمین اونچی ہوگئی ہے 'خدائی بندھ'، 'اللہ بندہ' کے نام سے معروف ہوا۔

اندیشوں، وسوسوں اور عقیدوں سے قطع نظر زلزلہ ایک قدرتی مظہر ہے، لیکن جس پیمانے پر چند بڑے زلزلوں میں جانیں تلف ہوئی، وہ قدرتی نہیں تھے۔ اسے انسان کی کوتاہی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ عمارتوں کی تباہی کے سبب زیادہ جانیں گئیں۔ واقعتاً تباہی کی 90 فی صد وجہ تو مکانوں کا گرنا ہی ہے۔

ناگہانی آفتوں کے انتظام (Disaster Management) کا شعبہ زلزلوں سے جہد کرنے والے مکانوں کی تعمیر کی تکنیک سے متعلق مشورے دیتا ہے۔ صرف ان پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ دراصل تعمیرات کی کاریگری ہی نہیں، بلکہ مٹی کے اقسام بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ کئی معاملوں میں تو زلزلوں کے دوران مٹی رقیق کی مانند بن جاتی ہے، جس سے مکانات زمین میں دھنس جاتے ہیں۔ دوسری اہم بات بنیاد کی گہرائی، نیز عمارتی اشیا ہیں۔

ایک ماہر کے بقول "ہر شے میں الگ الگ لرزے کا رجحان ہوتا ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ مکان ایسی اشیا سے تعمیر ہوں، جن کا لرزہ، زلزلے کے لرزے سے جدا ہو۔"

سچ تو یہ ہے کہ انھیں طریقوں سے جاپان اور کیلی فورنیا جیسے مقامات پر عروجی شدت والے زلزلے بھی ایسی ویسی تباہی نہیں مچاتے۔

گاہے بہ گاہے سرکاری ابلاغ کے توسط سے بچاؤ کے سلسلے میں لوگوں کی تربیت کی جاتی رہی ہے۔ بہار ریاست ڈیماسٹر مینجمنٹ کے زیر اہتمام بیداری مہم جنوری 2014 کے تیسرے، ہفتے میں چلائی گئی۔ عوام کو زلزلے سے بچاؤ کے طریقے بتائے گئے۔ زلزلے کے وقت کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ زلزلے کے وقت اگر کمرے کے اندر ہوں تو کسی میز یا مضبوط فرنیچر کے نیچے بیٹھ جانے کی صلاح ہے۔ باہر کی طرف بھاگنے کی ممانعت ہے۔ جھٹکے رک جانے تک صبر سے رہیں۔ پھر زخمیوں کی مدد کریں۔ افراتفری سے بچیں۔

صاحبو! زلزلے سے ڈرنے کی نہیں اس سے نبرد آزما ہونے کی ضرورت ہے۔

پس نوشت: چند ذی روح پہلے سے زمین کی اندرونی ہلچلوں کی آگہی حاصل کرلیتے ہیں۔ چڑیوں، کیڑے مکوڑوں، مینڈھکوں، سانپوں میں یہ خصوصی صلاحیت ہوتی ہے۔ یہ سب زلزلے سے قبل اپنی رہائش گاہ کو خیرباد کہہ دیتے ہیں۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ پانی میں یا پانی کے قریب رہنے والے ذی روح کیمیائی تبدیلیوں کے چلتے زلزلے کا اندازہ لگا لیتے ہیں۔

دوسری جانب جدید ترین، تکنک نے چھوٹے سے چھوٹے ریڈیو ٹرانسمیٹر کی تشکیل ممکن بنا دی ہے۔ جلد ہی ایسے ٹرانسمیٹر ننھے منے حشرات الارض (شہد کی مکھیاں، تتلیاں) ڈھو سکیں گے۔ ماہرین کو توقع ہے کہ ان حشرات الارض کی حرکات و سکنات کو خلائی اسٹیشن سے جوڑ کر قدرتی آفات سے قبل ان کی آگہی حاصل کی جاسکے گی۔

33 کروڑ پاؤنڈ کے اس منصوبے کا نام 'اکارس پروجیکٹ' رکھا گیا ہے، جس کے منتظم 'شی مولز' ہیں۔ ان کے بقول ممکنہ آفات کے علاقوں میں، قرب و جوار میں رہنے والے چڑیوں، جانوروں، وغیرہ کو ٹرانسمیٹروں سے لیس کیا جائے گا۔ ان کے ذریعے خلائی اسٹیشن میں لگے رسیور سے معلومات حاصل ہوں گی۔

■

Azim Iqbal, Adabistan, Ganj No. One, Bettiah - 845438 (Bihar)

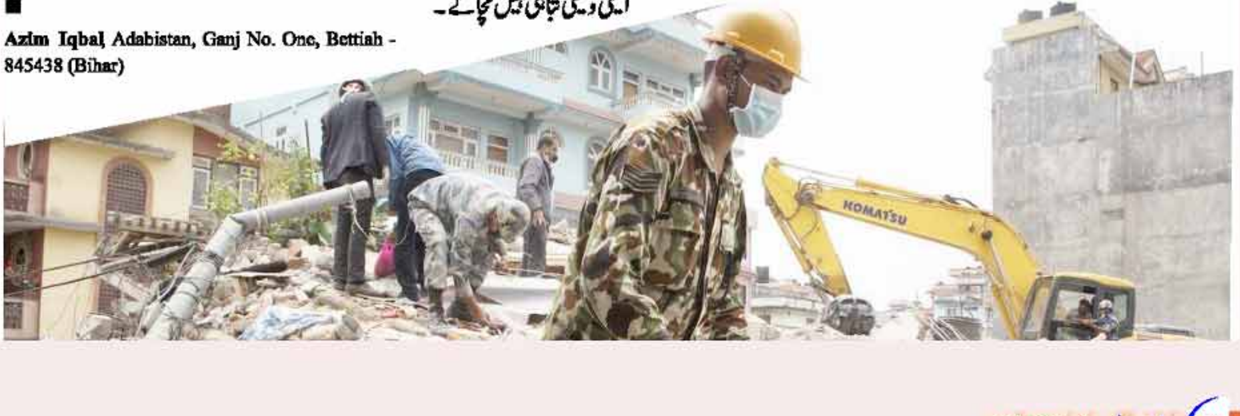

تبصرہ وتعارف

مولانا ابوالکلام آزاد: ایک مطالعہ

مرتب: پروفیسر عبدالستار دلوی
صفحات: 474، قیمت: 216، سنہ اشاعت: 2015
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: پروفیسر قدوس جاوید، بیت الزہرا، 27 گرین ایکر کالونی
نزد گورنمنٹ ہائر سیکنڈری اسکول، بٹھنڈی، جموں (جموں کشمیر)

مولانا ابوالکلام آزاد کیا تھے اور مولانا آزاد کی فکر کی عصری معنویت کیا ہے؟ اسے کلی طور پر سمجھنا آج جتنا ضروری ہے اتنا شاید پہلے کبھی نہیں تھا۔ شاید یہی وجہ خلوص احساس ہے جس نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کو 'مولانا ابوالکلام آزاد—ایک مطالعہ' شائع کرنے پر آمادہ کیا۔ مشہور محقق اور دانشور پروفیسر عبدالستار دلوی کی مرتب کردہ اس کتاب میں، ہندوستانی سیاست، علم و ادب، تاریخ و ثقافت اور صحافت سے وابستہ مستند اور معتبر مشاہیر کے مضامین شامل ہیں۔ ان مشاہیر کی فہرست میں ہر نام بجائے خود اپنے اپنے میدانوں میں معیار و اعتبار کے پیمانے کا حکم رکھتا ہے۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد، ڈاکٹر ذاکر حسین، پنڈت جواہر لعل نہرو، غلام رسول مہر، ہمایوں کبیر، پنڈت سندر لال، عابدہ سلطان، پروفیسر رشید الدین خان، خواجہ احمد فاروقی، نیاز فتح پوری، علامہ سید اختر علی تلہری، پروفیسر خلیق احمد نظامی، مالک رام، ارونا آصف علی، سید حامد، انور معظم عالم خوند میری اور دیگر تمام مقالہ نگار وہ ہیں جنھوں نے مولانا آزاد کو بہت قریب سے دیکھا، سمجھا، پرکھا اور برتا تھا اور چونکہ ان میں سے ہر ایک 'نابغہ روزگار' بھی رہا ہے۔ اس لیے ان کے مقالوں میں مولانا کی علمی، ادبی، صحافتی، سیاسی اور مذہبی افکار و تصورات، تجربات و تفاسیر کے قابل فخر کارناموں کی جہتوں اور طرفوں کو جس جس انداز میں کھول کر پیش کیا گیا ہے، وہ تحقیق و تجزیہ کے قابل فخر معیارات قائم کرتے ہیں۔ موضوع یا ممدوح اگر غیر معمولی ہو تو اس سے متعلق تحریر کا بھی اعلیٰ اور غیر معمولی ہونا زیب دیتا ہے۔ چنانچہ زیر نظر کتاب 'مولانا ابوالکلام آزاد—ایک مطالعہ' کے تمام مقالوں کا گہرائی سے مطالعہ کرنے کے بعد یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کس مقالے کو کس سے بہتر یا کمتر قرار دیا جائے۔ ہر مقالہ 'دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا' کے مصداق، ایک سے بڑھ کر ایک ہے۔ مشمولہ مقالوں کی سنجیدہ قرأت، فکر آزاد کے متعدد اور مختلف النوع پہلوؤں کو سامنے لاتی ہے۔ لیکن ملک کی عصری سماجی و ثقافتی صورت حال کے تناظر میں، 'متحدہ قومیت' (یعنی ہندو مسلم اتحاد) سے متعلق مولانا کا نظریہ سب سے زیادہ غور و فکر اور توجہ کا مطالبہ کرتا ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے اس کتاب کے پیش لفظ میں درست لکھا ہے:

"مولانا ابوالکلام آزاد کا بنیادی ارتکاز، آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد بھی کثرت میں وحدت، رواداری اور ہندو مسلم اتحاد پر تھا۔ ان کا خیال تھا کہ 'صرف یہی نہیں کہ اس کے بغیر ہمیں قومی آزادی نہیں مل سکتی بلکہ اس کے بغیر ہم انسانیت کے ابتدائی اصول بھی اپنے اندر نہیں پیدا کر سکتے۔"

مولانا آزاد کی شخصیت اور 'فکر آزاد' کی عصری معنویت کیا ہے؟ اس کی غیر جانب دارانہ توضیح و تعبیر، ادب یا صحافت کا معاملہ ہونے سے کہیں زیادہ، عصری ہندوستانی معاشرے میں وطن عزیز کی نئی نسلوں کے لیے ایک لازمی ضرورت ہے۔ سبب یہ ہے کہ آزادی ملک کے بعد سے ہی ہندوستانی عوام، سیاست، صحافت، معاشرت اور اخلاقیات کے حوالے سے جس بحران سے دوچار رہے ہیں اس پر قابو پانے کی کوششیں تو ہو رہی ہیں لیکن اس سے مکمل نجات کے مثبت، تعمیری اور بڑا امکان راہیں، سب سے زیادہ فکر آزاد کے ہی اعماق سے نکلتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ان راستوں کا شعور حاصل کرنا دشوار ہے لیکن "قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان" نے "مولانا ابوالکلام آزاد: ایک مطالعہ" شائع کر کے، یہ کام آسان کر دیا ہے۔

ابوالکلام آزاد کی ذاتی زندگی کے شب و روز کے علاوہ ان کی تمام تر علمی، ادبی، صحافتی اور سیاسی سرگرمیوں کا 'منتہیٰ' کریں تو ملک و قوم کے لیے جو امرت 'ہاتھ آئے گا، وہ 'متحدہ قومیت' کا تصور ہوگا۔" اس ضمن میں 'مولانا ابوالکلام آزاد: ایک مطالعہ' کے مرتب پروفیسر عبدالستار دلوی نے مذکورہ کتاب کے سیر حاصل مقدمے میں مولانا آزاد کے تاریخ ساز اخبار 'الہلال' کے اجرا کا مقصد ہی 'ہندو مسلم اتحاد' کو مضبوط و مستحکم کرنا قرار دیا ہے۔

یوں تو مولانا آزاد کی ہمہ جہت شخصیت، خدمات اور کارناموں سے متعلق اردو اور انگریزی میں متعدد کتابیں، مضامین، رسائل کے خصوصی نمبر شائع ہو چکے ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے لیکن زیر نظر کتاب میں حد درجہ تلاش و جستجو اور دیدہ ریزی کے بعد جو مقالے اور تاثرات یکجا کیے گئے ہیں ان کے سبب نہ صرف یہ کہ اس کتاب میں مطالعہ آزاد کے حوالے سے بصیرت افروز مواد پیدا ہوا ہے بلکہ اس کی دستاویزی حیثیت بھی مسلم ہے۔ اس کتاب کے حسن ترتیب کے لیے، پروفیسر عبدالستار دلوی کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہوگی۔

تاریخ علم الادویہ

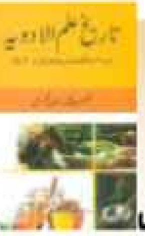

مصنف: حکیم سید محمد حسان نگرامی
صفحات: 498 — قیمت: 220، سنہ اشاعت: 2015
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: ڈاکٹر منور حسن کمال، بیت المراحیہ، G-5A، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی

تمام علوم و فنون کے مطالعہ میں تاریخی پس منظر کو کلیدی اور بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ گویا تاریخ کا مطالعہ ہمہ گیر ہے۔ فلسفی، مفکر، دانشور، مذہبی پیشوا، سیاست داں، سائنس داں، عالم، ادیب، نقاد اور فن کار کے لیے اپنے موضوع کی مناسبت سے تاریخ کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ تاریخ کا مطالعہ اپنی واقفیت میں اضافہ کے لیے بھی کیا جاتا ہے۔

تاریخ علم الادویہ کے اولین ماخذ اور اس کی ابتدائی پیش رفت کے عہد کا تعین وجود انسانیت سے متعلق قدیم ترین ماخذ کی تلاش اور مطالعہ پر منحصر ہے۔

پیش نظر کتاب 'تاریخ علم الادویہ' عہد اساطیر سے 2800 قبل مسیح - 2013 حکیم سید محمد حسان نگرامی کی تصنیف ہے۔ طبی موضوعات پر تحقیق اور دوسری زبانوں سے علم طب کی کتب کے تراجم، مضامین اور مقالات ان کی دلچسپی کے اہم شعبے ہیں۔ اس کتاب میں کم و بیش پانچ ہزار برس کی ادویاتی تاریخ اور اس کی کارگزاریوں کو جمع کیا گیا ہے۔ اس کی تیاری میں علم الادویہ کی پیش رفت سے متعلق یونان، ہندوستان، مصر، چین، ایران اور دیگر قدیم تہذیبوں کے اولین مصادر و ماخذ سے استفادہ کیا گیا ہے۔

طب کی تدوین، تصنیف و تالیف اور معالجاتی تحقیق کا آغاز بقراط 460 قبل مسیح سے ہزاروں سال قبل شروع ہوتا ہے۔ اس عہد کے طبیب ہرمس 500 قبل مسیح کی معالجات میں ادویہ پر بقراط سے پہلے کی ایک اہم تصنیف کہی جا سکتی ہے۔ تاریخ طب یونانی میں معالجاتی انقلاب کا دور بقراط سے شروع ہوتا ہے۔

تاریخ علم الادویہ میں بتایا گیا ہے کہ طب کے تمام شعبوں میں منصوبہ بند قلمی اور عملی کوششوں کے آغاز کا سہرا جالینوس کے سر ہے۔ اس بات کی بھی نشان دہی کی گئی ہے کہ روم کے مکمل اضمحلال کے بعد تمام علوم و فنون کے ساتھ علم طب بھی متاثر ہوا۔ تہذیبوں کے عروج و زوال اور چہار دانگ عالم میں سیاسی اور تمدنی انقلاب کے سلسلے سے بھی علوم و فنون زوال پذیر ہوئے اور یہ سلسلہ عہد جاہلیت تک جاری رہا۔ اور پھر جب آفتاب اسلام طلوع ہوا تو تمام ترقیوں کے ساتھ ساتھ علوم و فنون پر توجہ ہوئی اور علم طب نے بھی ترقی کی۔ اس بات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے کہ طب نبوی میں مذکور عطر سے زیادہ دواؤں سے ایک مرتبہ پھر فن طب کا ارتقا ہوا اور آج کی نئی تحقیقات سے نبی اکرم کی بتائی گئی ادویہ کی افادیت درست ثابت ہو رہی ہے۔

اس کتاب کی ترتیب میں آغاز میں ماقبل بقراط ادویہ کے ارتقائی مراحل 4000 قبل مسیح، قدیم خشتی تختیاں 1500 قبل مسیح، مصر پیپرس نوشتے 1300 - قبل مسیح، علم الادویہ پر دستیاب قدیم ترین علمی سرمایہ۔ چوتھی صدی قبل مسیح کے حالات پیش کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد بقراط کی پیدائش اور حیات و خدمات کے ساتھ حوالے کے طور پر ان کی تصانیف اور نسخے پر گفتگو کی گئی ہے۔ دیگر معلومات تحریر کرنے کے ساتھ ساتھ مکمل، مفرد اور مرکب دواؤں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اد سطو سے متعلق کتاب میں درج ذیل تفصیل بھی ملتی ہے۔ سنگ بادزہر مختلف رنگوں کا ہوتا ہے۔ بعض کا رنگ خاکستری ہوتا ہے۔ بعض پر دھبے ہوتے ہیں وغیرہ۔ اس کے بعد اس کی ماہیت کی تفصیل اس طرح بیان کی گئی ہے۔ بادزہر حیاتی اور حیوانی زہروں، کیڑوں مکوڑوں کے کاٹنے پر نصف گرام سفوف بنا کر کھانے سے فائدہ ہوتا ہے۔ اس طرح زہریلے اثرات مثل اور پسینہ کے ذریعہ خارج ہو جاتے ہیں۔

جالینوس سے متعلق حکیم سید محمد حسان نگرامی لکھتے ہیں: مفرد اور مرکب دواؤں کے سلسلے میں جالینوس کو خصوصی امتیاز حاصل ہے۔ یہ صرف اس لیے نہیں کہ اس نے ادویہ پر بہت سی کتابیں لکھیں۔ بلاشبہ یہ بھی ایک اہم کام ہے۔ دراصل جالینوس کو اس کے تجرباتی ذوق تحقیق اور دور دراز علاقوں کے سفر میں وہاں کے باشندوں سے ادویہ کی تاثیرات کی معلومات پھر ان طبی کلیات کی روشنی میں تجربات، ان کو دوسرے اطبا سے ممتاز کرتے ہیں۔ اس کے بعد ہر صدی کے قابل ذکر اطبا کا ذکر متعلقہ صدی کے تحت کیا گیا ہے۔ پھر اکیسویں صدی کے اطبا اور اکیسویں صدی کے زندہ اطبا کے تحت دو سو اطبا کا ذکر موجود ہے۔

اعتراف کے تحت مصنف نے اس بات کا شکوہ بالکل بجا کیا ہے کہ فون، ایس ایم ایس اور ای-میل کے ذریعہ ان گنت درخواستوں پر بہت کم لوگوں نے اپنے بائیو ڈاٹا فراہم کرائے۔ اسی وجہ سے بہت سی اہم شخصیات اس تذکرے میں شامل نہیں ہو سکیں۔ جتنی معلومات فراہم ہو سکی اسی کو بنیاد بنا کر کتاب مرتب کر دی گئی ہے۔

علم الادویہ میں پوسٹ گریجویٹ تحقیق عنوان کے تحت یہ بتایا گیا ہے کہ اس کا سہرا اجمل خاں طبیہ کالج علی گڑھ کے سر جاتا ہے۔ 1972 میں اس کے قیام کے بعد سے ڈیڑھ سو سے زیادہ متعلمین پر پوسٹ گریجویٹ ڈگریاں تفویض کی گئی ہیں۔ ان فارغین کے نام اور جس عنوان پر سند ملی ہے اس کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ مختلف کتب خانوں میں علم الادویہ پر دستیاب مخطوطات کی فہرست بھی مرتب کر کے پیش کی گئی ہے۔ ساتھ ہی فہرست کتب علم الادویہ اور حوالہ کتب خانوں کا تفصیلی اشاریہ بھی پیش کیا گیا ہے، جو اس کی اہمیت میں اضافہ کرتا ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اپنے شایان شان اس کتاب کو شائع کیا ہے۔

حکیم سید محمد حسان کم و بیش پچاس تحقیقی مقالات کے باعث فن طب کے ماہرین میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں، اس کتاب کو خوب سے خوب تر بنانے میں انھوں نے بڑی محنت کی ہے۔ امید ہے کہ ان کی محنتوں کا صلہ انھیں ضرور ملے گا اور تاریخ علم الادویہ قبول عام کی سند حاصل کرے گی۔

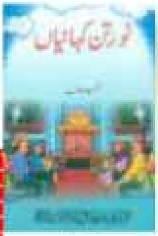

نورتن کہانیاں

مصنف: محمد بخش مجور، انتخاب: شمیم احمد
صفحات: 154، قیمت: 37 روپے، چھٹی طباعت: 2015
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: محمد شمیم الدین، سی۔ 633 فرسٹ فلور، گلی نمبر 9، مڈاکر نگر، نئی دہلی

زیر نظر کتاب 'نورتن کہانیاں' محمد بخش مجور کی کلاسیکی کتاب 'نورتن' سے منتخب کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ محمد بخش نے یہ کتاب تقریباً دو سو برس قبل لکھی تھی، آج سے دو سو سال قبل کے زبان و بیان میں غیر معمولی فرق پایا جاتا ہے اس لیے ضرورت تھی کہ نورتن میں مذکور کہانیوں کے زبان و بیان کی تسہیل کے ساتھ شیریں زبان میں مصنف کی مراد کو ملحوظ رکھتے ہوئے از سر نو ترتیب دی جائے، اسی ضرورت کے پیش نظر شمیم احمد صاحب نے 'نورتن' سے چند سبق آموز کہانیوں کا انتخاب کیا، اس کی پہلی اشاعت 1980 میں ہوئی اب اسے نئے قالب میں کونسل نے پھر شائع کیا ہے۔ کتاب کے شروع میں کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم کا پیش بہا پیش لفظ ہے۔ جس کے ذریعے انھوں نے بچوں کو علم و ادب کی قدر و قیمت اور اس کی ضرورت و اہمیت سے روشناس کرایا ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مقاصد میں ادب اطفال کے فروغ کو بھی ترجیحی حیثیت حاصل ہے، اسی ضمن میں بچوں کی کہانیوں پر مشتمل کتابوں کی از سر نو اشاعت کا سلسلہ جاری ہے۔ ادب اطفال سماج کی ایک ویسی ہی ضرورت ہے جیسی کسی دیوار کی تعمیر کے لیے گارے یا پتھر اور اینٹ کی ہے۔ کسی خوبصورت اور بلند دیوار کا منصوبہ بیان بنیادی اعمال کے بغیر پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا۔ ٹھیک ایسے ہی کسی بہتر اور معیاری سماج کی تشکیل کا خواب ادب اطفال کی بنیاد پر اٹھائے بغیر شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب میں چھ ابواب کے تحت 37 کہانیاں جمع کی گئی ہیں۔ پہلے باب میں عقل مندوں کی کہانیاں کے ضمن میں 'بزدل شیر'، 'محبت چیتا اور لومڑی'، 'شیر بچے اور بدشگنی'، 'گانے والی بکری'، 'الو کی تقسیم'، 'تین سوال ایک جواب'، 'کیڑوں کی دعوت'، 'اونچی قضا نہ جانی' اور سونار کی ایک لوہار کی کہانیاں شامل ہیں۔ اسی طرح دوسرے باب میں فریادیوں اور معاونوں کی کہانیوں کے ضمن میں 14 سبق آموز کہانیاں جمع کی گئی ہیں، تیسرے باب میں بے وقوفوں کی کہانیوں کے تحت 9 کہانیاں شامل ہیں، چوتھے باب میں ظریفوں کی

کہانیوں کے ضمن میں 14 کہانیاں شامل کتاب ہیں۔ پانچویں باب میں لطیفوں کی کہانیوں کے تحت بچوں کے لیے پانچ سبق آموز کہانیاں جمع کی گئی ہیں۔ چھٹے باب میں مجوسوں کی کہانیوں کے ضمن میں 6 کہانیاں شامل کتاب ہیں۔ ان تمام کہانیوں میں بچوں کی روزمرہ زندگی سے متعلق سبق اور نصیحت ہے۔ یہ کتاب ادبِ اطفال میں قابلِ قدر اضافہ ہے۔

انتظامیہ

ادارہ

صفحات: 210، قیمت: 69 روپے، سنہ اشاعت: 2014

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، نئی دہلی

مبصر: معین الدین خان، D-66، جنتا فلیٹس، جسولہ پاکٹ II، نئی دہلی

ایک جمہوری ریاست میں ہر شہری کے لیے سیاست، دل بستگی کا سامان ہو، نہ ہو، لیکن اس امر سے ہر کوئی اتفاق کرے گا کہ عوامی زندگی میں انتظامیہ سے ہر کسی کو سابقہ پڑتا ہے۔ رفاہی کاموں سے لے کر ملک کی دفاعی ضرورتوں تک، ہر جگہ انتظامیہ کی موجودگی اور کارکردگی کو دیکھ سکتے ہیں۔ آج زندگی کے ہر شعبے میں انتظامیہ کی ضرورت دن بہ دن بڑھتی جاتی ہے۔

فرہنگ اصطلاحات برائے انتظامیہ کی اشاعت نہ صرف دفتروں میں کام کرنے والوں، طالب علموں اور اساتذہ کے لیے اہم ہے بلکہ عام قاری کے لیے بھی انتظامیہ کی اصطلاحات سے واقفیت ضروری ہے۔ اصطلاحیں علمی شغل میں آسانی فراہم کرتی ہیں۔ اس کے استعمال کرنے والے مخصوص لفظ کے سیاق و سباق سے واقف ہونے کے سبب کم لفظوں میں اپنی بات کو کہہ پاتے ہیں اور کہنے اور سننے والے کے درمیان معنی کی ممکنہ حد تک آسانی سے رسائی ہو پاتی ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب انتظامیہ کی بھی اہم اصطلاحات سے واقف کراتی ہے اور کافی بڑی تعداد میں یہاں انگریزی اصطلاحوں کو اردو کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس فرہنگ کی اہم خوبی یہ ہے کہ اس میں اردو اصطلاحات غیر مانوس نہیں معلوم ہوتیں۔ البتہ ایک جگہ Diamond Jubilee کا متبادل 'ڈائمنڈ جبلی' اور دوسری جگہ 'جشنِ الماس' دیا گیا ہے۔ ایک اصطلاح کو پوری کتاب میں ایک جیسا ہی برتا جانا چاہیے تھا نیز اردو میں 'جبلی' نہیں بلکہ 'جوبلی' لکھتے ہیں۔ زیادہ تر انگریزی اصطلاحوں کے اردو متبادل پیش کرنے میں سلیس اور رواں زبان کا استعمال ہوا ہے۔ ان کو پڑھنے سے جہاں اصطلاحات کی جانکاری ہوتی ہے وہیں اس پر رشک ہوتا ہے کہ اردو میں اتنی شستہ اصطلاحات وضع کی جا سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر چند نمونے دیکھیے:

Joint Supervision: مشترکہ نگرانی

Territorial Army: علاقائی فوج

Permissible: جائز، درست، بجا

اسی طرح اگر School of Foreign Language کا متبادل بدیسی زبانوں کا اسکول، کرنے کے بجائے غیر ملکی زبانوں کا اسکول ہوتا تو بہتر ہوتا۔ WRIT کا اردو متبادل 'رِٹ' ہے، اس کا عملداری بھی کر سکتے ہیں۔

کتاب کے آخر میں دفاتر میں عام استعمال ہونے والے بعض فقروں کو شامل کیا گیا ہے۔ یہاں پر اس بات کا ذکر بے جا نہ ہوگا کہ سرکاری دفاتر میں فائلوں پر کئی مخففات (Abbreviation) کا استعمال بھی ہوتا ہے مثلاً (In respect of) inr/o۔ اگر ان کی جانکاری بھی دے دی جاتی تو کتاب کی افادیت میں مزید اضافہ ہوتا۔

اتنی اہم کتاب کو ان حلقوں میں ضرور پہنچنا چاہیے، جہاں اس کی اشد ضرورت ہے۔ خصوصاً تعلیمی اداروں اور دفاتر میں۔ اگر اس فرہنگ کو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی ویب سائٹ پر ڈال دیا جائے تو اس سے استفادہ کرنے والوں کی تعداد میں جہاں اضافہ ہوگا وہیں بہ سبب مجبوری انگریزی اصطلاحوں کو استعمال کرنے والے اردو اصطلاحات کا استعمال کر سکیں گے۔ نیز آن لائن (Online) ہونے کی وجہ سے مختلف حلقوں کی بازرسی (Feedback) بھی موصول ہوں گی اور قیمتی مشورے بھی آئیں گے۔ قاری بعض اصطلاحات کے بہتر اردو متبادل تجویز کر سکتے ہیں جس سے اردو کے ذخیرہ الفاظ میں بھی اضافہ ہوگا اور اس فرہنگ کا آئندہ ایڈیشن زیادہ وسیع اور کارآمد ہوگا۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ بعض اصطلاحات جو اس فرہنگ میں شامل ہونے سے رہ گئی ہیں وہ بھی آئندہ اشاعت میں شامل ہو جائیں گی۔

تانیثیت اور ادب

مرتب: انور پاشا

صفحات: 391، قیمت: 400 روپے

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

مبصر: ابوظہیر ربانی، شعبہ اردو، دیال سنگھ کالج، لودھی روڈ، نئی دہلی 3

دیگر ادبی تحریکوں کی طرح تانیثیت کی تحریک بھی عہدِ جدید کے تقاضے کی پیداوار ہے۔ زیرِ نظر کتاب 'تانیثیت اور ادب' کے مرتب اردو کے نقاد اور دانشور پروفیسر انور پاشا ہیں جنھوں نے تانیثیت سے متعلق معیاری اور فکر انگیز مضامین کو یکجا کرکے کتابی شکل دی ہے۔ موصوف کے ذریعے دو جلدوں میں مرتب کردہ کتاب 'ادبی تحریکات و رجحانات' کے بعد زیرِ نظر کتاب 'تانیثیت اور ادب' بھی دستاویزی اہمیت کی حامل ہے۔ پروفیسر انور پاشا اپنے پیش لفظ میں لکھتے ہیں: 'میں نے تانیثیت سے متعلق بکھرے ہوئے مضامین اور تحریروں کو یکجا کرکے اس موضوع پر ایک ایسا کولاژ تیار کرنے کی سعی کی ہے جو تانیثیت کے تصور کو واضح کرنے اور تانیثی ادب کی تفہیم میں معاون ہو سکے۔' کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ حصہ اول 15 مضامین پر مشتمل ہے۔ انور پاشا نے اس حصے میں ایسے ناقدین اور دانشوروں کے منتخب مضامین شامل کیے ہیں جو سنجیدگی کے ساتھ تانیثیت پر غور و فکر کرتے رہے ہیں۔

اس کتاب میں تانیثیت سے متعلق مباحث پر مبنی مضامین میں 'تانیثیت کی تفہیم' (شمس الرحمن فاروقی)، 'تانیثیت: ایک تنقیدی تصور' (سید محمد عقیل رضوی)، 'تانیثیت اور مابعد جدیدیت' (وہاب اشرفی)، 'تانیثیت: ایک سیاقی مطالعہ' اور 'تانیثی جمالیات کا تعین' (عتیق اللہ)، 'تانیثی ادب کی شناخت اور تعینِ قدر' (ابوالکلام قاسمی)، 'تانیثیت: چند پہلو' (دیویندر اسر)، 'فیمنسٹ ادب کا مسئلہ' اور 'فیمنسٹ تحریک: اپنی بانہوں اپنی گھاتی' (ریاض صدیقی)، 'تانیثیت اور ادب' (انور پاشا)، 'تانیثیت اور جدید اردو نظم' (ناصر عباس نیر) وغیرہ کے نام بطور خاص اہم ہیں۔

کتاب کے دوسرے حصے میں صرف ممتاز خاتون ادیبوں اور ناقدین کے 14 مضامین شامل ہیں۔ یہ مضامین مشاہداتی و تصوراتی ڈسکورس کے تناظر میں نہیں بلکہ عالمی سطح پر رونما ہونے والے واقعات و حالات کے پس منظر میں ذاتی تجربے کی بنیاد پر تحریر کیے گئے ہیں۔

کتاب میں شامل مضامین میں جس پہلو پر خصوصی زور ہے وہ یہ کہ تانیثی تحریک عہدِ حاضر کے تمام تر شعبۂ حیات میں اپنا سکہ جماتی جا رہی ہے۔ یہاں تک کہ یہ ایک ڈسکورس بن چکی ہے۔ نیز ادبی سطح پر بھی تانیثی اظہار کی مختلف جہتیں ابھر رہی ہیں۔ مختصر یہ کہ تانیثیت ایک نیا تصور ہے جو انیسویں صدی کی نصف دہائی میں خواتین کے ذریعے

خود اپنے تشخص کی تلاش نیز سیاسی، سماجی اور ادبی حقوق کی بازیافت کے رجحان کے طور پر مغربی ممالک میں شروع ہوئی اور بیسویں صدی کی چھٹی دہائی آتے آتے ٹھوس نظریے کی حیثیت سے ایک ہمہ گیر تحریک کی شکل میں مستحکم بنیاد قائم کرلی۔

عالمی ادب میں تانیثیت کے تصور کے ابھرنے سے متعلق پس منظر پر ناقدین نے تفصیل سے بحث کی ہے، نیز یہ کہ تانیثیت کیا ہے؟ تحریک اور رجحان میں کیا فرق ہے؟ اسے بھی واضح کیا ہے۔ 1848 میں امریکہ کے سنکا فالز (Senca Falls) کانفرنس میں جو خواتین کے حقوق اور بازیافت نیز مساوات کا حصول کی رفتار تیز کرنے کے لیے منعقد ہوئی تھی، اس میں منظور کیے گئے اعلان مردوں سے نجات پانے کی جدوجہد کی راہ کا پہلا سنگ میل اور اولین منشور تھا۔ میری وول اسٹون تو عورتوں پر مردوں کی برتری کو غیر فطری قرار دیتی ہیں۔ تانیثیت مرد اساس نظام و اقتدار کی عدم مساوات اور امتیاز کی نہ صرف نفی کرتی ہے بلکہ صدائے احتجاج بھی بلند کرتی ہے تاکہ معاشرہ توازن اور مساوات کے اصولوں پر قائم ہو۔ تانیثی ادب میں اس بات کا اظہار ملتا ہے کہ مروجہ ادب میں جو زبان استعمال ہوتی ہے وہ مرد اساس نظام کی پیداوار ہے، لہٰذا تانیثی مفکرین زبان و اسلوب کو بھی تانیثی نقطۂ نظر سے پرکھنے کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ چنانچہ تانیثیت جو ابھی ایک محدود رجحان کی شکل میں نمودار ہی تھی بیسویں صدی کی چھٹی دہائی کے بعد مغربی ادب کے منظر نامے پر خاص طور پر فرانس میں ایک مستحکم بنیاد قائم کرنے میں کامیابی حاصل کرلی۔ جسے انقلاب 1968 کے نام سے موسوم کیا گیا۔

اردو میں بھی تانیثیت کے نقوش مغربی فکر سے متاثر ہو کر ابھرے۔ بعض خواتین فکشن نگاروں اور شاعرات نے شعوری طور پر اپنی تخلیقات میں تانیثی حوالوں کو گرفت میں لانے کی کوشش کی۔ مثلاً رشید جہاں، عصمت چغتائی، ذکیہ مشہدی، صغریٰ مہدی وغیرہ۔ اسی طرح بعض جدید اردو شاعرات نے مثلاً پروین شاکر، فہمیدہ ریاض، کشور ناہید، زاہدہ زیدی، ساجدہ زیدی، رفیعہ شبنم عابدی وغیرہ نے تانیثی تصورات کی پیش کش پر توجہ صرف کی۔ خواتین فنکار تخلیق کے روایتی قید و بند کو توڑتی نظر آتی ہیں۔ اردو ادب میں تانیثی تصورات کا جائزہ لینے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ خواتین ادیبائیں خاندانی اور پدری نظام کے دائرے میں محصور ہو کر نہیں رہ گئی ہیں لیکن انھیں ابھی ایک لمبا سفر طے کرنا ہے۔ اردو میں مغربی تانیثی تحریک جیسا کوئی دستور العمل نہیں ہے اور نہ ایسی کوئی تخلیق جسے تانیثیت کے حوالے سے شاہکار کا درجہ دیا جاسکے۔ ایسی صورت میں اردو میں تانیثیت کو ہنوز ایک رجحان کی شکل میں دیکھا جائے گا۔

بعض ادیب تانیثیت اور نسائیت کے معنی سمجھنے میں غلطی کرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تانیثی ادب کو نسائیت یا زنانہ پن کے مترادف سمجھ لیا جاتا ہے۔ جب کہ خواتین کے ذریعے تخلیق کردہ ہر ادب کو تانیثی ادب تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اس کتاب میں شامل مضامین میں ان تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اردو کے فروغ میں غیر مسلم قلم کاروں کا کردار

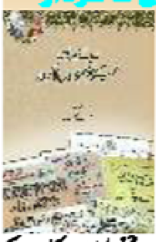

مرتب: اسعد مختار

صفحات: 232، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2015

ناشر: مہتاب پبلی کیشنز جامعہ نگر، نئی دہلی

مبصر: ابرار احمد اجراوی، پوسٹ: اجراء

وایا ریام فیکٹری، ضلع مدھوبنی، بہار

اردو کی جنم بھومی ہندستان ہے۔ اس نے یہیں کی مٹی سے جنم لیا اور یہیں کے رمناؤں، صحراؤں اور کوہ ساروں میں کھیلی کودی اور پروان چڑھی ہے۔ اس نے اپنی پیاس اسی سرزمین پر بہنے والے دریاؤں گنگا اور جمنا سے بجھائی ہے۔ اس کا رسم الخط عربی فارسی سے مستعار ہے اور اس میں عربی فارسی الفاظ کی آمیزش ہے، لیکن اس کی بنیادی ساخت میں ہندوی عناصر کا غلبہ ہے۔ اردو کے 60 فیصدی الفاظ ہندی کی ماں کھڑی بولی سے مستعار ہیں، گویا ہندی اردو دونوں کی جنم داتا ایک ہی زبان ہے۔ اسی لیے ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں بہت ساری مماثلت ملتی ہے۔ اسی مماثلت کے سبب اردو کو اس ملک کی ساری قومی اور مذہبی اکائیوں نے اپنے خون جگر سے سینچا، نہ صرف اس میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کیا، بلکہ باہمی بول چال میں بھی یہی آسان، سلیس اور عام فہم اردو قدر غالب کے طور پر مستعمل رہی ہے۔ اردو ہمیشہ ہندو، مسلمان، سکھ اور عیسائی اور دوسری ہندستانی اکائیوں کی محبوبہ بنی رہی۔ اس کی ترقی میں ہندو مسلمان دونوں نے اپنا خون پسینہ ایک کیا۔ ان حقائق کو منظر عام پر لانے اور اردو کے مشترکہ کردار کو نمایاں کرنے کے لیے ماضی میں بھی مضامین لکھے گئے، کتابیں تالیف کی گئیں، یونی ورسٹیوں میں تحقیق ہوئی، مگر قند مکرر کے طور پر اس کو عصری زاویے سے پیش کرنے اور اس کے دوسرے نکات اور جہات کا ناقدانہ اور غیر جانب دارانہ جائزہ لینے کی ضرورت تھی۔ عصر حاضر کے نوجوان اسکالر اور پندرہ روزہ 'فکر انقلاب' کے مدیر اعلی اسعد مختار نے آل انڈیا تنظیم علماء حق کے زیر اہتمام نہ صرف دار الحکومت دہلی میں ایک قومی سیمینار کا انعقاد کیا، بلکہ اس موضوع پر ملک کے نامور مضمون نگاروں سے مقالہ لکھنے کی درخواست کی اور پھر سیمینار میں پیش کردہ سارے مقالے کو مختلف عنوان کے تحت کتابی شکل میں جمع کردیا۔

'اردو کے فروغ میں غیر مسلم قلم کاروں کا کردار' بظاہر مضامین کا مجموعہ ہے، مگر اس میں علم و ادب، صحافت، تحقیق، شعر و شاعری، نثر نگاری، افسانہ و ناول نویسی، طنز و مزاح، طباعت و اشاعت وغیرہ جن موضوعات کو مس کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اس سے مرتب موصوف کی تلون پسندی اور ژرف نگاہی کا گمان ہوتا ہے۔ اس مختصر کتاب میں کل 19 مضامین اور مقالے شامل ہیں۔ اردو کے فروغ میں غیر مسلم صحافیوں کی خدمات (سہیل انجم)، غیر مسلم قلم کاروں کا تخلیقی نگار خانہ (حقانی القاسمی)، نول کشور اور ریختہ: کتاب کلچر کی بدلتی شعریات (فیاض احمد وجیہ)، اردو تحقیق کے فروغ میں غیر مسلموں کا حصہ (محمد رضوان خان)، اردو صحافت میں غیر مسلموں کا کردار (سید حسنین علی حق)، راجندر سنگھ بیدی کی افسانہ نگاری (تسیم اختر شاہ قیصر)، ہندو شعرا اور اردو شاعری (ڈاکٹر طاہرہ پروین)، گلشن اردو کی آبیاری میں غیر مسلموں کا حصہ (محمد جسیم الدین)، اردو کی غیر مسلم شاعرات (سعدیہ اقبال)، کرشن چندر: اردو افسانہ کا ایک حسین باب (عابد انور)، مالک رام بحیثیت آزاد و شناس (فاروق اعظم)، اردو میں طنز و مزاح اور غیر مسلم قلم کار (عمران عاکف خان)، اردو صحافت کے فروغ میں غیر مسلم صحافیوں کا کردار (نایاب حسن)، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر اور 'یادوں کا جشن' (مولانا شہاب الدین قاسمی)، گوپی چند نارنگ اور اردو میں ساختیات کی بحث (ڈاکٹر انوار الحق)، غالب کی شعریات اور گوپی چند نارنگ (حقانی القاسمی)، فکر تونسوی کی سیاسی طنز نگاری (محمد اظہر)، اردو صحافت کا بے باک لہجہ (ڈاکٹر وسیم راشد)، چند نامور ہندو خطاط (عبد اللہ عثمانی)۔

شروع میں حرف مرتب کے عنوان سے اسعد مختار نے، سیمینار کے انعقاد سے لے کر کتاب کی ترتیب و اشاعت کے سارے مراحل کو بڑے اختصار کے ساتھ قلم بند کیا ہے اور اس موضوع کی وسعت کا خیال رکھتے ہوئے دوسرے ادب نوازوں اور ریسرچ اسکالرس کو بھی اس میدان میں طبع آزمائی اور حقائق کو آشکار کرنے کی دعوت دی ہے۔

کتاب میں شامل مضامین و مقالات اور ان کے مشمولات سے بیک نظر اس کتاب

کی اہمیت اور اس کی جامعیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ایک ہی موضوع پر کئی مضامین شامل کتاب کر دیے گئے ہیں، مگر اس کا امتیاز یہ ہے کہ وہ تکرار واعادہ کے عمل سے پاک ہیں۔انھیں پڑھتے ہوئے یکسانیت اور مماثلت کا احساس نہیں ہوتا۔ایک ہی موضوع پر لکھے گئے مختلف مضامین میں مختلف جہات کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ اردو صحافت کے میدان میں غیر مسلموں کی خدمات پر کئی مضامین شامل ہیں، جو بظاہر چونکاتے ہیں، مگر ان میں جن باتوں اور جن تاریخی حقائق سے پردہ اٹھایا گیا ہے، غیر مسلموں کی ہمہ جہت خدمات کے جن اطراف سے بحث کی گئی ہے، ان میں تنوع اور تلون ہے، ان میں کہیں یک رنگی نہیں ہے۔ اردو صحافت اور غیر مسلم کردار کے حوالے سے مشہور صحافی سہیل انجم کا مضمون حاصل کتاب ہے۔انھوں نے بہت ہی عرق ریزی سے اردو صحافت کے غیر مسلم کردار کو نمایاں کرنے اور ان کے ماضی کو حال سے مربوط کرنے اور آج کے تعصب زدہ سماج کو آئینہ دکھانے کی کوشش کی ہے۔ غیر مسلم شعرا کی تاریخ وتحقیق پر مبنی حقانی القاسمی کا مضمون بھی بنیادی نوعیت کا حامل ہے۔ انھوں نے غیر مسلم شعرا کی تخلیقات کا ناقدانہ جائزہ لیتے، ان کے معانی ومفاہیم کی پرتوں کو کھولتے اور بساط ادب پر ان کے تعین قدر کی کامیاب کوشش کی ہے۔انھوں نے پروین کمار اشک، تلک راج پارس، رام اوتار گپتا مضطر، شیو بہادر دلبر، ٹی این راز، ظفنی وبھا نا زلی، برہم دیو اور سنگیتا پی مینن کے فکر وفلسفہ اور ان کی شعری کائنات سے مباحثہ کیا ہے۔

ریختہ اور منشی نول کشور کی اردو کتابوں کی طباعت واشاعت کے حوالے سے گراں قدر خدمات پر محمد فیاض احمد وجیہ کا مضمون بھی خاصے کی چیز ہے۔اس طویل مضمون میں انھوں نے اردو کی خدمات کے تعلق سے منشی نول کشور کے کردار سے بحث کرتے ہوئے عصر حاضر کے غیر مسلم اردو خدمت گار سنجیو صراف کی مشہور اردو سائٹ ریختہ کے کردار سے بھی مکالمہ قائم کیا ہے۔

اسعد مختار پوری اردو دنیا کی طرف سے مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اتنے اہم موضوع پر قومی سیمینار کا انعقاد کیا اور اس میں پیش کردہ مقالات ومضامین کو جدید عصری انداز میں منطقی ترتیب کے ساتھ بشکل کتاب جمع کر دیا۔ تاکہ اردو اور غیر مسلم کردار پر تحقیق کا کام کرنے والوں کے لیے یہ کتاب رہنما ثابت ہو۔

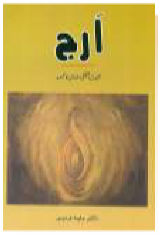

ارج

مصنفہ: ڈاکٹر حلیمہ فردوس

صفحات: 229، قیمت: 115 روپے، سنہ اشاعت: فروری 2015

مبصر: ڈاکٹر رحمت النساء، 37 میٹرو سوپر اسٹور، سیکنڈ فلور،
اوکھلا وہار، جامعہ نگر، نئی دہلی

ڈاکٹر حلیمہ فردوس کی یہ کتاب ان کے تنقیدی وتحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے اپنے تنقیدی وتحقیقی نظریات کو پیش کرنے کے لیے مضامین کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ان کے یہ مضامین اردو ادب کی اصناف کے مختلف موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ اس کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حلیمہ فردوس کا انداز تحریر بہت دلکش ہے۔ ان کو ہر موضوع پر لکھنا آتا ہے۔ بات میں بات نکالنے کے فن سے یہ بخوبی واقف ہیں۔

اس کتاب کا پہلا مضمون 'نسائی غزل میں تصور محبوب' جو اردو کی عشقیہ شاعری کا ایک اہم باب ہے۔ اس کتاب کو جب میں نے پڑھنا شروع کیا تبھی مجھے ایسا لگا کہ ڈاکٹر حلیمہ فردوس ایک اچھی تنقید نگار ہیں۔ اس مضمون میں انھوں نے کچھ شاعرات کے عشقیہ کلام کو خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ انھوں نے اس مضمون میں غزل گو شاعرات کے علاوہ نظم گو شاعرات کا بھی ذکر کیا ہے۔ ان شاعرات میں سارا شگفتہ، شفیق فاطمہ شعریٰ، شبنم عشائی کا ذکر نظم گو شاعرات میں ادا جعفری، ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی، کشور ناہید، زہرہ نگاہ، پروین شاکر، فاطمہ حسن، شاہدہ حسن، عشرت آفریں، بلقیس ظفیر الحسن، رفیعہ شبنم عابدی، نور جہاں ثروت، شہناز نبی، شائستہ یوسف، اشرف رفیع، ترنم ریاض، اور عذرا پروین کے کلام کو تنقید کا موضوع بنا کر اپنے وسیع تنقیدی تناظر کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنی اس کتاب کے دوسرے حصوں میں اپنے تنقیدی و تحقیقی نظریات کو پیش کر کے اپنی زبان و بیان کی خوبی اور دلکش انداز تحریر کا ثبوت دیا ہے۔ انھوں نے اس کتاب (ارج) کے مضامین کو چار شقوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلی شق 'احقاق' دوسری شق 'ارتکاز' تیسری شق 'اختصاص' اور چوتھی شق 'احیا' ہے۔ 'احقاق' میں انھوں نے نسائی ادبی سرمائے سے متعلق مضامین پیش کیے ہیں۔ دوسری شق 'ارتکاز' کے مضامین اردو ادب کی اصناف کے مختلف موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ تیسری شق 'اختصاص' میں اردو ادب کی نامور ہستیوں کے ادبی کارناموں کو تنقید کا موضوع بنایا اور چوتھی شق 'احیا' میں جنوبی ہندوستان کے نمائندہ شاعروں اور ادیبوں کے ادبی کارناموں کو پیش کیا ہے۔

ان مضامین میں مصنفہ نے کہیں کہیں اپنی ترجیحات کو بھی پیش کیا ہے۔ یہ مصنفہ کا کمال ہے کہ موضوعات کا تسلسل پوری کتاب میں برقرار ہے اور کہیں بھی کسی کمی یا تشنگی کا احساس نہیں ہوتا اور جیسا کہ حلیمہ فردوس صاحبہ نے اعتراف کیا ہے کہ تنقید ان کا میدان نہیں ہے لیکن کتاب کے مطالعے کے دوران محسوس ہوتا ہے کہ مصنفہ ایک بڑی تنقید نگار ہیں اور وہ تنقید وتحقیق کے رشتے اور اس کی ساری نزاکتوں سے واقف ہیں۔ انھوں نے 1985 سے تاحال افسانہ نگاروں کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس باب میں انھوں نے جدید افسانہ نگاروں کے ساتھ ساتھ ان سینئر افسانہ نگاروں کے نام کا بھی ذکر کیا ہے جن کا تخلیقی سفر آج بھی جاری ہے۔ مصنفہ نے نسائی غزل میں تصور محبوب 'نسائی مکتوب کا گراں قدر سرمایۂ اردو کی نئی بستیوں کا نسائی افسانوی ادب، نسائی شاعری اور صنفی مساوات، تحریک آزادی کی گم نام شعری نسائی آوازیں، دُکھر آنگن کی رباعیوں کا محرک، عہد ٹیپو سلطان میں دکنی شعر وادب کا فروغ، سلیمان خطیب وغیرہ مضامین کو تنقیدی انداز میں پیش کیا ہے۔ اس کتاب کے علاوہ مصنفہ کی دیگر کئی کتب منظر عام پر آچکی ہیں جن میں 'ماشاءاللہ' طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کا مجموعہ) 1986، 'بہر کیف' (طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کا مجموعہ) 2002، 'الفاظ کی دنیا' (لسانی کھیل) 2007، 'تعلیم وتدریس کے نئے تناظر' (تعلیمی و تدریسی مضامین کا مجموعہ) 2011 بھی قابل ذکر ہیں۔

انشائیہ کی روایت

مصنف/ ناشر: محمد اسد اللہ

صفحات: 320، قیمت: 173 روپے، سنہ اشاعت: 2015

مبصر: عادل حیات
گیسٹ لیکچرر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

اردو کی بیشتر اصناف فارسی وعربی سے مستعار ہیں لیکن بعض ایسی بھی ہیں جن کا تعلق مغربی زبان وادب سے ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حکمراں طبقے کی زبان وادب کا براہ راست اثر مخصوص علاقے کی زبان وادب پر واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔ جس زمانے میں ہندوستان پر مسلمانوں کی حکمرانی تھی تو زندگی کے تمام شعبے بشمول زبان وادب پر ان کے اثرات مرتب ہوئے۔ نتیجے کے طور پر بہت سی اصناف اردو میں رائج ہو کر

شہرت و مقبولیت کی انتہا کو پہنچیں۔ اسی طرح جب انگریز ہندوستان پر قابض ہوئے تو ان کی زبان نے بھی یہاں کی زبان کو متاثر کیا اور نثر و نظم کی کئی صورتیں رائج ہوئیں، انہیں میں انشائیہ کا شمار بھی ہوتا ہے۔ انشائیہ دراصل ہلکی پھلکی تحریر کی ایک ایسی شکل ہے، جس کو پڑھ کر قاری زیرِ لب مسکرانے پر مجبور ہو جائے۔ اردو میں اس کے ابتدائی نقوش ملا وجہی کی 'سب رس' اسداللہ خاں غالب کے خطوط، عطا حسین خاں تحسین کی 'نوطرزِ مرصع' اور رجب علی بیگ سرور کی 'فسانۂ عجائب' میں بھی ملتے ہیں، لیکن باضابطہ طور پر سر سید احمد خاں کی کوششوں نے اس نثری صنف کو تقویت عطا کی۔ اودھ اخبار اور اودھ پنچ کی اشاعت نے اس صنف کو خاص و عام تک پہنچانے میں اہم رول ادا کیا۔ بعد ازاں مہدی افادی، خواجہ حسن نظامی، فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری نے اس صنف کا بخوبی حق ادا کیا۔ بیسویں صدی کے نصف حصے میں مرزا ادیب اور وزیر آغا کی کوششوں کے نتیجے میں انشائیہ کا شعور پہلے کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ ہوا۔ جس کے نتیجے میں نئے لکھنے والوں کی کثیر تعداد دکھائی دینے لگی۔

اردو کے بہت سے ناقدین نے انشائیہ نگاری پر کتابیں تصنیف و تالیف کی ہیں۔ ان میں انور سدید، سلیم اختر، مشکور حسین یاد اور وحید قریشی کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ کئی رسائل کے ضخیم نمبر بھی انشائیہ کی تعبیر و تفہیم کرتے نظر آتے ہیں۔ قارئینِ ادب کے لیے خوشی کا مقام ہے کہ محمد اسداللہ صاحب نے اس جانب مزید پیش رفت کرتے ہوئے انشائیہ نگاری کے فن، اس کی خصوصیات اور ارتقائی مراحل پر مبسوط کتاب 'انشائیہ کی روایت: مشرق و مغرب کے تناظر میں' قلم بند کی ہے۔ اس کتاب کو انھوں نے چھ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے باب میں لفظ 'انشاء' کو موضوع بنایا ہے۔ اس کے بعد انشائیہ کی اصطلاح، تعریف اور شناخت پر روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے انشائیہ اور مضمون میں فرق بتاتے ہوئے طنزیہ و مزاحیہ مضمون اور انشائیہ میں حدِ فاصل کو واضح کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس باب میں انشائیہ کا فن، انشائیہ میں انکشافِ ذات اور منفرد نقطۂ نظر نیز انشائیہ کی زبان پر بھی سیر حاصل بحث ہے۔

محمد اسداللہ نے مغرب میں انشائیہ کی روایت کو اپنی کتاب کے دوسرے باب میں جگہ دیتے ہوئے مانٹین سے لے کر ایلفا آف دی پلو جیسے انشائیہ نگاروں کی تحریر کے حوالے سے انشائیہ نگاری کو سمجھنے اور سمجھانے میں کامیاب سعی کی ہے، جس سے عام قارئین کو انشائیہ کے فنی رموز کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ تیسرے باب میں اردو انشائیہ کے اولین نقوش کے علاوہ سر سید احمد خاں سے لے کر رتن ناتھ سرشار تک کم و بیش تیرہ انشائیہ نگاروں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ چوتھا باب بیسویں صدی میں انشائیہ نگاری پر محیط ہے۔ اس باب میں بھی انھوں نے کم و بیش بیس انشائیہ نگاروں کو موضوعِ گفتگو بنایا ہے۔ چوتھا باب عصری انشائیہ نگاروں سے شروع ہوتا ہے۔ اس باب میں وزیر آغا سے لے کر ناصر عباس نیر تک تقریباً بتیس انشائیہ نگاروں کے حوالے سے فاضل مصنف نے انشائیہ نگاری کو سمجھایا ہے۔ کتاب کے آخری باب میں انشائیہ اور آزادیِ افکار کے مسائل کو حل کیا گیا ہے۔

اس کتاب کا مطالعہ قارئین کے ذہن پر انشائیہ نگاری کی فنی و فکری خصوصیات اور اس کی ابتدا و ارتقا کو ثابت کرنے میں کامیاب تو ہے، لیکن تشنگی کا احساس بھی دلاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ محمد اسداللہ صاحب ہر عنوان کے ساتھ انصاف کرتے تو کتاب کی اہمیت کہیں زیادہ ہوتی۔ محمد اسداللہ صاحب کی زبان سادہ، عام فہم اور سنجیدہ ہے۔ امید ہے کہ اس کتاب کو حلقۂ ادب میں مقبولیت و پذیرائی حاصل ہوگی۔

تذکرۂ ہم نفساں

مصنف: ڈاکٹر محبوب راہی

صفحات: 256، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2014

ناشر: اسباق پبلی کیشنز۔ لوہ گاؤں روڈ پونہ

مبصر: محمد اشرف یاسین، D-103 زہرہ پبلک اسکول، شاہین باغ

ڈاکٹر محبوب راہی 1979 سے 2014 تک لگ بھگ حمد، غزل، نظم، نعت، رباعی، قطعہ، مناجات، تضمینات، طنز و مزاح، تحقیقی مضامین، تنقیدی مضامین وغیرہ پر مشتمل چار درجن کتابیں تحریر کر چکے ہیں۔ انھیں منجملہ کتابوں میں سے ایک کتاب 'تذکرہ ہم نفساں' بھی ہے جس میں علاقہ برار کے ہم عصر قلمکاروں پر لکھے گئے مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ اس کتاب میں تقریباً تمیں لوگوں کا تذکرہ موجود ہے۔

زیرِ نظر کتاب میں بیشتر مضامین مخصوص علاقہ برار کے ہم عصر قلمکاروں سے متعلق ہیں جس میں اکثریت اکولہ ضلع کے قلمکاروں کی ہے۔ امراوتی، ایوت محل، بلڈانہ اور نو تشکیل شدہ واشم پر مشتمل علاقہ برار جغرافیائی اعتبار سے تو نہیں البتہ علمی، ادبی اور تہذیبی اور ثقافتی اعتبار سے اپنی ایک تاریخی اور دستاویزی شناخت رکھتا ہے۔ مراٹھی اکثریت کا علاقہ ہونے کے باوجود حیدرآباد اسٹیٹ سے متصل مملکت حیدرآباد ہی کا ایک حصہ رہنے والا علاقہ برار اردو تعلیم، اردو شعر و ادب اور تہذیب و ثقافت کے اعتبار سے مہاراشٹر کے دیگر علاقوں پر واضح سبقت اور برتری رکھتا ہے۔ (ص 8)۔ ڈاکٹر محبوب راہی تمام کتابوں کی طرح اپنی اس کتاب میں بھی تقریباً تمام قلمکاروں کے ساتھ انصاف کرتے ہوئے نظر آئے ہیں۔

اکبر اچل پوری، مردان علی، خان نشاط، غنی اعجاز، خلیل فرحت، راز لاپوری، ڈاکٹر آغا غیاث الرحمان، انور نشتر، حیدر بیابانی، اقبال خلش، ضیا زخمی، ڈاکٹر لطیف سبحانی احمد، امان الحق، نعیم فراز، شمیم فرحت، عظیم وقار وغیرہ پر مضامین شامل اشاعت نہ کرنے کی وجہ یہ بتایا ہے کہ ان صاحبان پر مضامین میری دوسری کتابوں میں آچکے ہیں جس کی وجہ سے ان پر لکھے گئے مضامین شامل نہیں۔ کتاب کے معرضِ وجود میں آنے کی وجہ ڈاکٹر محبوب راہی نے یہ بتلائی کہ 'بیسویں صدی کے نصف آخر اور اکیسویں صدی کے نصف اول ان سو سالوں کے دوران علاقہ برار میں اردو شعر و ادب کی سمت و رفتار اور مقام و معیار کا اندازہ لگانے میں یہ کتاب یقیناً اہمیت کی حامل قرار دی جائے گی۔

اس کتاب میں جن لوگوں پر مضامین شاملِ اشاعت ہیں ان تمام لوگوں کے نام کچھ اس طرح ہیں سید غلام احمد چشتی اچل پوری، عبداللہ مظہر، غلام ربانی نعیم، مصطفیٰ جمیل، امین جہانگیر جوہر، یحییٰ نشیط، ثریا صولت حسین، ڈاکٹر صفدر، پروفیسر مصطفیٰ خان، رفیق شادا کولوی، ڈاکٹر نور، ڈاکٹر ایم آئی ساجد، عزیز خاں عزیز، قدیر ایاز، محمد یحییٰ جمیل، کلیم صبا، شیخ رحمان اکولوی، شکیل اعجاز، متین اچل پوری، مجیب الرحمٰن، عازم امڑاپوری، شکیل انجینئر، قاضی رؤف انجم، ڈاکٹر اشفاق احمد، امین انعام دار، رفیق شاکر، ہدایت اللہ رہبر، عبداللطیف خان وغیرہ۔

ڈاکٹر محبوب راہی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اتنے اہم موضوع کا انتخاب کیا اور اس موضوع سے حتی المقدور انصاف بھی کیا۔ ڈاکٹر آغا غیاث الرحمٰن کی کتاب 'اردو زبان و ادب کا ارتقاء علاقہ برار کے حوالے سے بڑی مفصل اور کارآمد کتاب ہے جو کہ برار کے شعر و ادب کی چار سو سالہ مکمل اور مضبوط تاریخ بھی ہے۔ علاقہ برار کے حوالے سے خصوصی معلومات حاصل کرنے والوں کو ان دونوں کتابوں کی طرف ضرور رخ کرنا چاہیے۔

اس کتاب کے مصنف ڈاکٹر محبوب راہی کے حق میں نذیر فتح پوری کے اس جملے سے میں مکمل اتفاق رکھتا ہوں کہ ' اللہ تعالیٰ ہر علاقے کو ایک ڈاکٹر محبوب راہی ضرور عطا کرے، جو اپنے علاقے کے فنکاروں کی اس طرح پذیرائی کرے جس طرح محبوب راہی نے اس کتاب کے ذریعہ کی ہے۔" (ص 11)

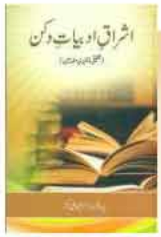

اشراق ادبیات دکن

مصنف: پروفیسر محمد علی اثر
صفحات: 210، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2015
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر: رضا مشہود، جسولہ وہار نئی دہلی

اردو ادب کی خدمت کرنے والے دبستانوں میں ایک دبستان دکن کا بھی ہے جس کی تاریخی، ادبی، ثقافتی، حیثیت آج بھی قائم ودائم ہے حیدرآباد کو ہندوستان کی تاریخ میں اردو ادب کا عظیم مرکز تسلیم کیا جاتا ہے جو تاریخی قدامت اور اردو ادب کے عظیم مرکز کی حیثیت سے اپنے آپ میں ایک مثال ہے۔ پروفیسر محمد علی اثر کا اس علمی شہر سے تعلق ہے۔ دکنی ادب پر زیادہ کام کرنے والوں میں ان کا نام آتا ہے تقریباً چار درجن سے زیادہ کتابیں قارئین وناقدین کی نظر میں مستند ومعتبر مانی جا چکی ہیں۔ کتاب اشراق ادبیات دکن پروفیسر اثر کے مضامین کا مجموعہ ہے۔

مصنف نے دکن میں پھولنے وپھلنے والی تقریباً ہر صنف پر اپنے تنقیدی وتحقیقی تصورات کو پیش کیا ہے پہلا مضمون 'دکنی نثر کا آغاز وارتقا' میں مصنف نے زبان کی ابتدا کے اسباب سماجی ضروریات کو مانا ہے اور اردو زبان کا اولین نقش مذہبی پیشواؤں اور صوفیوں کے کلمات کو قرار دیا ہے۔ محمد تغلق کو دہلی سے دولت آباد پایۂ تخت کا منتقل ہونا بھی تشکیل زبان کے لیے اہمیت کا حامل ہے۔ دکنی ادب کے ارتقائی مراحل بہمنی عہد، عادل شاہی عہد، قطب شاہی دور، اور زوال بیجاپور اور گولکنڈہ کے بعد کے زمانے پر محیط ہے۔ دوسرا مضمون 'ولی کا اثر شمالی ہند کی شاعری پر' ہے۔ ولی نے جن فارسی تراکیب وتشبیہات اور ان کے ترجمہ کو اردو کر کے اردو میں بیان کیا ہے اور جن کا رواج پایا ہے اس کا اس مضمون میں ذکر کیا ہے جن شعرا نے ولی کی زمین میں اشعار کہے ہیں ان کا اجمالی تذکرہ ہے۔

تیسرا مضمون 'ہمرنگ اورنگ آبادی۔ دکنی کے عبوری دور کا مفسر اور شاعر' اس مضمون میں ہمرنگ کا اختصار کے طور پر ذکر ہے اور ہمرنگ کی غیر مطبوعہ تصانیف 'چراغ ابدی' 'دو مثنوی 'دودھ دلیہ، فقہ منظوم' کی نشاندہی کی ہے۔ چوتھا مضمون 'حالی سے پہلے اردو میں نظریاتی تنقید کے نقوش، باقر آگاہ کے حوالے سے' ہے۔ باقر آگاہ نے تقریباً آٹھ مثنوی لکھی ہے اور ہر مثنوی پر نثری دیباچہ لکھا ہے جس میں تنقید کے ابتدائی نقوش کی جھلک دکھائی دیتی ہے اسی بنیاد پر باقر آگاہ کو اردو ادب کا پہلا نقاد تسلیم کیا ہے۔ اور بعض محققین نے تذکرہ نگاروں کو اولیت دی ہے۔ بہرحال تنقید کی ابتدا کے حوالے سے یہ مضمون بہت ہی اہمیت رکھتا ہے۔ پانچواں مضمون 'کدم راؤ پدم راؤ چند معروضات' میں اس کے اصلی نسخے کے حوالے سے گفتگو ہے اس کے اصل متن کے سلسلے میں جو شبہات ہیں اس کا ازالہ کیا ہے۔ چھٹا مضمون 'ڈاکٹر زور کے تدوینی کارنامے' مضمون کی متن کی ترتیب کے سلسلے میں کون سی ادبی اصطلاح درست ہے اس سلسلے میں اردو ادب کے نامور ادیبوں کے نظریہ واصول پر بحث کر کے 'گلزار ابراہیم، کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ، ارشادنامہ، ابراہیم نامہ، تاج الحقائق،، قصص خوب ترنگ کے تدوین متن پر بحث، اردو شاعری کا انتخاب میں بیشترین شعراء کے کلام کی تدوین پر گفتگو، سخن سیریز میں دکن کے استادالشعراء کے انتخاب، فیض سخن میر شمس الدین، رمز سخن سدانند بہاری لال رمز، بادۂ سخن ڈاکٹر احمد حسین مائل، کیف سخن سید رضاء الدین کیفی، متاع سخن نواب عزیز جنگ سے متعارف کرایا ہے ڈاکٹر زور کے تدوینی کارنامے ادبیات دکن کے اہم حصے ہیں اور ان کی تدوینی خدمات پر اثر کا مضمون قابل تحسین ہے۔ ساتواں مضمون 'دکنی کی ایک نایاب مثنوی 'ظفر نامۂ عشق' اس مضمون میں مثنوی کے متن واشعار پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے آٹھواں مضمون 'فدوی اورنگ آبادی دکنی کا صاحب دیوان شاعر' اس مضمون میں فدوی تخلص رکھنے والے دس شعراء کا نام بتایا گیا ہے فدوی اورنگ آبادی کے احوال وآثار جو تذکروں وبیاضوں میں ملے ہیں ان کے اشعار کی خصوصیات وصفات کا بیان کیا ہے دکن میں ایک ہی تخلص کے دس شعراء کی جستجو کے لحاظ سے اہمیت رکھتا ہے۔ نواں مضمون 'ہاشمی بیجاپوری کی ایک ہجویہ مثنوی' اس میں صرف ہجویہ مثنوی کا ہی بیان نہیں بلکہ اس میں ہاشمی کے حالات اور ان کی فن شاعری اور ان کی قصیدہ نگاری ومرثیہ گوئی اور ان کے غیر مطبوعہ کلام کا بھی ذکر ہے اور ہجویہ مثنوی کے حوالے سے یہ مضمون نہایت ہی اہم ہے۔ دسواں مضمون 'لوک گیت،، اپنی نوعیت کا جدا مضمون ہے لوک گیت کے حوالے سے ایک نیا ونایاب کام ہے دکن میں جو جو گیت شادی کے موقع پر چکی، اوکھلا مسل کے گیت اور جن گیت کی طرف اس مضمون میں گفتگو کی گئی ہے یہ دکن ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے بیشتر گاؤں، دیہات، شہر وغیرہ کی تہذیب کا حصہ ہیں۔ گیارہواں مضمون 'ڈاکٹر زور کی سوانح نگاری، اس میں ڈاکٹر زور کے قلم سے ادبا کی جو سوانح وجود میں آئی ہے ان سوانح میں جس بات کا ذکر ہے اس پر بحث کی۔

بارہواں مضمون 'ادارۂ ادبیات اردو کے چند نادر مخطوطات' اس مضمون میں کتب خانہ میں موجود قلمی مخطوطات کا ذکر ہے دیوان ولی اورنگ آبادی، مثنوی نادر، دیوان فدوی، روپ سنگھار، ان مخطوطات کے خط، روشنائی وکاغذ وغیرہ کا ذکر ہے تیرہواں مضمون 'دکنی ادب کے محققین ومحسنین' مضمون ان کی ایک شاگرد محترمہ عسکری صفدر کی کتاب پر تبصرہ ہے جنکی تحریر سے یہ کافی متاثر تھے چودہواں مضمون 'پروفیسر محمود قادری اور مثنوی مخزن عشق' یہ بھی محمود قادری کی کتاب پر تبصرہ ہے۔ پندرہواں مضمون 'محمد امین گجراتی کا ایک نایاب قصیدہ' اس میں ان کے احوال وآثار اور پھر اس قصیدہ کے موضوع، خط اور قصیدہ کے خصوصی پہلو پر بحث کی گئی ہے۔ المختصر یہ کتاب اہم ترین مباحث پر مبنی ہے۔

مضراب سخن

مصنف: شوکت پردیسی، مرتب: ندیم احمد جونپوری
صفحات: 320 قیمت: 300 روپے
ناشر: بلیک ورڈس پبلی کیشنز، تھانے
مبصر: سعید اختر اعظمی

رومان کی جمالیات پاکیزگی عشق اور طہارت فکر کی متقاضی ہے۔ اختر شیرانی کی رومانیات میں یہی عنصر کارفرما ہے۔ شوکت پردیسی (محمد عرفان جونپوری) کی رومانیت غم جہاں اور غمِ دوراں کے ساتھ غم جاناں کی بھی نمائندگی کرتی ہے۔ انھوں نے جو کچھ معاشرے سے کشید کیا اسے کسی مبالغہ کے بغیر قاری کے سامنے پیش کر دیا۔ شوکت پردیسی اختر شیرانی کی شاعری کے شیدا رہے ہیں اس لیے انھوں نے اسے اپنے فکری تلازمے کا جزو بنایا ہے۔

شوکت پردیسی کے فرزند ارجمند ندیم احمد حالیہ ترتیب 'مضرابِ سخن' سے قبل بچوں کے لیے لکھی گئی نظموں کو 'تحفۃ الاطفال' کے نام سے مرتب کر چکے ہیں۔ زیر نظر مجموعہ

منظومات، گیتوں اور تہنیتی نظموں پر مشتمل ہے۔ ان نظموں میں ہجر و وصال کے ساتھ فلسفۂ حیات پر گفتگو ہے تو گیتوں میں ساجن سے باتیں کرنے کا ارمان، برہن کی اٹھک بیٹھک، پپیہے کی پی ہو اور کوئل کی کوک نمایاں ہے۔ تبریک و تہنیت کے تحت سہرے اور رخصتی کو شامل کیا گیا ہے۔ چند رنگ و آہنگ ملاحظہ ہوں:

اٹھا صراحی سے، جام آخری پی لیں
بس ایک سانس متاعِ حیات ہے اے دوست
فروغِ ماہ، طلسم بہار کچھ بھی نہیں
نشاطِ لالہ و گل ایک رات ہے اے دوست

تمہاری یاد بھی ہوتی نہ گر شریکِ الم
تو ایک سانس بھی لینا عذاب ہو جاتا
جہنموں سے جو بخشا تھا حوصلہ تم نے
رہینِ درد و غم و اضطراب ہو جاتا

رات آتی ہے تو بڑھ جاتی ہے دل کی وحشت
تیری دیدۂ نم ناک ہوئی جاتی ہے
اب بھی میں تم کو بہت یاد کیا کرتا ہوں
زندگی عالمِ تنہائی سے گھبراتی ہے

شاہ اجمل فاروق ندوی، ڈاکٹر تابش مہدی، ڈاکٹر شمینہ تابش اور سید راشد حامدی کی موقر آرا سے مرصع یہ مجموعہ روایت کے حقائق کو حسن و فن سامنے لاتا ہے۔ عدیم احمد کی یہ کوشش یقینی طور سے لائقِ تحسین ہے۔

سنہری فیصلہ

مصنف: ڈاکٹر اطہر مسعود خاں
صفحات: 112، قیمت: 150 روپے، سنہ اشاعت: 2015
ناشر: اسحاق پبلی کیشنز، لوہا گاؤں، رودولی
مبصر: صبا امبرین، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

'سنہری فیصلہ' ڈاکٹر اطہر مسعود خاں کی بچوں کے لیے تحریر کردہ کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ اسے انھیں کی ایک شاگردہ ایمن جمیل نے مرتب کیا ہے۔

ڈاکٹر اطہر مسعود خاں نے افسانہ، انشائیہ، تنقید، تحقیق، اشاریہ سازی میں طبع آزمائی کی ہے۔ اس کے علاوہ بچوں کے ادب کے متعلق بھی ان کی بہترین تخلیقات ہیں۔ بچوں کے لیے لکھے جانے والے ادب کا خاص مقصد ان کی تربیت اور اصلاح سے وابستہ ہوتا ہے۔ یہ بچے جو آج چھوٹے ہیں کل یہی بچے معاشرے میں اہم کردار ادا کریں گے۔ اس لیے یہ بہت ضروری ہو جاتا ہے کہ بچوں کا اخلاق اچھا ہو اور ان کی تربیت اس نہج پر کی جائے کہ وہ باشعور اور بااخلاق انسان بن کر سامنے آئیں۔ بچے جو بات کسی کے سمجھانے سے نہیں سمجھ پاتے۔ وہی بات کہانی کی شکل میں سن کر سمجھ لیتے ہیں اور اس پر عمل بھی کرتے ہیں۔ سبق آموز کہانیاں جو اخلاقی اور تربیتی ہوں۔ بچوں کی تربیت میں مدد کر سکتی ہیں۔ بچے کہانیوں کے ساتھ نفسیاتی طور پر جڑے ہوتے ہیں اور ان کا اثر جلدی قبول کرتے ہیں۔ کہانی اور بچوں کا تعلق بہت پرانا اور گہرا ہے۔ یہ قدیم روایت رہی ہے کہ دادی نانی چھوٹے بچوں کو سبق آموز کہانیاں، تاریخی واقعات پر مبنی کہانیاں سناتی تھیں یا پھر ان کی والدہ انھیں کہانیاں سنایا کرتی تھیں۔ جو ان کی اخلاقی و ذہنی تربیت میں مدد کرتی تھیں۔ کہانیوں کا یہ سلسلہ آج بھی قائم ہے۔ ڈاکٹر اطہر مسعود خاں نے اسی سلسلے کو آگے بڑھایا ہے۔ ڈاکٹر اطہر نے بچوں کے لیے تقریباً 80 کہانیاں لکھی ہیں ان کی سبھی کہانیاں سبق آموز ہونے کے ساتھ اخلاقی اور تربیتی ہوتی ہیں جو بچوں کو متاثر کرتی ہیں اور ان کے اخلاق و عادات کی اصلاح کرتی ہیں۔

کہانی لکھنا مشکل فن ہے اور بچوں کے لیے کہانی لکھنا زیادہ دقت طلب اس لیے ہے کہ بچوں کی نفسیات، ان کی چھوٹی چھوٹی خواہشوں، ضدوں، شوق، عادات و اطوار، کھیل کود کے رجحان اور طریقوں کو سمجھنا ضروری ہے ان تمام معاملات کو اطہر صاحب بخوبی سمجھتے ہیں اس کتاب میں موجود تمام کہانیوں میں بھی ان باتوں کا خیال رکھا گیا ہے سبھی کہانیاں سبق آموز ہونے کے ساتھ موجودہ دور میں بچوں سے وابستہ مسائل کو بھی بیان کرتی ہیں اور ان کی نفسیات کو سمجھنے میں مدد کرتی ہیں' آنسوؤں کی قیمت' ماں باپ اور بچوں کے خوبصورت رشتے کو بیان کرتی سبق آموز کہانی ہے جہاں ماں باپ کی قربانیوں اور محبت کو بیان کرنے کے ساتھ ان کی قدر و قیمت کو بیان کرتی ہے اور بری صحبت کے اثر سے بچوں کے اخلاق پر پڑنے والے مضر اثرات سے ان کی سوچ پر پڑنے والے منفی اثرات کی عکاسی کرتی ہے۔ اس کے علاوہ زندگی میں اخلاق کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اخلاق کی کوئی قیمت نہیں یہ انمول ہوتا ہے۔ بہترین حسنِ اخلاق کے ذریعے دنیا کو اپنا بنایا جا سکتا ہے۔ کامیاب زندگی کے اس راز کو خوبصورتی سے بیان کرتی 'احتساب'، 'فاتح یورپ'، 'ایک تماچہ' جیسی سبق آموز تاریخی کہانیاں موجود ہیں۔ جھوٹ اور سچ میں فرق کرتی کہانی 'دودھ کا دودھ' جو انسان کی زندگی میں اس کی نیت اور اس کے ضمیر کی اہمیت کو بیان کرتی ہے۔ لالچ اور مکر و فریب کی برائیوں کو بیان کرتی کہانی 'سیر پہ سوا سیر' بھی موجود ہے۔ انسانیت کی تعلیم دیتی ہوئی کہانی 'سچا تبرک' ہے۔ اس کے علاوہ استاد کی عظمت، صلہ رحمی، بہترین اخلاق کی بدولت ملنے والی کامیابی، دوست کی پہچان، جیسے موضوعات کو نہایت خوبی سے بیان کیا ہے۔ ان کی کہانیوں کی زبان سادہ اور سلیس ہونے کے ساتھ اپنے مقصد کو واضح طور پر بیان کرتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی بچوں کی ذہنی تربیت کے لیے بامحاورہ جملے بھی استعمال کرتے ہیں

اور جہاں کہیں ضرورت ہوتی ہے وہاں زبان میں کہیں شوخی، کہیں سادگی کہیں نرمی موجود ہے۔ مختصر یہ کہ کہانی کو بااثر اور دلچسپ بنانے کے لیے مناسب لفظوں اور بہترین اسلوب کا انتخاب کرتے ہیں۔

امید ہے کہ یہ کتاب بچوں کے ادب میں اہم اضافہ ثابت ہوگی اور قارئین اس کتاب سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ اس سے مستفید ہوں گے۔

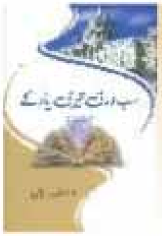

سب ورق تیری یاد کے

مصنف: ڈاکٹر شگفتہ یاسمین
صفحات: 168، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2015
ناشر: ٹریل ایف پبلی کیشنز
مبصر: محمد شہاب الدین رحمانی قاسمی
D-41 بی ۔ سی کالونی، احمد پوری، نئی دہلی 12

ڈاکٹر شگفتہ یاسمین ان فنکاروں میں سے ہیں جن کی تحریریں جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہوتی ہیں۔ ان کی تحریروں میں زندگی کے مختلف رنگ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ مصنفہ نے اپنی پہلی تصنیف کو 'پانی سے آنکھی تک' اور دوسری تصنیف کو 'اردو کی علاقائی صحافت اور غیر ملکی ادارے' کے نام سے وجود بخشا۔ یہ دونوں کتابیں صحافت اور ادب سے تعلق رکھنے والوں کے لیے کارآمد ہیں۔

مصنفہ نے اپنی اس تصنیف 'سب ورق تیری یاد کے' کو پانچ عناوین میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا عنوان 'میرے دل میرے مسافر' ہے۔ اس عنوان کے تحت واشنگٹن کے حالات اور وہاں منعقد ہونے والے اجلاس کا ذکر کیا ہے۔ واشنگٹن میں واقع وہائٹ ہاؤس کا ذکر وہ اس طرح کرتی ہیں:

"واشنگٹن ڈی سی میں 1600 پنسلوینیا ایونیو این ڈبلیو پر واقع وہائٹ ہاؤس امریکی صدر کی سرکاری رہائش گاہ ہے اور یہیں ان کا دفتر بھی ہے۔ 1800 میں جان ایڈمس سے لے کر آج تک یہ ہر امریکی صدر کی رہائش گاہ رہا ہے۔ اس کا نقشہ آئرلینڈ میں پیدا ہوئے James Hoban نے تیار کیا تھا۔ 1792 اور 1800 کے درمیان اس کی تعمیر ہوئی۔" (ص 28)

اس عمارت کے تاریخی پس منظر پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسی طرح وہائٹ ہاؤس کمپلیکس میں کن کن لوگوں کے آفس ہیں، ایگزیکیٹو آفس بھی اسی عمارت میں ہے۔ نیز واشنگٹن ڈی سی کی وجہ تسمیہ اور کس نے اس شہر کو دریافت کیا واضح انداز میں پیش کیا۔

"واشنگٹن مونومنٹ جارج واشنگٹن کی یاد میں بنایا گیا ہے.... یہ پتھر سے بنایا گیا دنیا کا طویل ترین Structure اور دنیا کا سب سے لمبا ستون ہے۔ جس کی لمبائی 169 میٹر ہے۔" (ص 30)

دوسرا عنوان 'آتش گل کے نکھار کا موسم' ہے، جس میں جیکسن مسی سپی کے گزرے ہوئے لمحات کو قلمبند کیا ہے۔ تیسرا عنوان 'دست ساقی میں آفتاب آئے' جو ایک نہایت معنی خیز اور شاعرانہ عنوان ہے۔ انھوں نے شہر پیکاس کو آفتاب سے تشبیہ دی ہے۔ اس کی تاریخی حیثیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتی ہیں:

"امریکہ کا حصہ بننے سے پہلے اس پر فرانس اور اسپین کا تسلط تھا اور پھر یہ میکسیکو کا حصہ بن گیا۔"

چوتھا عنوان ہے 'کیف میں ہے تقاضائے حیات' اس میں سفر سان فرانسسکو کے سفر کو الفاظ کی لڑی میں پرو دیا ہے۔ کتاب کا آخری حصہ جس کو مصنفہ نے 'ہم کہ ٹھہرے اجنبی' کا عنوان دیا ہے۔ اس کے تحت امریکہ سے روانگی کے وقت دل گرفتہ احساسات کو الفاظ کا جامہ پہنایا ہے۔ مصنفہ نے نہ صرف اپنی کتاب کو سجے اور اچھوتے عنوانات دے کر قاری کی توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی بلکہ جگہ جگہ پر اچھے محاورات، استعارات و کنایات اور عربی و فارسی کے خوب صورت اور پر قوت جملے استعمال کر کے مزید زینت بخشی۔

کتاب کے ابتدائی اوراق میں انھوں نے کچھ یادگار تصویریں لگا رکھی ہیں جو ان کی اہم نمائندوں سے ملاقات، وہاں کی آب و ہوا اور خوشگوار فضا کی گواہی دے رہی ہیں۔ وہ اپنے الفاظ میں وہاں کی خوبصورتی کا نقشہ اس طرح بیان کرتی ہیں:

"...ذہن اس بات کو بیٹھا اور دل فیصلہ کرنے سے قاصر تھا کہ کون سا شہر زیادہ اچھا لگا؟ کہاں کے لوگ زیادہ بھلے محسوس ہوئے؟ اور کس بات نے دامن دل کو اپنی جانب کھینچا...؟" (ص 134)

ڈاکٹر شگفتہ یاسمین نے امریکہ کی وزارت خارجہ کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے 4 ریاستوں کے اجلاس میں نہ صرف اپنی شمولیت درج کرائی بلکہ وہاں کی ہر ایک چیز کا بغور مطالعہ کر کے ان کو قلمبند بھی کیا اور تہذیب و ثقافت سماجی و علمی سرگرمیوں سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے سفرنامہ کی شکل میں وہاں کے حالات سے واقف کرایا۔

دوران مطالعہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ سفرنامہ ہی نہیں بلکہ کبھی تاریخ کی تو کبھی سیاست کی کتاب محسوس ہوتی ہے کیونکہ مصنفہ نے ہر ایک پہلو کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

مصنفہ نے 10 افراد پر مشتمل قافلے کی اس سیر کو خوب صورت گلدستہ کی شکل میں پیش کیا۔ کتاب کا سرورق اور ٹائٹل عمدہ ہے۔

مختصر تبصرے

نکات

مصنف: مسعود احمد استوی، صفحات: 230، قیمت: 100 روپے، سنہ اشاعت: 2015

ناشر: حضرت علامہ امانی اکادمی، پلی کنڈہ، جمل ناڈو

یہ مجموعہ دو سو تیس صفحات پر مشتمل ہے۔ صفحہ نمبر 3 سے 32 تک بحری باحت علامہ امانی کی فارسی مثنوی کے 153 اشعار اور ایک طویل نظم کے 38 اشعار بطور نمونہ نقل کیے گئے ہیں، پھر علامہ امانی کے دو نثر پارے بہ عنوان 'امکان کذب' اور 'مسئلہ کی حقیقت' شامل کیے گئے ہیں، اس کے بعد راہی فدائی کا ایک مضمون جو علامہ امانی کی سیرت و شخصیت کا تعارف پیش کرتا ہے، شامل ہے۔ نیز مختلف عناوین کے تحت مثلاً قیاس و اجتہاد، اجتماعی قربانی، طلاق ثلاثہ، حوار تسیم انصاری وغیرہ موضوع تحریر ہے۔ اس کے علاوہ کم و بیش 72 صفحات نثر پارے کے لیے مختص کیے گئے ہیں، جس میں مختلف موضوعات پر چند فقروں میں نکات پیش کیے گئے ہیں۔ مثلاً: لاہوت، صوفی، مرد مومن، اختلافی مسائل میں الجھا ہوا ہے شراب، ہندو مسلم، نفس کی پاکی، انسان، خودی کی نعمت، یزید، اللہ والے، اسی طرح کے بہت سے موضوعات شامل مجموعہ ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ صاحب کتاب نے کسی طرح کی ترتیب و تہذیب کا خیال نہیں رکھا اور نہ ہی صحت مضمون کا پاس و لحاظ۔ مزید حیرت یہ ہے کہ نثر و نظم اور (دیگر شعرا کا) کلام اس قدر خلط ملط ہے کہ یہ امتیاز کرنا مشکل ہو گیا کہ آیا استوی کا کلام کہاں کہاں درج ہے؟۔

بہر کیف زیر تبصرہ کتاب میں استوی کا کلام کم و بیش سو (100) صفحات کو محیط ہے جس میں غزلوں کی تعداد تقریباً چالیس پچاس ہیں، کچھ نظم معریٰ، کچھ رباعیات، کچھ دعائیں اور کچھ شاعری کی ہیئت میں نئے تجربات (متفرق اشعار)۔ کلام کے مطالعے سے ظاہر ہوتا کہ استوی شاعری کے میدان میں ابھی ابتدائی مراحل میں ہیں۔ امید ہے کہ ریاضت سخن کے ذریعے جلد از جلد فکر اور فن دونوں کی ہم آہنگی سے اپنی شاعری کو قارئین کے لیے جاذب دل بنائیں گے۔ ایسے ان کی شاعری میں ارتقا نظر آتا ہے۔ بعض غزلیں اور بعض غزلوں کے اشعار بہت عمدہ ہیں، جن میں فکر بھی ہے اور فن بھی۔ مثلاً غزل صفحہ نمبر 44، 46، 49، 57، 166، 171، 198 وغیرہ۔ لیکن میں مجبور ہوں کہ فیصلہ اکثریت پر ہوتا ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

قدم بڑھاتے چلو راہ پر خطر ہی سہی — تمام عمر گزر جائے در بدر ہی سہی
چراغ بن کے میں جلتا رہوں دوسروں کے لیے — ترا بگڑتا ہے کیا، کیوں مجھے بجھاتا ہے
درد دل پاس وفا جذبۂ ایماں مسعود — آدمیت ہے یہی درجۂ اعلیٰ یارو
میں نے سوچا بھی تھا اظہار تمنا کردوں — جب زباں کھولی تو لفظوں نے بغاوت کردی
تمھارے جبر کا میں نے حساب رکھا ہے — جگر کے زخم کو مثل گلاب رکھا ہے

مصنف کو اس پر توجہ دینے کی اشد ضرورت ہے کہ کاتب نے املا کی غلطیاں کثرت سے کی ہیں، صحت املا کی عدم دیت نے بعض اشعار کے مفہوم کو بھی مفقود کر دیا ہے، جس کی اصلاح بہت ضروری ہے۔ نیز اگر مصنف اس کتاب کے نثر پاروں کو مع سند شروع میں مرتب کر دیں تو یہ عمل قاری کے لیے سودمند ہوگا۔

بکھرتی ساعتوں کا سلسلہ

مصنف: حنیف ساحل، صفحات: 128، قیمت: 64 روپے

ناشر: گجرات اردو ساہتیہ اکادمی، گاندھی نگر

حنیف ساحل کا تعلق احمد آباد گجرات سے ہے۔ وہ اپنی مادری زبان گجراتی کے قادر الکلام شاعر ہیں۔ اب تک ان کی گجراتی غزلوں کے چار شعری مجموعات ادبی دنیا سے داد و تحسین

حاصل کر چکے ہیں۔ ان کے دو شعری مجموعے "پیاسے تارا تارا" اور "گفتگو" گجراتی ادب میں مقبول عام ہیں۔ ان کا گراں قدر کام یہ ہے کہ انھوں نے اردو اور گجراتی ادب کو باہم گلے لگایا، وہ اس طرح کہ اردو کے نامور شعرا مثلاً فراق، فیض، جعفری، شکیب جلالی، کیفی اعظمی، بدر واصلی، محمد علوی، عادل منصوری اور شہریار وغیرہ کے کلام کو گجراتی زبان میں منتقل کر کے متعارف کرایا۔ اسی طرح دوسرا اہم کام یہ کیا کہ انھوں نے گجراتی رسائل و جرائد اور روزناموں میں اردو شعرا پر مضمون لکھے ہیں۔ بیان کی انفرادی شناخت ہے۔ نیز اردو دوستی کی واضح مثال یہ ہے کہ انھوں نے احمدآباد یونیورسٹی کے لیے تحقیقی سطح پر اردو غزلوں کا ایک مجموعہ بھی آپ کو پیش کیا ہے۔

زیر تبصرہ "منگری ساحلوں کا سلسلہ" حنیف ساحل کی اردو غزلوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ اس میں کل ایک سو آٹھ (108) غزلیں ہیں۔ ان غزلوں کے مطالعے سے اندازہ ہوا کہ حنیف ساحل اردو میں بھی اپنی فکر کو فن کے قالب میں ڈھالنے کا ملکہ رکھتے ہیں، ان کی شاعری میں ایک خاص قسم کی تازگی اور ندرت پائی جاتی ہے، جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی غزل کی اساس نہ تو روایتی خطوط کو مستعار لے کر قائم کیا اور نہ عصری رجحانات پر۔ بلکہ انھوں نے اپنے مشاہدات و تجربات کو فن کی دنیا میں ڈبو کر مستقبل کے آئینہ خانہ سے اتنی سادگی اور خلوص سے پیش کیا کہ ان کی غزل زندگی کے ہر رنگ میں بہار کا اثبات تلاش کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

حنیف ساحل فکر کو موزوں کرنے کا سلیقہ اور لفظوں کے برتنے کا ہنر جانتے ہیں۔ اس لیے ان کی شاعری ایک مخصوص لے رکھتی ہے۔ جس میں مختلف جلوہ سامانیوں کا ظہور ہوا ہے۔ امید ہے کہ ساحل کی شعری سے قاری محظوظ ہوں گے اور انھیں داد و تحسین سے نوازیں گے۔

شعر فن

مصنف/ناشر: افسر آغا لکھنوی

صفحات: 144، قیمت: 200 روپے

ادبی دنیا میں افسر آغا لکھنوی کا تعارف محتاج بیان نہیں۔ ان کا کلام ملک اور بیرون ملک کے جرائد و رسائل میں بڑی آب و تاب کے ساتھ مسلسل شائع ہوتا رہا ہے، جسے ادبی دنیا کا ہر طبقہ پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے۔ آج سے تقریباً اٹھارہ سال قبل ماہنامہ "نکہت گل" مئی 1997 کے شمارے میں بہ عنوان "اس ماہ کا شاعر" افسر آغا کا منتخب کلام شائع ہوا تھا۔ اسی طرح ادارۂ مصنفین ہند نے ان کے منتخب کلام کو "شعر فن" کے عنوان سے شائع کیا۔ اس مجموعے کو ان کی شریک حیات سیدہ نگل فاطمہ نے منتخب و مرتب کر کے کمپیوٹر ورک قمر دہلی سے مشتہر کرایا ہے۔ اس کتاب کا سرورق نہایت خوبصورت ہے۔ سرورق کے دونوں طرف اسد رضا، ڈاکٹر تابش مہدی اور ہوش نعمانی کی نگارشات ہیں جو حقیقی طور پر افسر آغا کی مقبولیت کا اعلامیہ ہے۔ آغاز کتاب میں ڈاکٹر حسن احمد نظامی کا "منفرد لب و لہجہ کا شاعر"، حقانی القاسمی کا "دو حرف" اور ڈاکٹر منور حسن کمال کا "افسر آغا کا شعری ابلاغ اور تحول" مختصر مگر جامع مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ یہ تینوں تحریریں افسر آغا کی خصوصیت شاعری کو موضوع بحث بناتی ہیں، جن کا مطالعہ قاری کے علمی اضافے کا سبب ہوگا۔ باقی اس کتاب میں مصنف کا "پیش لفظ"، ایک حمد، ایک سو پانچ غزلیں، متفرق اشعار شامل ہیں۔ ان کے کلام پر کسی طرح کی گفتگو کرنے سے قبل ضروری ہے کہ "پیش لفظ" کی طرف آپ کی توجہ مرکوز کروں۔ اول: شاعر کو اپنے کلام کی از خود تعریف و توصیف اور خصوصیت کلام کی نشان دہی نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ تعلی کا پہلو پیدا ہوتا ہے، یہ عمل قاری کا ہے یا صاحب تحقیق کا نہیں۔ ہاں شاعر کو اپنا موقف اور نقطۂ نظر بیان کرنے میں کوئی عار نہیں۔ دوم: صاحب کلام کو اپنے اشعار یا اشعار کے الفاظ کے معنی کا تعیین نہیں کرنا چاہیے، کیوں کہ اس سے معنی خیزی کا راستہ مسدود ہو جاتا ہے۔ اب افسر آغا کا نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

سمجھا تھا جسے دل کی تباہی کا وسیلہ — اکثر وہی تسکین دل و جاں نظر آیا
میں جا رہا تھا باد معطر کی سمت پر — خوشبو مہک رہی تھی۔ کوئی گلشن پاس تھا؟
بشر کے بھیس میں انسانیت کا سوداگر — حقیقتوں سے گریزاں۔ دکھائی دیتا ہے
فاقہ مستی کا ہنر بھی کس قدر نایاب ہے — پیٹ بھر جاتا ہے افسر غم پہ غم کھانے کے بعد

مذکورہ اشعار میں افسر آغا کی شاعری کے مختلف رنگ نمایاں ہیں، جن میں حسن بھی ہے اور فکر بھی۔ ان کے کلام کی تازگی، ندرت، زبان و بیان کی لطافت، مضامین کی رنگینی و چاشنی اور ان سب سے بڑھ کر اس کا اچھوتا پن قاری کو بلا قصد اپنی گرفت میں لیتا ہے۔ امید ہے کہ ہر صاحب ذوق کے لیے ان کی شاعری مسرت و بصیرت کا سبب ہوگی۔

جنون خواب

مصنف: فراغ روہوی، صفحات: 176، قیمت: 100 روپے

ناشر: گلستان پبلی کیشنز، کلکتہ

"جنون خواب" کے مصنف کا اصلی نام محمد علی صدیقی ہے، لیکن ادبی دنیا ان کے قلمی نام فراغ روہوی سے جانتی ہے۔ ان کے اظہار فن میں حمد، نعت، غزل، نظم، رباعی، ماہیے وغیرہ موجود ہیں۔ ان کا پہلا مجموعہ "چھیاں چھیاں" (ماہیے) 1999، دوسرا مجموعہ "ذرا انتظار کر" (غزلیں) 2002، تیسرا مجموعہ "مرا آئینہ مدینہ" (نعتیہ کلام) 2003، چوتھا مجموعہ "جب ہم بڑے ہو جائیں گے" (شاعری برائے اطفال) 2004، پانچواں مجموعہ "ہم بچے ہیں پڑھنے والے" (نظمیں برائے اطفال) 2012 اور چھٹا مجموعہ "جنون خواب" (رباعیات) 2013 میں منظر عام پر آکر ادبی محفل سے داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

ان کا یہ قدم کہ انھوں نے باضابطہ اپنا ایک مکمل شعری مجموعہ "جنون خواب" صنف رباعی کو معنون کیا۔ جبکہ آج مضطرب زندگی کے دور میں ہمارے ادبا اور شعرا بعض کلاسیکی اصناف سے بے توجہی اور پہلوتہی اختیار کرتے جا رہے ہیں۔

مبارک باد کے مستحق ہیں فراغ روہوی کہ انھوں نے صنف رباعی کی روایت کو مستحکم کیا اور انھوں نے اپنے آپ کو ابوالحسن خرقانی، ابوشکور بلخی، رودکی، عمر خیام، سودا، انیس، دبیر، مومن، امجد حیدرآبادی، میر حسن، حالی، اقبال، جوش، فراق اور تلوک چند محروم کی فہرست میں شامل کیا۔ زیر تبصرہ کتاب میں مصنف نے کم و بیش چار سو بائیس (422) رباعیات مختلف موضوعات پر نظم کی ہیں۔ بطور مثال محض دو رباعی پیش کی جاتی ہیں:

پانی کے لیے ہاتھ نہ جوڑا جائے — کچھ زعم سمندر کا بھی توڑا جائے
ہے پاس اتنا تم میں اگر تشنہ لبو! — اب تھل کے چٹانوں کو نچوڑا جائے

دوسری رباعی ملاحظہ ہو:

ہم گیسوئے دوراں کو سنواریں گے سدا — ہم حسن و جمال اس کا نکھاریں گے سدا
فن اپنا سلامت ہے تو فن پاروں میں — ہم اس کے خد و خال ابھاریں گے سدا

انھوں نے اپنی رباعیات کو پانچ حصوں میں منقسم کیا ہے۔ کلاسیکی روایت کی تجدید کرتے ہوئے انھوں نے اپنے مجموعے کا آغاز حمد اور نعت سے کیا ہے۔ "دیار جاہ و جلال" میں اللہ رب العزت کی حمد و ثنا اور اوصاف کبریا کو بیان کیا ہے، "دیار خوش خصال" میں اللہ کے نبی حضرت محمد کی تعریف و تحسین اور آپ کے خصائل کو پیش کیا ہے، "دیار کمال"، "دیار جمال" اور "دیار بے مثال" میں اپنے فکری اور فنی جوہر کو دکھلایا ہے۔ جس میں زبان و بیان کی لطیف نزاکت اور نفاست و شائستگی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ نیز ان کی رباعی میں نئی لفظیات و تراکیب اور علامات و استعارات کی نئی معنویت قاری کو مسحور کر کے وجد طاری کرتی ہے۔

مبصر: شاکر علی صدیقی، ریسرچ اسکالر جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

عالمی اردو نامہ

ایک شام مشہور شاعر و محقق اسلم بدر کے نام

الجبیل کی ادبی انجمنوں کو جب یہ اطلاع ملی کہ شہر میں

شہرت یافتہ شاعر و محقق محترم اسلم بدر صاحب تشریف لائے ہوئے ہیں تو ان کے اعزاز میں شعری نشستوں کا ایک سلسلہ چل نکلا۔ شہر کی ایک سربرآوردہ و فعال ادبی انجمن "گوشۂ ادب" نے بھی 'ایک شام اسلم بدر کے نام' منعقد کرنے کا فیصلہ لیا اور یہ شام نہایت تزک و احتشام کے ساتھ 'نوشیان رسٹورنٹ' کے کانفرنس ہال میں منائی گئی۔ تقریب کے وقار کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر کرم علی خان (علیگ) صدارت کی کرسی پر جلوہ افروز تھے۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے، جدہ سے تشریف لائے ہوئے شاعر و محقق محترم سید نعیم حامد الحامد شریک تھے اور مہمان اعزازی کے طور پر سعودی بحریہ کی ریسرچ لیبارٹری کے محترم ڈاکٹر وجاہت فاروقی (علیگ)۔

جلسے کے آغاز میں اقبال واحد نے صدر و دیگر مہمانان کا اجمالی تعارف پیش کرتے ہوئے اسلم بدر کی شخصیت و شاعری پر بھرپور روشنی ڈالی۔ یہ جلسہ دو حصوں میں منقسم تھا۔ پہلے حصے میں اسلم بدر کی تازہ ترین شعری تخلیق 'بوند سمندر' کا اجرا ڈاکٹر کرم علی خان کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ محترم سید نعیم الحامد نے اسلم بدر کی خدمت میں اعزاز کے طور پر گوشۂ ادب کی جانب سے ایک میمنٹو پیش کیا۔ بعد ازاں جناب فیاض احمد صاحب نے 'اسلم بدر میری نظر میں' کے عنوان سے ایک دلچسپ خاکہ پڑھا، جسے خاصا پسند کیا گیا۔ اقبال واحد نے بھی اسلم بدر کی شعری جہات پر روشنی ڈالی اور 'بوند سمندر' پر اپنی رائے پیش کی۔ جلسے کے دوسرے دور میں مہمان شعرائے کرام سید اشعر، ایوب صابر، ثاقب جونپوری، سید باقر نقوی علیگ، ڈاکٹر اقبال واحد، ابو شارق، ضیاء الرحمن صدیقی، محمد عبدالسلیم، ڈاکٹر سجاد سید، اقبال طالب، نعیم حامد الحامد نے اپنے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

'علم' کے عنوان سے اسلم بدر نے ایک پُر مغز نظم بھی سنائی، جس کے کئی کئی شعر بار بار سنے گئے۔ جلسے کا اختتام صدر جلسہ ڈاکٹر کرم علی خان (علیگ) کے خطبۂ صدارت پر ہوا۔ خطبہ کے دوران ڈاکٹر صاحب نے قدیم علی گڑھ روایات کے تحت اپنے مخصوص انداز میں مشاہیر کے اشعار پر پیروڈیاں سنائیں۔

رپورٹ: ڈاکٹر اقبال واحد، صدر گوشۂ ادب، الجبیل، سعودی عرب، 28 دسمبر 2015

بزم سائنسی ادب کی دو سو چھتیسویں ماہانہ نشست کا انعقاد

بزم سائنسی ادب کی دو سو چھتیسویں نشست ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی سائنس سینٹر (گلشن اقبال، کراچی) میں منعقد ہوئی جس کی صدارت عہد حاضر کے ممتاز شاعر، دانشور اور استاد پروفیسر محمد رئیس علوی (ڈائریکٹر خادم علی شاہ بخاری انسٹیٹیوٹ آف ٹیکنالوجی) نے کی۔ سردار تابش نے گزشتہ نشست کی روداد سنائی جبکہ ڈاکٹر نزہت عباسی نے نظامت کے فرائض سرانجام دیے۔ ڈاکٹر نزہت عباسی نے کہا کہ بزم سائنسی ادب گزشتہ تیئیس سال سے سائنس اور ٹیکنالوجی کی عوامی آگہی کے فروغ کی کوششوں میں مصروف ہے۔ اس بزم کی جانب سے سائنسی افکار اور موضوعات کو نظم و نثر کے ذریعے عام فہم انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔ ناظمہ تقریب نے مزید کہا کہ آج کی نشست کی صدارت پروفیسر رئیس علوی کر رہے ہیں جن کی اردو زبان و ادب کے لیے بے شمار خدمات ہیں، خاص طور پر آپ ہائیکو کے عمدہ شاعر ہیں آپ نے جاپان کے عظیم ہائیکو شاعر باشو کے سفرنامے کا اردو میں عمدہ ترجمہ کیا ہے۔ جنوبی ایشیا میں ہائیکو کے فروغ کے لیے سرگرم اولین اور واحد کثیر لسانی جریدے ہائیکو انٹرنیشنل نے ان کی خدمات کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے "رئیس علوی نمبر" بھی شائع کیا ہے۔ اس منفرد ادبی رسالے کے بانی و مدیر کنول احمد صدیقی ہیں۔

اس موقع پر نزہت عباسی نے اپنی منتخب ہائیکو بھی سنائیں۔ بزم سائنسی ادب کی دو سو چھتیسویں نشست میں سید نعیم احمد نے انشائیہ 'سیلفی سیلفی' اور زیب النساء زیبی نے سائنسی افسانہ 'انٹرنیٹ کی دنیا اور تنہائی' سنایا۔ آمنہ عالم، ترکین راز زیدی اور پروفیسر شاہین حبیب نے منظوم کلام پیش کیا۔ اس موقع پر کنول یوسف نے اسلامی ممالک کی جامعات میں سائنسی تحقیق کی صورتحال اور پروفیسر ڈاکٹر مجیب الدین محبوب نے جامعہ کراچی کے سائنس دان شعرا و شاعرات کے متعلق اپنے مقالے پیش کیے، جبکہ پروفیسر عبداللہ اقبر نے سائنسی دوہے اور سید الکبیر نے عظمت علی خان کو منظوم خراج تحسین پیش کیا۔ صدر محفل پروفیسر محمد رئیس علوی نے اس موقع پر اپنا کلام نذرِ سامعین کیا اور صدارتی کلمات ادا کرتے ہوئے کہا کہ بزم سائنسی ادب کی آج بہت اچھی نشست میں مجھے شرکت کا موقع ملا۔ عظمت علی خان نے جس کام کا آغاز کیا اسے اس بزم کے عہدیداران اراکین بخوبی آگے بڑھا رہے ہیں۔ یہاں پڑھی جانے والی نثر و نظم دونوں لاجواب ہیں۔ آج کی نشست میں افسانہ، انشائیہ، غزل، نظم، ہائیکو، تحقیق، تنقید اور دیگر اصناف پر بہترین سائنسی تخلیقات سامنے آئیں، سائنسی ادب کے حوالے سے یہاں بہت اہم باتیں ہوئیں اور شہر کے صاحبان علم و ادب یہاں جمع ہیں، جو ادب اور سائنس کے لیے کام کر رہے ہیں۔ تقریب کے آخر میں ڈاکٹر وقار احمد زبیری نے بزم سائنسی ادب کی طرف سے کلمات تشکر ادا کیے۔ حاضرین محفل میں شہر کی معروف علمی و ادبی شخصیات شامل تھیں۔

رپورٹ: http://urdu.livestream.com/ 4 فروری 2016

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

خبر نامہ

تعصب اور تنگ نظری اردو زبان کے خمیر میں نہیں ہے: مظفر حسین

پورے ہندوستان کی ادبی وسماجی تنظیموں کی مالی اعانت کونسل کا اہم مقصد: ارتضیٰ کریم

نئی دہلی: اردو زبان کے فروغ اور اس کی ترویج واشاعت کے لیے کونسل کئی اسکیمیں چلا رہی ہے۔ انہی میں سے ایک اہم اسکیم مالی تعاون ہے۔ ہم اس اسکیم کے تحت ملک کے ان علاقوں تک روشنی پہنچانے کا کام کریں گے جہاں اب تک روشنی نہیں پہنچ پائی ہے۔ خاص طور پر جنوبی ہند کی ریاستوں سے مالی تعاون کی درخواستیں کم موصول ہوتی ہیں لہٰذا پورے ہندوستان کی ادبی، سماجی تنظیموں کی مالی اعانت کونسل کا اہم مقصد ہے۔ یہ باتیں قومی کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے صدر دفتر اردو بھون میں منعقدہ گرانٹ ان ایڈ پینل کی میٹنگ میں کہیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ایسی درخواستوں اور مسودات پر خصوصی توجہ دی جائے گی جو غیر اردو داں ہوں لیکن اردو سے محبت رکھتے ہوں۔ اس میٹنگ میں سیمینار، کانفرنس، ورکشاپ، مشاعرے اور اردو، عربی و فارسی مسودات کی اشاعت اور ریسرچ پروجیکٹ سے متعلق درخواستوں پر غور وخوض کیا گیا اور ملک کی مختلف ریاستوں سے موصول ہونے والی درخواستوں کو مالی تعاون کے لیے منظور کیا گیا۔

قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں گرانٹ ان ایڈ کا منظر

اس موقعے پر کونسل کے وائس چیئرمین پدم شری مظفر حسین نے کہا کہ ہم اس زبان کی ترویج واشاعت کے لیے کوشاں ہیں جو محبت، میل ملاپ اور رواداری کی زبان بنی ہوئی ہے۔ آج بھی اس زبان میں حب الوطنی کے نغمے گائے جارہے ہیں۔ اس زبان کے خمیر میں تعصب اور تنگ نظری نہیں ہے۔ اس میٹنگ کی صدارت پروفیسر صغیر افراہیم نے کی۔ اس موقعے پر انھوں نے کہا کہ موصولہ درخواستوں سے پتہ چلتا ہے کہ ملک کی نمائندگی ہورہی ہے اور یہ خوش آئند بات ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہم ایسے موضوعات کو ترجیحی طور پر جگہ دیں گے جو لسانیات، رسم الخط، میڈیا، سائنس و جدید ٹکنالوجی سے وابستہ ہوں۔

میٹنگ میں گرانٹ ان ایڈ کے ممبران پروفیسر علیم اللہ حالی، پروفیسر صغیر افراہیم، پروفیسر شہاب عنایت ملک، پروفیسر قدسیہ انجم، پروفیسر فاروق بخشی، ڈاکٹر فوزیہ چودھری، قومی کونسل کے پرنسل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال، جناب فیروز عالم، ڈاکٹر توقیر راہی، جاوید اقبال انصاری اور شاہد اختر انصاری وغیرہ نے شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 9 فروری 2016

کتابوں کے مالی تعاون کی رقم میں اضافہ کیا جائے گا: پروفیسر ارتضیٰ کریم

تھوک خریداری اسکیم پینل کی میٹنگ

نئی دہلی: قومی اردو کونسل کے تھوک خریداری اسکیم پینل کی میٹنگ میں بڑھتی مہنگائی اور اشاعتی اخراجات کو دیکھتے ہوئے قلمکاروں کو دی جانے والی مالی اعانت کی رقم میں اضافے کا فیصلہ کیا گیا ہے، جس کا نفاذ آئندہ مالی سال سے ہوگا۔ کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے اس موقع پر کہا کہ اضافے کا فیصلہ صرف اس اسکیم تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کا نفاذ کونسل کے زیر نگرانی چلنے والی ساری اسکیموں پر ہوگا۔ اس میٹنگ میں اردو، عربی و فارسی کے تقریباً 250 سے زائد کتابوں کی تھوک خریداری کو منظوری دی گئی، جن میں تخلیقی ادب، شاعری، سوانح، ادب اطفال، لغات، سائنسی وسماجی علوم، جنرل نالج، ادبی تنقید، مذہبی کتابیں اور صحافت کے علاوہ ملک کے مختلف حصوں سے شائع ہونے والے ادبی رسائل و جرائد شامل ہیں۔ پینل کی صدارت کرتے ہوئے جناب چندر بھان خیال نے کہا کہ قومی اردو کونسل کا یہ فیصلہ قابل ستائش ہے۔ اس سے اردو کے مصنّفین کو خاصی راحت ملے گی۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ان نئے مصنّفین کو خاص طور پر ترجیح دی جانی چاہیے جو اقتصادی طور پر کمزور ہیں۔ اس فیصلے سے ان مصنّفین کا حوصلہ بڑھے گا اور انھیں کتابوں کی اشاعت میں مالی دشواریوں کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ واضح رہے کہ قومی اردو کونسل اس اسکیم کے تحت پورے ہندوستان سے شائع ہونے والی کتابیں خرید کر ملک کے طول وعرض میں پھیلے کتب خانوں میں بطور ہدیہ ارسال کرتی ہے تاکہ عام اردو قارئین تک ان کتابوں کی رسائی کو ممکن بنایا جاسکے۔

کونسل کے صدر دفتر میں تھوک خریداری اسکیم پینل کی میٹنگ

میٹنگ میں پروفیسر انوارالدین، پروفیسر نعمان خان، پروفیسر علیم اشرف خان، جناب چودھری ابن النصیر، ڈاکٹر محمود فیاض، محترمہ صادقہ نواب سحر، محترمہ ثروت خان، حاجی محمد اقبال خان کے علاوہ کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال، محترمہ شمع کوثر یزدانی (اسسٹنٹ ڈائرکٹر اکیڈمک)، جناب فیروز عالم (اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر)، محترمہ ساجدہ بیگم، فرح دیبا، اقبال حسین اور ڈاکٹر شاہد اختر نے بھی شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 17 فروری 2016

قومی اردو کونسل کا موبائل وین پروگرام (29واں فیز)

(آندھرا پردیش، تلنگانہ، کرناٹک اور مہاراشٹر)

1.	مانو، عثمانیہ یونیورسٹی اور نظام آباد کالج حیدرآباد	22 تا 25 فروری 2016
2.	محبوب نگر	26 تا 27 فروری 2016
3.	کرنول	28 فروری تا 1 مارچ 2016
4.	داون گیری	4 تا 6 مارچ 2016
5.	دھارواڑ	7 تا 8 مارچ 2016
6.	ہبلی	9 تا 11 مارچ 2016
7.	بلگام	12 تا 14 مارچ 2016
8.	سنگلی	15 تا 16 مارچ 2016
9.	کولھاپور	17 تا 18 مارچ 2016
10.	ستارا	19 تا 20 مارچ 2016
11.	رتنا گیری	21 تا 23 مارچ 2016
12.	کھیڑ	24 تا 25 مارچ 2016
13.	دھپولی	26 تا 27 مارچ 2016
14.	مراد	28 تا 29 مارچ 2016
15.	مہاد	30 مارچ 2016
16.	ووہر	31 مارچ 2016
17.	پانویل	1 تا 2 اپریل 2016

بین مذاہب مکالمہ وقت کی اہم ضرورت

مذہب اور کلچر پینل کی میٹنگ

کونسل کے صدر دفتر میں مذہب اور کلچر پینل کی میٹنگ کا انعقاد

نئی دھلی: اس پینل کی ازسر نو تشکیل کا مقصد یہ ہے کہ اس کے دائرے کو مزید وسعت دی جائے تاکہ مذہب اور کلچر کے پیش نظر ایسی کتابیں کونسل شائع کرسکے جس سے قومی یکجہتی، تہذیبی ہم آہنگی، بھائی چارگی اور رواداری کی فضا نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا میں قائم ہوسکے۔ جس کی اس وقت اشد ضرورت ہے۔ واضح رہے کہ اسلامک اسٹڈیز پینل جس کی تشکیل 2013 میں کی گئی تھی اب اسے مذہب اور ثقافت پینل کردیا گیا ہے۔ یہ باتیں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے صدر دفتر میں منعقد مذہب اور ثقافت پینل کی میٹنگ میں ممبران سے خطاب کرتے ہوئے کہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ بین مذاہب مکالمہ وقت کی اہم ضرورت ہے اسی لیے کونسل تمام مذاہب کی ایسی کتابوں کے ترجمے پر ترجیحی طور پر دھیان دے گی جو ملک میں سازگار فضا قائم کرنے میں اہم کردار ادا کرسکیں۔ انھوں نے تمام مہمانوں کا خیرمقدم کرتے ہوئے اس چھوٹی مگر اہم میٹنگ میں شرکت کرنے کے لیے شکریہ ادا کیا۔ اس موقعے پر کونسل کے وائس چیئرمین پدم شری مظفر حسین نے مہمانوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہمارا مقصد فروغ اردو ہے، فروغ مذہب نہیں۔ ہمیں اسی سمت میں کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اس پینل کی صدارت پروفیسر سید عین الحسن نے کی۔ انھوں نے تمام ممبران سے مذہب اور کلچر کے تعلق سے مثبت مشورے وتجاویز دینے کی درخواست کی۔ انھوں نے مزید کہا کہ اس پینل کے تحت دوسرے مذہب اور کلچر کو سمجھنے کا موقع ملے گا۔ ہندوستانی تہذیب کو انھوں نے ایک خوب صورت گلدستہ کی مانند بتاتے ہوئے کہا کہ اس کے متنوع رنگ اور خوشبو ملک کی یکجہتی کو تقویت فراہم کرتے ہیں۔ انھوں نے ترجمے کی بابت کہا کہ زبان وادب میں حرف آخر کچھ نہیں ہوتا۔ قرآن کریم کے سیکڑوں تراجم موجود ہیں باوجود اس کے لوگوں کی تشنگی اب بھی باقی ہے۔

اس موقعے پر معروف سماجی کارکن سوامی اگنی ویش نے کہا کہ مذہب کلچر کا ایک اٹوٹ حصہ ہے اسے الگ کرکے نہیں دیکھا جاسکتا۔ آج ہم ایسے پرآشوب دور سے گزر رہے ہیں، جہاں مذہب کی بنیاد پر منافرت پھیلائی جارہی ہے اور غیر مذہبی باتوں کو بڑھاوا دیا جارہا ہے۔ ہمیں رواداری اور بھائی چارگی کے توسط سے ملک میں خوش گوار ماحول قائم کرنا ہوگا۔ کونسل ایسی کتابوں کی اشاعت پر غور کرے جو تعمیری پہلو لیے ہوئے ہو۔ مجھے اس طرح کی میٹنگ میں آنے کا پہلی بار موقع ملا ہے اور آپسی گفت وشنید سے جو باتیں سامنے آئی ہیں وہ کافی مثبت اور دل چسپ ہیں۔ ممبران نے اس میٹنگ میں اہم تجاویز پیش کرتے ہوئے کہا کہ ملک کے ایسے شہروں اور علاقوں کے انتخاب کی ضرورت ہے جن کی اپنی ایک تہذیب ہو۔ مثلاً بنارس، اورنگ آباد، لکھنؤ وغیرہ۔ ایسی کتابیں جو نادر و نایاب ہیں کونسل اسے دوبارہ شائع کرے۔ اس موقعے پر مولانا صہیب قاسمی نے دو کتابوں وطن پرستوں کی کہانیاں اور صوفی ازم کی اشاعت کی طرف توجہ دلائی۔

میٹنگ میں پروفیسر سید عین الحسن، پروفیسر ناشر نقوی، معروف سماجی کارکن سوامی اگنی ویش، پروفیسر غلام یحییٰ انجم، ڈاکٹر زینت شوکت علی، ڈاکٹر فہیم احمد صدیقی، مولانا صہیب قاسمی کے علاوہ کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال، اسسٹنٹ ڈائرکٹر (اکیڈمک) ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی، اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر جناب فیروز عالم، ٹیکنیکل اسسٹنٹ محترمہ آبگینہ عارف، ڈاکٹر شاہد اختر انصاری اور محمد طاہر نے شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 14 جنوری 2016

ادبی شخصیات کے انتقال پر قومی اردو کونسل میں تعزیتی نشستیں

انتظار حسین

نئی دہلی: اردو کے ممتاز فکشن نگار انتظار حسین کے انتقال پر اپنے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ ان کی رحلت سے دنیا ایک غیر معمولی تخلیقی ذہن اور وژن سے محروم ہوگئی ہے۔ انتظار حسین اردو فکشن میں ایک دبستاں کی

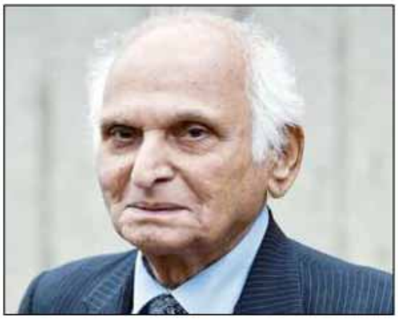

حیثیت رکھتے تھے۔ انھوں نے افسانے میں اسلوبی اور موضوعی سطح پر جو نئے تجربے کیے ہیں انھیں عالمی سطح پر سند قبولیت ملی۔ ہجرت اور ناسٹلجیا ان کے افسانوں کے اہم موضوعات رہے ہیں۔ انتظار حسین نے ہندوستان کی حقیقی روح کو اپنے فکشن میں پیش کیا ہے۔ ان کے اکثر افسانے میں ہندوستان کی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو محسوس ہوتی ہے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے انتظار حسین کے شہرۂ آفاق ناولوں بستی، آگے سمندر ہے اور ان کے افسانوی مجموعوں: شہر افسوس، گلی کوچے، آپ بیتی اور سفرناموں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ انتظار حسین کی تخلیقی معصومیت میں سُکر اور سرشاری کی وہ کیفیت ہے کہ وہ قاری کو آخر تک باندھے رکھتی ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ انتظار حسین کے آئینۂ ادراک میں مستقبل روشن تھا اس لیے وہ ماضی کی طرف مراجعت کرتے تھے۔ ماضی ان کے لیے ایک قوت محرکہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ انھوں نے ہندوستان کے اساطیر اور دیومالا سے عہد حاضر کا رشتہ جوڑا اور ہندوستان کی ثقافتی اور تہذیبی روح کو اپنے فکشن کا محور و مرکز بنایا۔ انھوں نے پاکستان ہجرت ضرور کی مگر ان کا دل ہمیشہ اپنی جنم بھومی ہندوستان کے لیے دھڑکتا رہتا تھا۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ انتظار حسین ان شخصیتوں میں سے تھے جنھیں زندگی میں ہی بہت قدر و منزلت ملی۔ انھیں ادب کا لیونگ لیجنڈ کہا جاتا تھا۔ فکشن میں ان کا مقام اتنا بلند تھا کہ انھیں ادب کا نوبل پرائز تک مل سکتا تھا۔ مگر ان کا دائرہ صرف فکشن تک محدود نہیں تھا بلکہ وہ نقاد بھی تھے اور کالم نگار بھی۔ وہ آشوب عصر اور ادبی مسائل کو اپنے انگریزی کالموں کا موضوع بناتے تھے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے اس موقعے پر یہ اعلان کیا کہ انھیں شایانِ شان خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے ماہنامہ 'اردو دنیا' کا ایک گوشہ 'فکشن اور ہجرت' کے حوالے سے شائع کیا جائے گا جس کا فوکس انتظار حسین کے فکشن پر ہوگا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 3 فروری 2016

ندا فاضلی

نئی دہلی: ندا فاضلی کی ندا نے ہر دھڑکتے دل کو متاثر کیا ہے اور وہ ہمیشہ امن اور محبت کے پیامبر کے طور پر یاد کیے جائیں گے۔ ان کے والدین نے آزادی کے بعد پاکستان جانا گوارا کرلیا تھا اور ان کے رشتے داروں نے نقل مکانی کرلی تھی لیکن ندا فاضلی نے ہندوستان کی مٹی کو اپنایا اور اسی سرزمین میں دفن ہوئے۔ ان کی نظمیں اور غزلیں ہمیں زندگی سے محبت کرنے اور زندگی کو سمجھنے کا درس دیتی رہیں گی۔

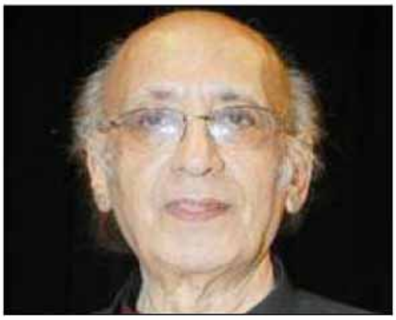

ان خیالات کا اظہار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے وائس چیئرمین پدم شری جناب مظفر حسین نے کونسل کے صدر دفتر فروغ اردو بھون میں منعقدہ ایک تعزیتی نشست میں کیا۔ اس موقع پر کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ ندا فاضلی نے نہ صرف اردو شاعری بلکہ نغمہ نگاری کو بھی ایک وقار عطا کیا۔ نئی اور جدید شاعری میں ندا فاضلی اپنے انداز کے انوکھے شاعر تھے۔ ندا فاضلی کی شاعری میں انسانیت اور انسان دوستی کی روشن عبارتیں دکھائی دیتی ہیں۔ ندا فاضلی نے جمہوریت، مذہبی رواداری اور آزادیٔ اظہار کی ہمیشہ حمایت کی۔ ساہتیہ اکادمی، پدم شری اور میر تقی میر ایوارڈوں سے نوازے گئے ندا فاضلی نے ملک کے ہر چھوٹے بڑے اہم واقعات پر شاعری کی شکل میں اپنا تعمیری رویہ درج کروایا تھا۔ ان کے شعری مجموعے 'مور ناچ'، 'دنیا ایک کھلونا ہے' اور 'لفظوں کے پھول' وغیرہ کافی مقبول ہوئے۔ ان کے کئی اشعار زبان زد عام ہیں۔ ان کے گیتوں کو محمد رفیع، جگجیت سنگھ، الکا یاگنک، لکی علی، کمار شانو اور سونو نگم جیسے نامور گلوکاروں نے گایا ہے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 9 فروری 2016

عابد سہیل

نئی دہلی: اردو کے ممتاز فکشن نگار اور صحافی عابد سہیل کے انتقال پر اپنے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے قومی اردو

کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ ان کی رحلت سے صحافت اور فکشن کے ایک روشن باب کا خاتمہ ہوگیا۔ ادب کے میدان میں ان کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ انھوں نے صرف فکشن میں اپنی شناخت مستحکم نہیں کی بلکہ فکشن تنقید میں بھی اپنا اعتبار قائم کیا۔ ادبی موضوعات اور مسائل پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ ان کی خودنوشت 'جو یاد رہا' بھی ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوئی۔

پروفیسر ارتضیٰ کریم نے صحافت میں ان کے ناقابل فراموش کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ عابد سہیل نے اپنا صحافتی سفر ایک انگریزی اخبار سے شروع کیا تھا، بعد میں انھوں نے اردو صحافت سے اپنا مضبوط رشتہ جوڑا اور اپنے صحافتی جوہر دکھائے۔ انھوں نے ماہنامہ 'کتاب' کے ذریعے کئی نسلوں کی ذہنی اور تحریری تربیت بھی کی۔ ان کا رسالہ 'کتاب' ادبی حلقوں میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے عابد سہیل کی وفات کو صحافتی اور ادبی دنیا کا ناقابل تلافی خسارہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ عابد سہیل ایک متنوع شخصیت کے حامل تھے۔ انھیں کئی زبانوں پر درک حاصل تھا اور وہ ادب کے عالمی تناظر سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 27 جنوری 2016

تمل ناڈو میں اردو کے مسائل

چیپاک: 3 جنوری 2016 کو ہندوستان کے مشہور کرکٹ گراؤنڈ چیپاک کرکٹ اسٹیڈیم، تمل ناڈو میں ایک خصوصی میٹنگ منعقد ہوئی جس میں تمل ناڈو میں اردو کے مسائل پر غور و فکر کیا گیا۔ جناب پدم شری مظفر حسین وائس چیرمین، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی نے اپنے خطاب میں ریاستی اداروں سے اپیل کی کہ وہ قومی کونسل سے بھرپور استفادہ کریں اور اردو زبان کے فروغ اور اشاعت میں حصہ لیں۔ جناب پروفیسر ارتضیٰ کریم ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی نے اپنی تقریر میں کہا کہ قومی کونسل کی جانب سے تمل اردو اور انگریزی کی سہ لسانی لغت کی تیاری کے لیے کونسل مالی تعاون کرے گی اس کا منصوبہ تیار ہو رہا ہے جو شعبۂ عربی، فارسی و اردو، مدراس یونیورسٹی کے تحت عمل میں لایا جائے گا۔ اس موقع پر جناب اے محمد اشرف، سکریٹری، مسلم ایجوکیشنل ایسوسی ایشن آف سدھرن انڈیا، پروفیسر سید سجاد حسین، صدر شعبہ اردو مدراس یونیورسٹی، پروفیسر قاضی حبیب احمد، شعبہ اردو مدراس یونیورسٹی، ڈاکٹر محمد عبیدالرحمٰن صدر شعبہ اردو، نیو کالج، جناب ملک العزیز، جناب پٹیل عبدالرحیم، ڈاکٹر حیات افتخار اور ڈاکٹر امان اللہ، مدراس یونیورسٹی، ڈاکٹر محمد یاسر، صدر شعبہ اردو سی عبدالحکیم کالج، میل وشارم، مدراس نیو کالج سے ڈاکٹر مظفر الدین، ڈاکٹر طیب خرادی اور جناب محمد غیاث احمد شریک رہے۔ اس میٹنگ کے فوری بعد ایک محفل مشاعرہ کا انعقاد بھی ہوا۔ شاہد مدراسی، ماہر مدراسی، شہزادا آبرو، حسن فیاض، دولت مدراسی نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

پریس ریلیز ڈاکٹر امان اللہ ایم بی، شعبۂ عربی، پرشین اینڈ اردو، مدراس یونیورسٹی، چینئی، 18 جنوری 2016

مظفر پور میں کا باڈی ٹی پی سینٹر

مظفر پور: مرکزی وزارت برائے فروغ انسانی وسائل کے تحت کام کرنے والا ادارہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان این سی پی یو ایل یکم اپریل 1996 سے فروغ اردو کے لیے سرگرم ہے۔ ملک بھر میں این سی پی یو ایل کے چھوٹے بڑے 478 مراکز ہیں۔ انھیں میں سے ایک ہے بہار کے مظفر پور کا این سی پی یو ایل سینٹر، جہاں غیر مسلم بھی بڑے شوق سے اردو سیکھ رہے ہیں۔ این سی پی یو ایل سینٹر، جہاں غیر مسلم بھی بڑے شوق سے اردو سیکھ رہے ہیں۔ این سی پی یو ایل کا بہار کے مظفر پور شہر میں مرکز اکتوبر 2008 میں قائم کیا گیا تھا۔ اس وقت سے اب تک یہ مرکز پانچ سو سے زیادہ افراد کو اردو زبان کے علم سے آراستہ کر چکا ہے، جن میں سے 100 افراد کا تعلق ملک کے اکثریتی طبقے سے ہے۔ مظفر پور مرکز پر فی الوقت چالیس چالیس طلبا پر مشتمل دو کلاسیں چل رہی ہیں۔ یہ سنٹر طلبہ کو کمپیوٹر ایجوکیشنل اور اردو زبان کی بنیادی تعلیم سے آراستہ کر رہا ہے۔ سینٹر ایک طرف اردو سے نابلد افراد کو اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا سکھا رہا ہے تو دوسری جانب اردو جاننے والوں کو اردو میڈیم میں کمپیوٹر ایجوکیشن فراہم کر رہا ہے۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 8 جنوری 2016

تحریک آزادی اور اردو کا کردار

سہارنپور: اسلامیہ ڈگری کالج میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے اشتراک اور تعاون سے سماجی تنظیم 'پرچم' کے زیر اہتمام 'تحریک آزادی اور اردو کا کردار' کے موضوع پر ایک صوبائی سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ 2 نشستوں میں ہونے والے سیمینار میں اردو شاعری، افسانہ، ادب اور اردو صحافت و تحریک آزادی کے حوالے سے مقالے پڑھے گئے اور اظہارِ خیال کیا گیا۔ سیمینار کی صدارت اسلامیہ انٹر کالج کے پرنسپل جلال عمر نے اور نظامت ڈاکٹر قدسیہ انجم نے کی۔ جوہر یونیورسٹی رامپور کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر محمد لقمان مہمانِ خصوصی تھے۔ انھوں نے اردو کو ہندوستان کی نمائندہ زبان قرار دیا اور کہا کہ اس حقیقت سے انکار نہیں کہ تحریک آزادی کی جنگ اردو کے ذریعے ہی لڑی گئی تھی۔ انھوں نے کہا کہ یہ فخر اردو زبان کو ہی حاصل رہا۔ سی سی ایس یو میرٹھ کے شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے اپنے کلیدی خطبے میں کہا کہ ملک میں جو تحریک آزادی کی تاریخ پڑھائی جاتی ہے وہ انگریز مورخوں کی لکھی ہوئی ہے جس سے یہ سرا نہیں ملتا کہ تحریک آزادی کا حقیقت میں آغاز کب ہوا؟

ایم جی ایم پی جی کالج سنبھل کے شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر عابد ایچ حیدری نے کہا کہ اردو کبھی درباری زبان نہیں رہی۔ انھوں نے کہا کہ یہ انحطاط پذیر اور زوال پزیر معاشرے میں پلی بڑھی اور پروان چڑھی۔ انھوں نے شعریات کے

حوالے سے تحریک آزادی میں اردو کے کردار پر اپنے مقالے میں کہا کہ اردو نے قومی اتحاد کے برگد کی آبیاری کی اور اس زبان کا جنگ آزادی میں نمایاں کردار رہا ہے۔ میڈیا پوسٹ نئی دہلی کے ڈاکٹر شیخ نگینوی نے تحریک آزادی میں اردو ڈراموں کے کردار پر روشنی ڈالی اور یہ کہا کہ ڈراموں کے ذریعہ بھی ہندوستان کے عوام میں جذبۂ آزادی کو پروان چڑھایا تھا۔ پردیپ جین نے پریم چند کے افسانوں کے حوالے سے تحریک آزادی کا ذکر کیا اور ان کے افسانے سوزِ وطن کا خاص طور سے ذکر کیا۔ شاہد زبیری نے تحریک آزادی اور اردو صحافت کے اپنے مقالے میں کہا کہ تحریک آزادی کی تاریخ اردو صحافت کے بغیر نامکمل ہے۔ اس کے علاوہ دیگر شرکا نے بھی مقالے پیش کیے۔ سیمینار میں طلبا و طالبات کے علاوہ عمائدین شہر موجود تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 18 جنوری 2016

اردو سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

قومی:

24واں عالمی کتاب میلہ

نئی دهلی: بیرون ممالک میں ہندوستان کی جڑیں تلاش کرنے کے لیے ملک کے اسکولی بچے جنوبی ایشیا کے ممالک کا دورہ کریں گے۔ ان کے ساتھ ملک کے اہم تاریخ داں اور فوٹوگرافر بھی جائیں گے، جو اپنی اپنی وراثت اور صلاحیت کی شناخت کریں گے اور ان کے تجربوں کو تصویروں کے ساتھ نیشنل بک ٹرسٹ شائع کرے گا۔ یہ اعلان مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل اسمرتی ایرانی نے پرگتی میدان میں 24 ویں عالمی کتاب میلے 2016 کا افتتاح کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے اس عالمی کتاب میلے میں مہمان ملک چین کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ اس سے دونوں ممالک کے رشتے میں مضبوطی آئے گی۔ اس موقعے پر چین کے وائس منسٹر سن شوشان، ہندوستان میں چین کے سفیر لی یوچینگ، چین کے معروف رائٹر لیوجینو، محکمہ فروغ انسانی وسائل میں اعلیٰ تعلیم کے سکریٹری وِنے شیل اوبرائے کے علاوہ آئی ٹی پی او کے چیئرمین اینڈ مینیجنگ ڈائریکٹر ایل سی گوئل اور نیشنل بک ٹرسٹ (این بی ٹی) کے چیئرمین بلدیو بھائی شرما بھی موجود تھے۔ مذکورہ سبھی مہمانوں نے اپنے خیالات کا اظہار کرکے عالمی کتاب میلے کے انعقاد اور اس کو کامیاب بنانے سے متعلق مشورے دیے۔ تقریب کے بعد اسمرتی ایرانی نے میلے کے تھیم پویلین اور چینی پویلین کا افتتاح بھی کیا۔ قبل ازیں اسمرتی ایرانی نے مہمان ملک کا خیرمقدم کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے یہاں مہمانوں کی 'پوجا' کی جاتی ہے، اس لیے ہم امید کرتے ہیں کہ مہمان ملک چین کے دوستوں کو ہندوستان میں اپنے گھر جیسا محسوس ہوگا۔ انھوں نے این بی ٹی کی کوششوں کو سراہتے ہوئے کہا کہ این بی ٹی نے نئے قلمکاروں کی 16 کتابیں شائع کی ہیں، جو بہت اہم ہے۔ کیونکہ نئے قلمکاروں کو

موقع نہیں مل پاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں این بی ٹی کو مشورہ دیتی ہوں کہ آئندہ سال آئین کے ذریعے منظور کردہ 22 ہندوستانی زبانوں میں یہ کتابیں شائع کریں۔ این بی ٹی کے چیئرمین بلدیو بھائی شرما نے سبھی مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ اخیر میں این بی ٹی کی ڈائرکٹر نے حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ میلے میں کتابوں کے مداح خاص طور پر نوجوانوں کو کتابوں کے ذریعے ہندوستانی تہذیب کو جاننے کا موقع ملے گا۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 10 جنوری 2016

نئی منزل

نئی دهلی: مرکزی وزیر برائے اقلیتی امور نجمہ ہپت اللہ نے کشمیر کے اپنے دوروزہ دورے کے دوران تین مدرسوں میں 'نئی منزل' پروگرام کا آغاز کیا، جس میں ان مدرسوں میں زیر تعلیم بچیوں کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔

مرکزی وزیر محترمہ نجمہ ہپت اللہ نے ایک پریس کانفرنس کے دوران 'نئی منزل' اسکیم کی تفصیلات بتاتے ہوئے کہا کہ ان کی وزارت نے کشمیر میں وہاں کی ضروریات کے مطابق سات اسکل کا انتخاب کیا ہے، جن میں زعفران کی کاشت، فوڈ پروسیسنگ کی تربیت، ایم برائڈری، ٹورازم مینجمنٹ کمپیوٹر، آئی ٹی، سافٹ ویئر کی تربیت شامل ہے۔ انھوں نے بتایا کہ نئی منزل کے تحت سہ ماہی اسکل کی ٹریننگ کے لیے بچیوں کو چار ہزار روپے کا وظیفہ ملتا ہے اور جب بچیاں اپنی تربیت مکمل کرلیتی ہیں اس وقت انھیں سینٹرل اسکل کونسل کی طرف سے سرٹیفکٹ دیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایسی تربیت یافتہ بہنوں اور بچوں کو روزگار کے لیے حکومت آسان شرطوں پر قرض بھی دیتی ہے۔

محترمہ نجمہ ہپت اللہ نے بتایا کہ سرینگر میں ایک مدرسہ میں نئی منزل کا براہ راست آغاز کیا گیا جبکہ مدرسہ امام سعدی (بانڈی پورہ) اور مدرسہ شاہ ہمدان (پامپور) میں انٹرنیٹ کے ذریعے افتتاح کیا گیا۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 22 جنوری 2016

نئی منزل پروگرام کا آغاز

اردو کے فروغ کے لیے قومی کونسل کے اقدامات قابل تحسین

علی گڑھ: ملت بیداری مہم کمیٹی (ایم بی ایم سی) علی گڑھ کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر جسیم محمد نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی موجودہ کارکردگی پر اطمینان کا اظہار

کرتے ہوئے کہا ہے کہ جب سے پروفیسر ارتضیٰ کریم نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر کا عہدہ سنبھالا ہے تب سے کونسل کی کارکردگی میں بہتر تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ موجودہ ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے قومی کونسل میں اردو کے فروغ کے لیے ملک بھر میں پروگراموں کے انعقاد کے لیے مالی تعاون کا عمل اس درجہ آسان کر دیا ہے کہ اب پروگرام آرگنائزر کو کسی قسم کی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ اس کے علاوہ بڑے پیمانے پر اردو قلم کاروں کی کتب کی خریداری اور کتابوں کی اشاعت کے لیے مالی امداد دیے جانے کا عمل کافی سہل کر دیا گیا ہے جس کے نتیجے میں بڑی تعداد میں اردو قلم کار اپنی تخلیقات کتب کی شکل میں شائع کرا کر اردو کے فروغ میں اہم رول ادا کر رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس کے علاوہ اردو کے فروغ کے میدان میں ملک بھر میں کونسل کے مراکز پر وسیع پیمانے پر پروگرام وضع کرنا اس امر کا بین ثبوت ہے کہ ملک میں اردو کے فروغ کے میدان میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان پروفیسر ارتضیٰ کریم کی قیادت میں اپنے قیام کے مقاصد کو صحیح طور پر عملی جامہ پہنا رہی ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 22 جنوری 2016

ہندوستان اور ایران کے ثقافتی تعلقات اور فارسی زبان کا رول

نئی دہلی: شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی میں 'ہندوستان اور ایران کے ثقافتی تعلقات اور فارسی زبان کا رول' کے موضوع پر خصوصی خطبے کا انعقاد عمل میں آیا جس میں ایرانی

دہلی یونیورسٹی میں 'ہندوستان اور ایران کے ثقافتی تعلقات اور فارسی زبان کا رول' کے موضوع پر خطبہ کا منظر

اسکالر ڈاکٹر داود کمیجانی نے خطبہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان میں فارسی زبان و ادب کے توسل سے نئی ثقافت وجود میں آئی جسے ہم ہند و ایران ثقافت کہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ آج ہندوستان میں ہم جس تہذیب کو سیکولر کہتے ہیں، جس کی بدولت صوفیا کو یاد کیا جاتا ہے اور جس کی وجہ سے اردو زبان وجود میں آئی، یہ سب ہند و ایران تہذیب کے میل جول کے اثرات ہیں۔ ہند و ایران ثقافتی تعلقات کے اثرات ہندوستان کی علاقائی زبانوں میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر چندر شیکھر نے کہا کہ ہمارے یہاں فارسی زبان سیکھنے کا رواج اس لیے نہیں تھا کہ لوگوں کو نوکریاں حاصل ہوں بلکہ ایک وسیع نو وارد ثقافت اور اس سے متعلقہ علوم کو سیکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور اس کے تحت سلسلہ وار لغات کی بھی تدوین ہوئی، چنانچہ فارسی سنسکرت، فارسی گجراتی، فارسی تیلگو، فارسی مراٹھی وغیرہ زبانوں میں لغات لکھی گئیں۔ ان فرہنگوں کی اشاعت سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ فارسی ہندوستان میں غیر ملکی زبان نہیں بلکہ ہندوستانی ثقافت کے حصے کے طور پر شمار ہوتی رہی ہے۔ انھوں نے زور دے کر کہا کہ آج ہندوستان کی 65 یونیورسٹیوں میں فارسی اور اس سے زیادہ یونیورسٹیوں میں عربی کے شعبے موجود ہیں، بہار میں مولانا مظہر الحق عربی و فارسی یونیورسٹی اور لکھنؤ میں خواجہ معین الدین چشتی عربی و فارسی یونیورسٹی قائم ہوئیں۔ پروگرام کی نظامت اور کوآرڈی نیشن ڈاکٹر علیم اشرف خان نے کی۔ اس موقع پر حجۃ اللہ العابدی، ڈاکٹر امیر فضلی اصاگو کے علاوہ بڑی تعداد میں طلبہ و طالبات اور اسکالرس موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی 16 جنوری 2016

ہندوستان میں فارسی سفرناموں کی اہمیت پر مذاکرہ

نئی دہلی: ایران کلچر ہاؤس نئی دہلی میں ہندوستان میں فارسی سفرناموں کی اہمیت پر انجمن ادبی بیدل کی 58 ویں نشست کا اہتمام کیا گیا جس میں بڑی تعداد میں فارسی زبان و ادب کے اساتذہ و اسکالر نے شرکت کی۔ مقررین نے فارسی سفرناموں کی تاریخی اور سماجی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ اس موقع پر ایران کلچر ہاؤس کے کلچرل کاؤنسلر ڈاکٹر علی دہگاہی نے کہا کہ تاریخ میں ہمیشہ سے مختلف قوموں کے درمیان ثقافتی تبادلۂ خیال کا سلسلہ رہا ہے۔ ایران و ہندوستان کے فرہنگی و ثقافتی رشتہ ہمیشہ سے تاریخی اہمیت کے حامل رہے ہیں۔ ان رشتوں کو منتقل کرنے میں سیاحوں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ سیاحوں نے ثقافتی تجربات کو اپنے سفرناموں میں قلمبند کیا ہے جو خاصی اہمیت کے حامل ہیں۔ اسلام نے تعلیم و تعلم اور سفر کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان میں بہت سے فارسی سفرنامے لکھے گئے ہیں جو کہ تاریخی نقطۂ نظر سے اہم ہیں۔ انھوں نے ہندوستان میں پہلا فارسی سفرنامہ جو منشی احتشام الدین نے 1765 میں لکھا تھا کا بھی ذکر کیا۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے منشی اسمٰعیل کی تاریخ نو اور میر محمد حسین اصفہانی کا بھی ذکر کیا۔ اس موقع پر حجت اللہ عابدی معاون کلچرل کاؤنسلر ایران کلچر ہاؤس، ڈاکٹر ضمیرہ غفار وا تاجکستان، ڈاکٹر یونس جعفری، ڈاکٹر شمیم الحق صدیقی، پروفیسر بلقیس فاطمہ حسینی، ڈاکٹر جمیل الرحمن، پروفیسر علیم اشرف، پروفیسر نیاز مند صدیقی، ڈاکٹر اخلاق احمد نے بھی موضوع پر گفتگو کی۔ اس ماہانہ ادبی نشست انجمن ادبی بیدل کے کنوینر محمد صادق حسین نے اس کو بہت دلچسپی سے منعقد کیا۔ یاد رہے ایران کلچر ہاؤس کی جانب سے یہ ادبی نشست انجمن ادبی بیدل کے زیر اہتمام ہر ماہ منعقد کی جاتی ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 22 جنوری 2016

البیرونی کی حیات و خدمات

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کے سینٹر آف ایڈوانسڈ اسٹڈی کے زیر اہتمام 'البیرونی کی حیات و خدمات' پر منعقدہ لیکچر سے خطاب کرتے ہوئے

بیروت لبنان کی امریکن یونیورسٹی میں پروفیسر ڈاکٹر ماریوکوزاح نے اپنے خطبے کے دوران البیرونی کے ہندوستان پر تحقیقی عمل اور مسعودی قانون پر خصوصی طور پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ایک ماہر فلکیات، جیومیٹری شناس اور مورخ ہونے کے ساتھ البیرونی اپنے عہد کے دیگر دانشوروں اور مفکرین سے بڑی فکر کے حامل تھے۔ انھوں نے کہا کہ البیرونی محمود غزنوی کے ساتھ ہندوستان آئے اور انھوں نے یہاں سنسکرت سیکھنے کے بعد سنسکرت کی معتبر کتب کا عربی میں اور عربی کی معتبر اور سودمند کتب کا سنسکرت میں ترجمہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ البیرونی نے ہندوستان میں مذہب کو سب سے زیادہ اہمیت دیا اور اس کی قدر و منزلت پر خصوصی طور پر توجہ کی۔ انھوں نے بتایا کہ گیارہویں صدی میں البیرونی نے اپنے قیام ہند کے دوران ہندو دانشوروں کے ساتھ صرف سنسکرت ہی نہیں بلکہ ریاضی، سائنس، طب، فلکیات اور دیگر متعدد علوم سیکھنے کے بعد ان کا عربی زبان میں ترجمہ کیا جس سے ہندوستان اور عرب کو ایک دوسرے کو سمجھنے میں مدد ملی اور ان کے درمیان بہتر رشتے قائم ہوئے۔

ڈاکٹر ماریوکوزاح نے بتایا کہ البیرونی امن و آشتی اور آپسی بھائی چارہ کے علمبردار تھے۔ اس تعلق سے انھوں نے ممتاز عالم محمد یٰسین کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ انھوں نے البیرونی کے تعلق سے کہا تھا کہ ”البیرونی کی 'تاریخ الہند' ایک امن پسند جزیرے کی طرح ہے جبکہ دنیا بھر میں شہروں اور عبادت گاہوں کو تباہ کیا جارہا ہے۔“ خطبہ صدارت پیش کرتے ہوئے پرو وائس چانسلر بریگیڈیئر ایس احمد علی (ریٹائرڈ) نے کہا کہ البیرونی نے 75 سال کی عمر پائی اور ان کی کتاب 'تاریخ الہند' ہندوستان کی تہذیب و ثقافت اور مذاہب پر ایک دستاویزی حیثیت رکھتی ہے۔ بریگیڈیئر سید احمد علی نے کہا کہ البیرونی نے اپنی اس کتاب میں اپنے مذہب کی برتری کو ہی اجاگر نہیں کیا بلکہ انھوں نے ہندو تہذیب اور مذہب پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے۔

پروفیسر علی اطہر نے حاضرین کا شکریہ ادا کرنے کے ساتھ نظامت کے فرائض بھی انجام دیے۔ خطبہ میں بڑی تعداد میں ملکی اور غیر ملکی دانشور، اساتذہ، ریسرچ اسکالرس اور طلبا و طالبات بھی موجود تھیں۔ اس موقعے پر سرسید اکادمی کے ڈائرکٹر پروفیسر طارق احمد نے معزز مہمان کو اپنے ادارے کی جانب سے شائع مطبوعات پیش کیں۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 19 جنوری 2016

دہلی :

دہلی کی تاریخ اور تہذیب

نئی دہلی: ذاکر حسین دہلی کالج میں بتاریخ 18 جنوری 2016 کو 'دہلی کالج میموریل لیکچر' کا انعقاد کیا گیا جس میں نامور شاعر، عظیم اسکالر اور تہذیبی مورخ گلزار دہلوی

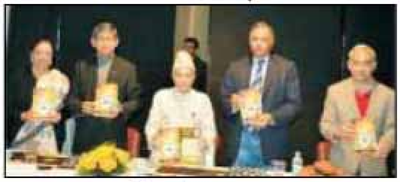

نے بحیثیت مہمان مقرر شرکت کی۔ انھوں نے اپنا خطبہ بعنوان 'دہلی کی تاریخ اور تہذیب' پیش کیا۔ گلزار صاحب نے سامعین سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان میں قومیت کا تصور اردو کی مشترکہ تہذیب کی دین ہے۔ شیرشاہ نے ہندوستان کو مغرب سے مشرق تک اور اورنگ زیب نے شمال سے جنوب تک ہندوستان کو ایک فروغ دیا۔ وید، اپنشد، گیتا اور پران جیسی مذہبی کتابوں کے فارسی اور اردو میں تراجم کرائے۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد کے وائس چانسلر ڈاکٹر ایم اسلم پرویز نے جلسے کی صدارت کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ میں دہلی میں پیدا ہوا لیکن ہماری شخصیت سازی 'دہلی کالج' میں ہوئی۔ یہ کالج ایک ایسا ادارہ ہے جہاں صرف تعلیم نہیں دی جاتی بلکہ ایک اچھے انسان بننے کی تربیت بھی کی جاتی ہے۔ ذاکر حسین دہلی کالج کے گورننگ باڈی کے چیئرمین پروفیسر چندر شیکھر، صدر شعبہ فارسی، دہلی یونیورسٹی نے بحیثیت مہمان ذی وقار شرکت کی۔ اس موقعے پر دو کتابیں: 'حریم ناز' اور 'عہدِ وسطیٰ کی دلی: تہذیبی جھلکیاں' کا اجرا عمل میں آیا۔ 'تہذیبی جھلکیاں' کو ڈاکٹر جمیل الرحمن اور ڈاکٹر جمشید خان (شعبۂ فارسی، ذاکر حسین دہلی کالج) نے مرتب کیا ہے۔ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر آر پربھاکر راؤ نے مہمان خصوصی گلزار دہلوی کا حاضرین سے تعارف کرایا۔ ڈاکٹر رستم واصل نے جلسے کی نظامت کی اور اظہار تشکر پیش کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 19 جنوری 2016

مولانا محمد علی جوہر حیات و خدمات

نئی دہلی: معروف سماجی تنظیم 'ڈاکٹر ذاکر حسین فاؤنڈیشن' کے زیر اہتمام جعفرآباد میں مولانا محمد علی جوہر کی حیات و خدمات پر پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ صدارت یوتھ جنریشن امپاورمنٹ کے چیئرمین صدام حسین ملک نے کی۔ بطور مہمان خصوصی ہولیس سلطان خان نے کہا کہ مولانا محمد علی جوہر نے تاریخ ہند میں جو انقلاب برپا کیا وہ آج بھی سنہرے حروف سے درج ہے جس سے نئی نسل استفادہ کررہی ہے۔

انھوں نے کہا کہ مولانا جوہر صرف مجاہد آزادی ہی نہیں تھے بلکہ بے باک مدیر اور صحافی بھی تھے جنھوں نے انگریزی میں 'کامریڈ' اور اردو میں 'ہمدرد' اخبار کے ذریعے ہندوستانیوں میں آزادی کی روح پھونکی۔ انھوں نے کہا کہ مولانا محمد علی جوہر ہندوستانی تہذیب و تمدن اور ثقافت کے معمار کا نام ہے۔ عصر حاضر میں ضروری ہے کہ نئی نسلوں کو ان مجاہدین آزادی کی تاریخ ساز زندگی اور ان کے بے مثال کارناموں سے روشناس کرایا جائے۔ اس موقعے پر فاؤنڈیشن کے چیئرمین ذاکر حسین بچو نے کہا کہ ہندوستان کا عظیم علمی قلعہ اور نئی نسلوں کے تابناک مستقبل کا ضامن جامعہ ملیہ اسلامیہ آپ ہی کی جہد مسلسل، سعی پیہم اور کوششوں کا نتیجہ ہے۔ طارق صدیقی نے کہا کہ مولانا محمد علی جوہر جیسی عظیم شخصیتیں روز پیدا نہیں ہوتیں، زمانہ ان کے عدیم المثال علمی، ادبی، سماجی، مذہبی اور معاشرتی خدمات ہمیشہ یاد رکھے گا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 جنوری 2016

انجمن اردو برادری

نئی دہلی: اردو کے شاعروں اور ادیبوں کی انجمن 'اردو برادری' کی جنرل باڈی میٹنگ ظفر انور کی صدارت میں ہوئی جس میں بزرگ صحافی جلال الدین اسلم، مولانا رحمت اللہ فاروقی، ڈاکٹر عبدالواسع، ڈاکٹر نبیل عارفی، قدر سہسوانی، حکیم عبدالقادر بندھولوی، نور تحکیمی، ایڈوکیٹ شہاب الدین ایم اختر، ایڈوکیٹ اکرم قادری، ایڈوکیٹ تنظیم احمد قریشی، حاجی اسرار قریشی، سینئر صحافی اشہر ہاشمی، ڈاکٹر وسیم اختر اور بزرگ شاعر سلیم شیرازی وغیرہ نے اتفاق رائے سے یہ فیصلہ کیا کہ 'اردو برادری' کو جلد از جلد رجسٹرڈ کرایا جائے اور ناز انصاری مرحوم کی حیات و خدمات پر مبنی کتاب 'سرِ رہ گم گشتہ' کو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان میں اشاعتی مالی تعاون کے لیے جمع کیا جائے۔ اس موقعے پر برادری کی جنرل باڈی نے این سی پی یو ایل

کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضی کریم اور اردو اکادمی دہلی کے وائس چیئرمین ڈاکٹر ماجد دیوبندی کی اردو کے تئیں کوششوں کی بھی ستائش کی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 16 جنوری 2016

اترپردیش:

فارسی زبان وادب پر اے ایم یو میں 3روزہ عالمی سیمینار

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مرکز برائے مطالعات فارسی کے زیر اہتمام 'اکبر اور صفوی کے عہد میں

فارسی زبان وادب کی مختلف جہات' موضوع پر تین روزہ عالمی سیمینار میں ملک کے مختلف علاقوں کے علاوہ ایران، افغانستان اور تاجکستان کے فارسی دانشور حصہ لے رہے ہیں۔ عالمی سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے معروف مورخ اور الہ آباد یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر نعیم الرحمن فاروقی نے کہا کہ فارسی زبان ہندوستانی ثقافت کا اہم حصہ رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اکبر کے عہد میں ایک ترجمہ سیکشن بھی قائم کیا گیا تھا تاکہ ہندوستان کی اہم ترین سنسکرت کتب کا فارسی زبان میں ترجمہ کرایا جاسکے اور فارسی کی نایاب کتب کا سنسکرت زبان میں ترجمہ کرایا گیا۔ انھوں نے کہا کہ رامائن، پنچ تنتر، لیلاوتی اور سنگھاسن بتیسی جیسی سنسکرت کتب کا فارسی زبان میں ترجمہ ہوا جس کے لیے انھوں نے برہمن دانشوروں کی خدمات حاصل کیں۔ ممتاز تاریخ داں پروفیسر ہربنس مکھیا نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ تاریخ ریجانات کا حصہ نہیں ہے۔ مذہب اور عقیدت کو کچھ لوگ تاریخ سمجھ لیتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یوروپین تاریخ مذہب سے متاثر ہے جبکہ ہندوستانی تاریخ اس عہد کے حقائق پر مبنی ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر پروفیسر طلعت احمد نے کہا کہ مغلیہ عہد میں فارسی ہندوستان کی سرکاری زبان تھی جس نے ہندوستانی تہذیب وثقافت اور ادب پر گہرے نقوش مرتب کیے۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل ضمیرالدین شاہ (ریٹائرڈ) نے کہا کہ ہندوستان کی عام وراثت کو فارسی زبان نے فروغ دیا۔ یہ ایک خوبصورت زبان ہے اور ہندوستانی تاریخ فارسی زبان میں محفوظ ہے۔ انھوں نے کہا کہ اے ایم یو میں فارسی زبان کو فروغ دیا جارہا ہے۔ ملک اور غیر ممالک سے آئے مندوبین کا خیر مقدم کرتے ہوئے مرکز برائے مطالعات فارسی کی ڈائرکٹر پروفیسر آذرمیدخت صفوی نے کہا کہ اکبر ہندوستان کی مشترکہ گنگا جمنی تہذیب کی علامت تھے۔ انھوں نے کہا کہ اس عالمی سیمینار میں 41 مندوبین ایران سے حصہ لے رہے ہیں۔ ساتھ ہی افغانستان اور تاجکستان سے بھی مندوبین آئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان میں اکبر اور ایران میں صفوی کا زمانہ ایک ہی تھا اور اکبر کے عہد میں بہت سے فارسی دانشور ہندوستان آئے تھے۔ اس موقعے پر وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل ضمیرالدین شاہ (ریٹائرڈ) نے تقریباً ایک درجن کتب کا اجرا کیا۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر احتشام الدین نے انجام دیے۔ آرٹس فیکلٹی کے ڈین پروفیسر شکیل احمد قاسمی نے کہا کہ مغلوں کی پہلی زبان ترکی تھی اور ایران کی پہلی زبان آذربائیجانی تھی لیکن دونوں ممالک نے فارسی زبان کو فروغ دیا۔ اس موقعے پر ایران کے ہندوستان میں واقع کلچرل کاؤنسلر ڈاکٹر علی دیہگاہی، تہران یونیورسٹی کے پروفیسر مہدی محقق علی اور ڈاکٹر مہدی ودمیری نے بھی فارسی زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اے ایم یو کے شعبۂ فارسی کے سربراہ پروفیسر سید محمد اسعد علی خورشید نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 4 فروری 2016

اردو کا درسیاتی ادب

گورکھپور: معروف معالج اور سماجی کارکن ڈاکٹر عزیز احمد

نے اردو کو ہندوستان جنت نشاں کی زبان قرار دیا اور کہا کہ اردو جیسی فصاحت، بلاغت اور موسیقی کسی اور زبان میں نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو اس ملک کی زبان ہے، یہیں پیدا ہوئی، پلی بڑھی اور پوری دنیا پر راج کررہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ زبان کا تعلق کسی فرقہ اور مذہب سے نہیں ہوتا۔ وہ یہاں سینٹ اینڈریوز کالج کے آڈیٹوریم میں منعقدہ یک روزہ شعبہ اردو سیمینار بعنوان اردو کا درسیاتی ادب میں بطور مہمان خصوصی مخاطب تھے۔ پروار سینٹ اینڈریوز کالج کے زیر اہتمام منعقدہ اس سیمینار کی صدارت کالج کے پرنسپل ڈاکٹر جے کے لال نے کی، جبکہ نظامت کے فرائض محمد متقبل جواد نے انجام دیے۔ ڈاکٹر عزیز احمد نے طلبا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ علم کے حصول میں سیمینار بھی اہم جز ہے، اگر اس میں مسلسل حصہ لیا جائے تو نہ صرف تعلیمی لیاقت میں اضافہ ہوگا بلکہ سماجی سیکٹر بھی مضبوط ہوگا۔ سرسید ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے روح رواں ڈاکٹر غیاث الدین نے اردو کو گنگا جمنی تہذیب کی علامت قرار دیتے ہوئے کہا کہ حالانکہ اس زبان کو سیاسی سرپرستی نہیں مل رہی ہے اور اس کے ساتھ تعصب کا رویہ اپنایا جارہا ہے لیکن اس کے باوجود یہ زبان ترقی کررہی ہے اور اس کا جادو سرچڑھ کر بول رہا ہے۔ ڈی ڈی یو یونیورسٹی گورکھپور کے شعبہ اردو کے سربراہ ڈاکٹر رضی الرحمن نے بتایا کہ اردو کے فروغ میں اس ادارے کا اہم کردار رہا ہے۔ مجنوں گورکھپوری اسی ادارہ سے وابستہ تھے، جنھوں نے ملک ہی نہیں بلکہ بین الاقوامی سطح پر اردو کے جھنڈے کو بلند کیا۔ انھوں نے شعبۂ اردو میں زیر تعلیم طلبا و طالبات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ان کی تعداد کو دیکھ کر لگتا ہے کہ اردو کا مستقبل روشن ہے۔ جلسہ کے موضوع کی ستائش کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ درسیاتی ادب کے ذریعے جدت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ڈاکٹر رضی الرحمن نے کالج انتظامیہ سے بچوں کے ذریعے شروع کیے گئے وال میگزین کو کتابی میگزین کی شکل دینے کی بھی درخواست کی۔ ڈاکٹر جے کے لال نے بلا مبالغہ کہا کہ انھیں اردو لکھنا اور پڑھنا نہیں آتا ہے لیکن اس کو سننا بہت اچھا لگتا ہے۔ جیسے کانوں میں شہد گھلتا۔ انھوں نے پروگرام کے منتظمین کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے اردو کے فروغ واشاعت

میں کالج کی جانب سے ہر ممکن تعاون کی یقین دہانی کرائی۔ وہیں اس بات کا بھی عزم کیا کہ وال میگزین کو کتابی میگزین کی شکل دی جائے گی۔ کالج کی استاذ محترمہ پروین عباسی نے اردو کو محبت سے تشبیہ دیتے ہوئے کہا کہ اس سے ایک بار لو لگا لیا جائے تو وہ زندگی بھر ساتھ رہتی ہے۔ انھوں نے طلبا کو تلفظ پر خاص دھیان دینے کی نصیحت بھی کی۔ شعبۂ اردو کے سربراہ ڈاکٹر ساجد حسین انصاری نے استقبالیہ کلمات پیش کیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 14 جنوری 2016

بی ایس عبدالرحمٰن جنوبی ہند کے سرسید تھے

علی گڑھ: ماہنامہ 'دا علی گڑھ موومنٹ' کے زیر اہتمام جنوبی ہند کے عظیم ماہر تعلیم اور ممتاز صنعت کار بی ایس

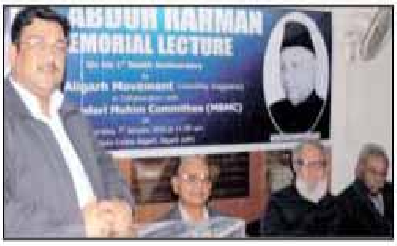

عبدالرحمٰن کے پہلے یوم وفات پر ایک یادگاری خطبے کا انعقاد کیا گیا۔ بھاری سید عبدالرحمٰن نہ صرف جنوبی ہند کے ممتاز صنعت کار تھے بلکہ ایک عظیم ماہر تعلیم بھی تھے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر رضاء اللہ خاں نے بی ایس عبدالرحمٰن کے پہلے یوم وفات کے موقعے پر ماہنامہ 'دا علی گڑھ موومنٹ' کے زیر اہتمام حزل منزل کامپلیکس میں واقع میڈیا سینٹر پر منعقدہ یادگاری خطبہ کی صدارت کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے کہا کہ بی ایس عبدالرحمٰن نے 15 سال کی عمر میں صرف 149 روپے سے کولمبو (سری لنکا) میں ہیروں کا کاروبار شروع کیا تھا اور پھر اپنی محنت، جانفشانی اور ایمانداری سے وہ عالمی سطح کے صنعت کار و تاجر بن کر ابھرے۔ ماہنامہ 'دا علی گڑھ موومنٹ' کے مدیر اعلیٰ ڈاکٹر جسیم محمد نے کہا کہ جنت مکانی بی ایس عبدالرحمٰن نے 1954 میں ہانگ کانگ سے پریشس ٹریڈنگ کمپنی کے ذریعے اپنے کاروبار کو عالمی سطح پر فروغ دیا لیکن وہ عام تاجروں کی طرح صرف کاروبار اور صنعت تک ہی محدود نہیں رہے بلکہ انھوں نے عظیم مصلح قوم سرسید علیہ الرحمۃ کی پیروی کرتے ہوئے جنوبی ہندوستان میں تعلیمی اداروں کا ایک سلسلہ قائم کیا تاکہ سماج کی تعلیمی خود کفالت کا فریضہ انجام دیا جاسکے۔ انھوں نے کہا کہ مسٹر بی ایس عبدالرحمٰن جنوبی ہند کے سرسید کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر جسیم محمد نے کہا کہ ماہنامہ 'دا علی گڑھ موومنٹ' کا اصل مقصد سرسید کے تعلیمی مشن کی ترویج و اشاعت ہے اور بی ایس عبدالرحمٰن نے سرسید کے تعلیمی مشن کو جس طرح فروغ دیا اس کا تقاضہ ہے کہ آج ماہنامہ 'دا علی گڑھ موومنٹ' بی ایس عبدالرحمٰن کو شاندار خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کی یاد میں علی گڑھ کے پنجی پور میں بی ایس عبدالرحمٰن جونیئر پبلک اسکول قائم کرنے کا اعلان کرتا ہے۔ ڈاکٹر جسیم نے کہا کہ سماج کے محروم طبقات کے تعلیمی فروغ کے لیے بی ایس عبدالرحمٰن کی یاد میں بی اسکالرشپ بھی جاری کیے جائیں گے جو بی ایس عبدالرحمٰن کو ایک خراج عقیدت ہوگا۔ انھوں نے مزید کہا کہ بی ایس عبدالرحمٰن جیسی عظیم شخصیت کو سب سے بڑا اور سچا خراج عقیدت یہی ہے کہ ہم ان کی دکھائی راہ پر چلیں اور ان کے مشن کو آگے بڑھاتے ہوئے بڑی تعداد میں تعلیمی ادارے قائم کریں تاکہ ملک میں ناخواندگی کی شرح کو کم کیا جاسکے۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 18 جنوری 2016

بہار:

غیر اردو اسکولوں میں اردو کے مسائل

ارریہ: اردو کے مسائل ہر جگہ الجھے ہوئے ہیں اردو داں اگر سنجیدہ ہوں تو اس کے بکھرے ہوئے گیسو کو سنوارا

جاسکتا ہے۔ اردو کے عملی فروغ کے لیے بہار میں اردو اکادمی ہر سطح پر سرگرم ہے۔ اس مہم کو ہمیں اپنے گھر سے شروع کرنے کی ضرورت ہے۔ ان خیالات کا اظہار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان حکومت ہند اور دعوت القرآن ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ کی جانب سے یہاں 'غیر اردو اسکولوں میں اردو کے مسائل' پر منعقدہ قومی سیمینار سے معروف افسانہ نگار، اردو اکادمی کے سکریٹری مشتاق احمد نوری نے کیا۔ سیمینار میں ہندوستان کے علاوہ نیپال اور انگلینڈ سے تشریف لائے اسکالروں نے حصہ لیا۔ مقالات کے ساتھ اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے اردو کے فروغ کے لیے قیمتی مشورے دیے۔ اس موقعے پر معروف افسانہ نگار، اردو اکادمی بہار کے سکریٹری مشتاق احمد نوری کو 'سفیر اردو ایوارڈ' سے نوازا گیا۔ ریٹائرڈ جج زبیر الحسن غافل، ممبران اسمبلی عابد الرحمٰن اور سرفراز عالم نے ان کی خدمات کو یاد کرتے ہوئے مزید بہتر توقعات کی امید کی۔ سیمینار میں عبداللہ پٹیل، مسٹر عقیل احمد موگراویا لندن کو بھی ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ پروگرام میں مفتی عبدالوہاب قاسمی ارریا، مولانا عارف قاسمی گجرات، مسعود عالم ندوی لکھنؤ، حامد حسین دہلی، اسحاق احمد نیپال، ارشد انور الف سمیت متعدد دانشوران، ادبا، فنکار وغیرہ موجود تھے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 19 جنوری 2016

اردو کانفرنس کا انعقاد

پٹنہ: انجمن ترقی اردو گوپال گنج کے زیر اہتمام مورخہ 4 جنوری 2016 کو گوپال گنج ضلع کے اردو کالج میں سارن ڈویژنل اردو کانفرنس منعقد ہوا جس میں کثیر تعداد میں اردو دوستوں اور طلبا و طالبات موجود تھے۔ اس کانفرنس کا افتتاح ڈاکٹر عبدالغفور، وزیر اقلیتی فلاح کے ذریعے کیا گیا۔ کانفرنس کی صدارت اظہار الحق صدیقی، صدر انجمن ترقی اردو بہار نے کی۔ اس موقعے پر انجمن ترقی اردو گوپال گنج کی جانب سے پرائمری اور سکنڈری اسکولوں کے علاوہ مدارس کے طلبہ اور طالبات کے درمیان منعقد تحریری انعامی مقابلہ میں کامیاب تقریباً 137 بچوں کو انعامات سے نوازا گیا۔ اس موقعے پر وزیر نے جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ حکومت لازمی طور پر تمام 72 ہزار پرائمری اور مڈل اسکولوں میں ایک ایک اردو اساتذہ کی تقرری کے لیے پابند عہد ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ انجمن ترقی اردو بہار کے ذریعے اردو آبادی کو بیدار کرنے کی جو کاوش ہو رہی ہے وہ قابل ستائش ہے۔ انجمن ترقی اردو بہار کی پرانی تاریخ ہے۔ انھوں نے اردو کے فروغ کے لیے متحد ہو کر کام کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ اس موقعے پر انجمن ترقی اردو بہار کے سکریٹری عبدالقیوم انصاری نے انجمن کا تعارف پیش کرتے ہوئے حکومت سے مختلف مانگیں رکھیں جس پر وزیر موصوف نے سنجیدگی سے غور کرنے کی بات کہی۔ اس موقعے پر انجمن ترقی اردو گوپال گنج کے ذریعے منعقد تحریری مقابلہ کے کامیاب طلبا و طالبات کو انعامات سے نوازا گیا۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 6 جنوری 2016

شاد عظیم آبادی یادگاری تقریب

پٹنہ: شاد عظیم آبادی کو تاریخی، تہذیبی اور ادبی لحاظ سے

تاریخی مقام حاصل ہے۔ ان کے کلام میں دلی اور لکھنؤ ادبی اسکول کا امتزاج ملتا ہے۔ ان کی شاعری اخلاقی اور اصلاحی ہے جس میں محبت، جوش، ولولہ اور زندگی جینے کا حوصلہ اور جذبہ شامل ہے۔ پروفیسر طلحہ رضوی برق نے شاد عظیم آبادی کی شاعری کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے یہ باتیں کہیں، وہ محکمہ کابینہ سکریٹریٹ اردو ڈائریکٹوریٹ کی جانب سے منعقد شاد عظیم آبادی یادگاری تقریب سے خطاب کررہے تھے۔ پروفیسر طلحہ نے کہا کہ شاد کی شاعری دل کی شاعری ہے جس میں زندگی کے تمام پہلو بڑے ہی عام فہم زبان میں بیان کیے گئے ہیں جو عوام کے دل کی دھڑکن ہے۔ انھوں نے شاد کے چند اشعار بھی پیش کیے اور ان کی اہمیت اور معنویت سے انھیں روبرو کرایا۔ پروفیسر علیم اللہ حالی نے کہا کہ شاد کو صرف غزل گو شاعر کہنا شاد کے ساتھ بڑی ناانصافی ہوگی۔ انھوں نے کہا کہ شاد کو ہمیں ایک فنکار اور تخلیق کار کے طور پر دیکھنا چاہیے۔ ان کی شاعری میں عشق حقیقی اور عشق مزاجی دونوں پہلو شامل ہیں۔ بحور و اوزان کا تنوع ان کے یہاں سب سے زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ ان کا اندازِ بیان تصنع سے پاک ہے۔ اردو ڈائریکٹوریٹ کے ڈائریکٹر امتیاز احمد کریمی نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ عظیم آباد کی کئی ایسی مشہور و مقبول ہستیاں ہیں جن کی شخصیات پر یادگاری تقریب کا اہتمام کرنا چاہیے۔ کلیم الدین احمد، سہیل عظیم آبادی، جمیل مظہری، کلیم عاجز، ش مظفر پوری، اختر اورینوی اور پروفیسر عبدالمغنی سمیت 8 شخصیات کی یادگاری تقریبات کا جلد ہی سلسلہ شروع کیا جائے گا۔ تقریب کی صدارت اردو ڈائریکٹوریٹ کے چیئرمین شفیع مشہدی نے کی جبکہ نظامت ڈپٹی ڈائریکٹر خورشید اکبر نے کی۔ تقریب میں شامل ہونے والوں میں قاسم خورشید، ناشاد اورنگ آبادی، حسن نواب حسن، اسلم جاوداں وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 8 جنوری 2016

خواتین کی سہ روزہ اردو قومی کانفرنس

پٹنہ: خواتین کا احتجاج مردوں کے خلاف نہیں بلکہ سسٹم کیخلاف ہے۔ عورتوں کی یہ آواز یوروپ سے شروع ہوئی تھی جواب اس ملک میں پہنچی ہے۔ فیمنزم گھریلو تعلقات تک محدود نہیں ہے، ہمیں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ سسٹم میں

خامیاں موجود ہیں اور اسے درست کرنے کی ضرورت ہے۔ مشہور افسانہ نگار ذکیہ مشہدی نے خواتین کے سہ روزہ جلسے میں اتوار کو خواتین کی موجودہ صورت حال پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے یہ باتیں کہیں۔ انھوں نے کہا کہ عورتوں کی صلاحیت پر یہ سماج ابھی بھی مشکوک ہے جبکہ اس خط پر مرد اور عورت کی تقسیم کو کسی طرح جائز قرار نہیں دیا جاسکتا۔ انھوں نے کہا کہ عورت کی نفسیات جیسی کوئی چیز نہیں ہے اور اسے طول نہیں دینا چاہیے۔

کرناٹک اردو اکادمی کی صدر ڈاکٹر فوزیہ چودھری نے کہا کہ اردو آبادی کی احساس کمتری کو زبان کی ترقی میں حائل اور سب سے بڑی رکاوٹ بتایا۔ اردو کی معروف افسانہ نگار نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ عورت اور مرد دو پلیٹ فارم نہیں ہیں۔ انھوں نے کہا کہ عورت اور مرد قلم کار ایک ہیں اور ان کے موضوعات بھی ایک جیسے ہیں۔ منٹو سے آج تک سبھی نے خواتین کے مسائل کو اپنے ادب کا موضوع بنایا، اس لیے مرد اور عورت کے لیے دو راستے طے کرنا درست نہیں۔ خواتین بس اس بات کی حقدار ہیں کہ انھیں ان کے حقوق سے محروم نہ کیا جائے اور انھیں بھی عزت اور احترام بخشا جائے۔ ثروت خاں نے نگار عظیم کے افسانہ 'اکیوریم' کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو کی۔ انھوں نے سیشن میں پڑھے گئے مقالوں پر تبصرہ کرتے ہوئے مقالہ نگاروں کو مختصر مقالے لکھنے اور پڑھنے کا مشورہ دیا۔ انھوں نے کہا کہ مستعار خیالات لے کر آپ اپنی رائے قائم نہ کریں کیونکہ اردو ادب میں خوشنودی کا چلن گھر کرگیا ہے جو کسی بھی ادب کے لیے اچھی علامت نہیں ہے۔ مقالہ نگاروں کو اپنے موضوعات سے الگ نہ ہٹنے کی تلقین کرتے ہوئے نظامت کررہی تسنیم کوثر نے کہا کہ انھیں اس پر توجہ دینی چاہیے۔ نگار عظیم نے اپنا افسانہ 'اکیوریم' پڑھ کر سنایا جسے سامعین نے بے حد پسند کیا اور اس کے لیے انھیں خوب داد و تحسین ملی۔ اس سے قبل کے اجلاس میں مقالہ نگاروں نے اپنے مقالے پیش کیے اور بعد میں سوال و جواب کا سیشن بھی ہموار ہوا جس میں مقالے کے تعلق سے چند لوگوں نے مقالہ نگاروں سے سوالات کیے۔ ڈاکٹر اشرف جہاں نے 'اردو میں نسائی حسیت کا اظہار' ڈاکٹر سیما ظفر نے اردو فکشن کی تانیثیت' تبسم فاطمہ نے 'اردو فکشن میں نسائی حسیت' کے موضوع پر اپنے مقالے پیش کیے۔ بعد کی نشست میں افشاں ملک، شائستہ فاخری، غزالہ قمر، اعجاز اور صدف اقبال نے افسانے کے تعلق سے خواتین کی خدمات پر گفتگو کی۔ اس کی صدارت ذکیہ مشہدی نے کی۔ بعد ازاں سکریٹری بہار اردو اکادمی نے افسانہ نگاروں کو مومنٹو اور اسناد تقسیم کی اور جلسے کی اس نشست کا اعلان کیا گیا۔ شام میں جلسے کے

اختتام سے قبل ایک شعری نشست بھی منعقد کی گئی جس میں ڈاکٹر نگار عظیم، کہکشاں تبسم، صدف اقبال، تبسم ناز، ریحانہ نواب، صبا عزیز، سیدہ شان معراج وغیرہ نے اپنے کلام پیش کیے۔ اس کے بعد اس سہ روزہ جلسے کا باضابطہ اختتام ہوا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 1 فروری 2016

تلنگانہ:

سائنس کے میدان میں مسلمانوں کا عروج وزوال

حیدر آباد: سائنس کے مطالعہ کے لیے سماج میں

سائنسی طریقۂ اکتساب کی قبولیت ضروری ہے۔ پاکستان کے ممتاز نیوکلیر سائنسداں پروفیسر پرویز ہود بھائی نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں ایک خصوصی لکچر کے دوران اس خیال کا اظہار کیا۔ ''سائنس کے میدان میں مسلمانوں کا عروج و زوال'' کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے انھوں نے نشاندہی کی کہ آٹھویں صدی عیسوی میں موجودہ عراق کے شہر بصرہ اور بغداد میں معتزلہ مکتبِ فکر کی داغ بیل ڈالی گئی۔ اس دور میں تقریباً 5 صدیوں تک مسلم معاشرے میں سائنس کے فروغ کی اہم وجہ متنوع نظریات اور عقائد کے تئیں سماجی رواداری کا جذبہ رہا۔ پروفیسر ہود بھائی نے نظام تعلیم میں اصلاحات کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ طلبہ میں تنقیدی انداز فکر کو پروان چڑھایا جائے۔ سائنس، حقائق کا مجموعہ نہیں بلکہ تحصیل علم کا طریقۂ کار ہے۔ تجریدی علم کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ علم کو معاشی حوالے سے آنکنے کے بجائے اس کی محض علم کے طور پر قدر کرنی چاہیے۔ سائنس کا کوئی عقیدہ، رنگ یا مذہب نہیں ہوتا۔ اسے نظریات سے بالاتر ہونا چاہیے۔ اس موقعے پر وائس چانسلر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی ڈاکٹر محمد اسلم پرویز نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ یونیورسٹی، اعلیٰ تعلیم بالخصوص سائنس کے شعبہ میں انگریزی زبان کی اہمیت بخوبی سمجھتی ہے۔ ہماری یونیورسٹی اس بات کی کوشش کرے گی کہ وہ مدرسہ اور اردو میڈیم کے پس منظر کے حامل طلبہ کے لیے جو اعلیٰ تعلیم کے حصول کی خاطر عصری علوم سیکھنا چاہتے ہیں، ایک کڑی کے طور پر کام کرے۔ پروفیسر پی فضل الرحمٰن، ڈین اسکول آف سائنسز نے اردو یونیورسٹی میں اسکول آف سائنسز کے قیام اور فروغ کا مختصر جائزہ پیش کیا۔ ڈاکٹر پریہ حسن، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ طبیعیات نے مہمان کا تعارف کروایا۔ جناب میر ایوب علی خان، میڈیا کوآرڈینیٹر نے کارروائی چلائی اور شکریہ ادا کیا۔ پروگرام کا آغاز حافظ منیر کی قرأت کلام پاک سے ہوا۔

پریس ریلیز: انچارج رابطۂ عامہ، مولانا آزاد یونیورسٹی حیدرآباد، 31 جنوری 2016

کیرالا:

اقبال ٹائیلنٹ میٹ

کالی کٹ: اردو ہماری پہچان ہے، ہماری قومی یکجہتی اردو زبان سے ہے، اس زبان نے آزادی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ مذکورہ خیالات کا اظہار کیرالا اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام کالی کٹ مرکز میں منعقد سیمینار 'اقبال ٹائیلنٹ میٹ' کے موقعے پر اپنے افتتاحی خطاب میں رحیم نے کیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان نے ہمیں گنگا جمنی تہذیب کا درس دیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ آج کیرالا میں اردو بڑی تیزی سے پھیل رہی ہے، اس کے پیچھے جامعہ مرکز کا اہم کارنامہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کو کسی مذہب یا ذات سے نہ جوڑا جائے۔ کیرالا میں نئے اسکول کی منظوری ملنے پر اردو زبان کو سیکنڈر لینگویج کا درجہ دیا جاتا ہے یہ بڑی اچھی بات ہے۔ انھوں نے کہا کہ کے یو ٹی اے نے اردو کے فروغ کی خاطر جدوجہد جاری رکھی ہے، جس کے نتیجے میں انعامی مقابلہ، سیمینار، محفل اردو جیسے کئی اہم پروگرام کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ اجلاس کی صدارت پی کے سی محمد ماسٹر نے کی جبکہ بحیثیت مہمان خصوصی مولانا شاہد حسین ثقافی نے شرکت کی۔ اس موقعے پر این کے عبدالحکیم، سلام ملیما، ایم پی عبدالستار، کے وی احمد، پی کے نوشاد شریف وغیرہ بھی موجود تھے۔ اس موقعے پر طلبہ نے نعت، غزل اور تقریریں پیش کیں۔ اقبال ٹائیلنٹ مقابلہ میں کافی تعداد میں طلبہ و طالبات شریک ہوئے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 11 جنوری 20166

مغربی بنگال:

مغربی بنگال میں مسلم امیدواروں کی شاندار کامیابی

کولکاتا: مغربی بنگال سروس کمیشن میں اس مرتبہ مسلم امیدواروں نے بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے اور 144 امیدواروں میں کل 30 مسلم امیدوار کامیاب ہوئے ہیں۔ مسلم امیدواروں کی بہترین کارکردگی پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے مغربی بنگال اقلیتی و مالیاتی کارپوریشن کے چیئرمین سلطان احمد نے کہا کہ آزادی کے بعد پہلی مرتبہ اتنی بڑی تعداد میں بنگال سروس کمیشن کے نتائج میں مسلم امیدوار کامیاب ہوئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مغربی بنگال کے مسلمانوں میں تعلیمی بیداری آرہی ہے اور تعلیمی شرح بھی بہتر ہوئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ بس ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ کوشش جاری رہے۔ یو این آئی سے بات کرتے ہوئے اقلیتی و مالیاتی کارپوریشن کے چیئرمین سلطان احمد نے کہا کہ مغربی بنگال کی وزیر اعلیٰ ممتا بنرجی نے سرکاری ملازمت میں مسلمانوں کی نمائندگی کی شرح اضافہ کرنے کے لیے او بی سی کوٹہ میں ریزرویشن کی سہولت متعارف کرائی تھی اور اس کے تحت مسلمانوں کی بیشتر برادری کو او بی سی کوٹہ کے تحت لایا گیا تھا۔ یہ کامیابی بھی اسی پالیسی کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ پالیسی کے شعبے میں بھی مسلمانوں کی نمائندگی بہتر ہوئی ہے اور مغربی بنگال پولس سروس کمیشن میں بھی 30 میں سے پانچ مسلم امیدوار کامیاب ہوئے ہیں۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 22 جنوری 2016

اعزاز و اکرام:

ڈاکٹر محمد اسلم ممتاز سائنٹسٹ ایوارڈ سے سرفراز

نئی دہلی: ونیس انٹرنیشنل فاؤنڈیشن تمل ناڈو نے جامعہ

ہمدرد یونیورسٹی کے فیکلٹی آف یونانی میڈیسن کے شعبۂ علم الادویہ سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر محمد اسلم کو

ان کے گراں قدر طبی خدمات کے اعتراف میں ممتاز سائنٹسٹ ایوارڈ سے سرفراز کیا۔ یہ ایوارڈ وینس انٹرنیشنل فاؤنڈیشن کی طرف سے بنگلور میں بین الاقوامی سیمینار جو سی سی آر ایس اور یو جی سی کے تعاون سے منعقد تقریب میں دی گئی۔ واضح رہے کہ ڈاکٹر محمد اسلم جامعہ ہمدرد میں یونانی میڈیسن کے شعبہ علم الادویہ میں ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیں اور ماڈرن فارماکولوجی ان کا پسندیدہ موضوع ہے اور اس سلسلے میں وہ روز بروز اپنی تحقیقات میں اضافہ کرتے رہتے ہیں جس کا اعتراف وینس انٹرنیشنل فاؤنڈیشن تمل ناڈو نے کیا اور انھیں ممتاز سائنٹسٹ کے ایوارڈ سے سرفراز کیا۔ اس موقعے پر جامعہ ہمدرد کے طلبہ و اساتذہ نے انھیں مبارکباد پیش کی اور نیک خواہشات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 8 جنوری 2016

اقبال انصاری کو اعزاز

ممبئی: چلتی ٹرین میں ایک حاملہ خاتون کی بروقت مدد کے ذریعے زچہ اور بچہ کی جان بچانے میں اہم کردار ادا کرنے والے رکن انقلاب اقبال انصاری کو ممبئی کی میئر اسنیہل امبیکر نے منگل کو باقاعدہ اعزاز سے نوازا۔ گروپ لیڈرس کی میٹنگ میں اقبال انصاری کو، جو بی ایم سی امور کے کوریج کے ذمے دار ہیں، کارپوریشن کا علامتی میڈل، شال اور 'شری پھل' ناریل پیش کیا گیا۔ اس موقعے پر میئر نے جذباتی انداز میں اقبال کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ''آپ جیسے لوگ ہیں جن سے انسانیت زندہ ہے، آپ نے بروقت مدد کر کے خاتون اور نوزائیدہ بچے کی جان بچائی ہے۔''

واضح رہے کہ 13 اکتوبر 2015 کو کلیان سے ممبئی سی ایس ٹی جانے والی لوکل ٹرین میں ایک حاملہ خاتون سودیوی نے جو اپنے شوہر کے ساتھ مردوں کے ڈبے میں سفر کر رہی تھی، بچے کو جنم دیا تھا لیکن اچانک زچگی کی وجہ سے بچے کی نال جوں کی توں تھی اور اسے ماں سے الگ نہیں کیا جا سکا تھا۔ بچے کا باپ رام دیو اسے اپنے دونوں ہاتھوں میں لیے بے بسی اور پریشانی کے عالم میں تھا جبکہ کمپارٹمنٹ کے مسافر محض تماشائی بنے ہوئے تھے۔ اقبال انصاری بھی اسی ڈبے میں سفر کر رہے تھے۔ انھوں نے فوراً ریلوے ہیلپ لائن پر رابطہ کیا اور خاتون کو فوری امداد پہنچانے کا انتظام کروایا۔ اس خبر کے مشتہر ہوتے ہی بی ایم سی کے اسٹینڈنگ کمیٹی میٹنگ میں شیوسینا کی رکن کشوری پیڈنیکر کی تجویز پر اقبال انصاری کی بیشتر اراکین نے ستائش کی۔ اس موقعے پر ڈپٹی میئر الکا کیلکر، ہاؤس لیڈر ترشن وشواس راؤ، سماج وادی پارٹی کے گروپ لیڈر رئیس شیخ، ایم این ایس کے گروپ لیڈر منوج کوٹک، ایجوکیشن کمیٹی کی چیئرپرسن رتو تاوڑے، امپاورمنٹ کمیٹی کے چیئرمین پرکاش گنگا دھرے اور میونسپل سکریٹری نارائن پتھاڑے موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 7 جنوری 2016

رسم اجرا:

بچے ہندوستانی اور درخشاں ستارے

نئی دہلی: جامعہ نگر کے ابوالفضل انکلیو 4 میں ایم ایم پبلشر ہال میں تعمیر ملت فاؤنڈیشن کی جانب سے نوجوان صحافی و شاعر حبیب سیفی کی ادب اطفال پر مبنی 2 کتب 'بچے ہندوستانی' اور 'درخشندہ ستارے' کا رسم اجرا ڈاکٹر حنیف ترین، ڈاکٹر فریاد آزر، ڈاکٹر بسمل عارفی، مرزا ذکی احمد بیگ، رضوان خان کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ صدر تقریب شاعر و ادیب ڈاکٹر حنیف ترین نے کہا کہ جس زبان میں بچوں کا ادب کم لکھا جاتا ہے، وہ زبان کمزور ہوتی چلی جاتی ہے۔ ادب اطفال وقت کی اصل ضرورت ہے۔ حبیب سیفی نے بچوں کے لیے عمدہ نظمیں لکھ کر یہ ثبت کر دیا کہ وہ بچوں کی تربیت و کردار سازی کے ساتھ اردو زبان کے لیے بھی سنجیدہ ہیں۔ جشن جمہوریہ کے موقعے پر منعقد اس تقریب رسم اجرا اور مشاعرہ میں کثیر تعداد میں ادب نوازوں نے شرکت کی اور بچوں کا ادب تخلیق کرنے پر حبیب سیفی کو مبارکباد پیش کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 25 جنوری 2016

طلبہ کیسے کامیاب ہوں

ھاپوڑ: جروٹھی روڈ پر واقع اندر پرستھ انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشنل اینڈ مینجمنٹ میں کتاب کے اجرا کی تقریب کا

انعقاد کیا گیا، جس میں موجود مہمانوں اور کالج مینیجنگ کمیٹی کے عہدے داروں نے ماہر تعلیم ڈاکٹر پربھات کمار کی طرف سے لکھی گئی 'طلبہ کیسے سفل ہوں' کتاب کا اجرا کیا گیا۔ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کمانڈنٹ راجیش کمار نے کہا کہ یہ کتاب طلبہ کے علاوہ عوام کے لیے بھی مفید ثابت ہوگی جو شخص دل لگا کر کتاب کو پڑھے، اس کی زندگی میں امن و سکون اور کامیابی مل سکتی ہے۔ کرنل اتل کمار نے ڈاکٹر پربھات کمار کی تحریروں کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ کتاب طلبہ کے لیے سنگ میل ثابت ہوگی۔ ڈاکٹر وپن گپتا اور ڈاکٹر وکاس گپتا نے مشترکہ طور پر کتاب پر روشنی ڈالتے ہوئے نیتاجی سبھاش چندر بوس کی زندگی پر بھی روشنی ڈالی۔ تقریب میں کتاب کا اجرا سینٹرل اسکول ڈائریکٹر بی این چودھری، بجرنگ بہاری سنگھ، آرتی اور پرنب کمار، ڈاکٹر وپن گپتا، ڈاکٹر جے پی این شریواستو وغیرہ کی طرف سے کیا گیا۔ پروگرام میں ڈاکٹر پربھات کمار کو انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے سوامی وویکانند اعزاز دیا گیا۔ اس کے علاوہ طالبہ دیپکا کو بھی اعزاز دیا گیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 جنوری 2016

روہیل کھنڈ میں اردو گیت نگاری

شاھجھاں: محلہ تارین جلال نگر میں مشہور شاعر نسیم شاہجہاں پوری کی رہائش گاہ پر منعقد ایک ادبی تقریب

سہ ماہی 'پیام معارف' کے اجرا کا منظر

میں ڈاکٹر انجم سحر کی کتاب 'روہیل کھنڈ میں اردو گیت نگاری' کا اجرا عمل میں آیا۔ اتوار کے روز تقریب میں مہمان خصوصی مشہور سرجن ڈاکٹر وسیم حسن خاں نے کتاب کا اجرا کرتے ہوئے کہا کہ روہیل کھنڈ میں اردو گیت نگاری اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے۔ ڈاکٹر محترمہ انجم سحر نے اس کتاب کو لکھ کر نہ صرف اردو گیت نگاروں کا احاطہ کیا ہے بلکہ روہیل کھنڈ کی تاریخ سے بھی قارئین کو واقف کرایا ہے۔ انشائیہ پرداز سید مشہود جال نے کہا کہ اردو گیتوں پر بہت کم تحقیق ہوئی ہے۔ علاقائی سطح پر گیت کی نشو و نما اور ارتقا کا سراغ پانے کی شاید یہ پہلی اور سنجیدہ کوشش ہے۔ موضوع کی اہمیت اور تازگی کے پیش نظر انجم سحر کی تحقیق وتلاش داد و تحسین کے قابل ہے۔ ناظم جلسہ وسیم مینائی نے کتاب کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ انجم سحر کی یہ کتاب تاریخی ثابت ہوگی۔ کتاب کی مصنفہ ڈاکٹر انجم سحر نے کہا کہ اس کتاب میں روہیل کھنڈ میں گیت نگاری کے ارتقائی سفر کا حقیقی تعارف پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ محفل کی صدارت محمد وسیم خاں پہانوی نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، یکم فروری 2016

پیامِ معارف سہ ماہی

ادارہ معارف القرآن شاستری پارک دہلی کے تحت ایک پروقار تقریب مولانا فیاض احمد فیضی قاسمی (بانی و مہتمم) کی سرپرستی میں منعقد ہوئی جس کی صدارت مولانا محمد نسیم مظاہری نے کی۔ اس موقعے پر 'پیام معارف سہ ماہی' کا اجرا علمائے کرام کے ہاتھوں عمل میں آیا اور ادارہ معارف القرآن کے ششماہی امتحان میں کامیاب ہونے والے طلبہ کو انعامات سے بھی نوازا گیا۔ بحیثیت مہمان خصوصی سید طارق بخاری نے 'پیام معارف' کی اشاعت پر اس کے ایڈیٹر مفتی محمد عیاض مظاہری کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے مدرسہ ہذا سے اپنی گہری وابستگی کا اظہار کیا اور کہا کہ یہاں کا خوبصورت انتظام وانصرام طلبہ کی شائستگی دیکھ کر منتظمین مدرسہ کی خدمات لائق ستائش ہیں۔ مولانا محمد مسلم قاسمی (صدر جمعیہ علاء دہلی)، اپنے خطاب میں ادارہ معارف القرآن کی تعلیمی خدمات کو سراہا۔ آخر میں مولانا محمد نسیم مظاہری نے اپنے صدارتی خطبہ میں مدارس کی اہمیت وافادیت کو اجاگر کیا نیز مولانا فیاض فیضی کے کلمات تشکر اور مولانا محمد مسلم کی دعا پر پروگرام اختتام پزیر ہوا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 جنوری 2016

بیگ صاحب: غریبوں اور کمزوروں کے مسیحا

نئی دہلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ڈاکٹر ایم اے انصاری آڈیٹوریم میں معروف سماجی کارکن، ماہر تعلیم اور جامعہ کوآپریٹو بینک کے بانی مرزا فریدالحسن بیگ مرحوم کی زندگی اور خدمات پر مبنی کتاب 'بیگ صاحب: غریبوں اور کمزوروں کے مسیحا' کا اجرا مشہور و معروف ماہر تعلیم اور مہاراشٹر کاسموپولیٹن ایجوکیشن سوسائٹی کے چیئرمین، جناب پی اے انعامدار کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ پروگرام کا افتتاح کرتے ہوئے بیگ صاحب کے بیٹے اور جامعہ کوآپریٹو بینک کے موجودہ چیئرمین مرزا قمرالحسن بیگ نے کتاب کے مصنف خالد انصاری کے بارے میں بتایا کہ انھوں نے کیسے بیگ صاحب کے آبائی گاؤں انجان شہید، اعظم گڑھ جا کر ان کی زندگی کے بارے میں تمام تفصیلات معلوم کیں اور پھر تقریباً 6 ماہ کے عرصے میں اس کتاب کو مکمل کیا۔ یہ کتاب پہلے انگریزی میں لکھی گئی، پھر اس کا اردو ترجمہ کرایا گیا۔ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے جنرل سکریٹری، اتل کمار انجان نے بیگ صاحب کے ساتھ اپنے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ "علم کے شعبے میں اور خاص کر لڑکیوں کو بااختیار بنانے میں مرزا فریدالحسن بیگ نے جو خدمات انجام دیں، وہ سنہرے حروف میں لکھے جانے کے لائق ہے۔" اس موقعے پر پروفیسر اخترالواسع، نئی دنیا کے ایڈیٹر شاہد صدیقی وغیرہ نے خراج عقیدت بھی پیش کیے۔

روزنامہ سیاسی تقدیر دہلی، 11 جنوری 2016

وفیات:

انتظار حسین

لاهور: برصغیر ہند و پاک کے معروف ادیب، افسانہ و کالم نگار اور دونوں ملکوں میں باہم محبت کی ایک اہم کڑی انتظار حسین طویل علالت کے بعد 2 فروری 2016 کو لاہور میں انتقال کر گئے۔ ان کی عمر 92 برس تھی۔ ان کی نمازِ جنازہ بدھ کو ادا کی گئی۔ ان کا شمار موجودہ عہد میں پاکستان ہی کے نہیں بلکہ اردو فکشن، خاص طور پر افسانے یا کہانی کے اہم ترین ادیبوں میں کیا جاتا تھا۔ انتظار حسین 7 دسمبر 1923 کو ہندوستان کے ضلع بلند شہر کے علاقے ڈبائی میں پیدا ہوئے۔

انتظار حسین نے میرٹھ کالج سے بی اے کیا۔ انھوں نے لاہور میں پنجاب یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا اور صحافت کے شعبے سے وابستہ ہو گئے۔ انتظار حسین نے متعدد افسانے اور ناول تحریر کیے جبکہ بہت سی انگریزی کتابوں کے اردو تراجم بھی کیے۔ ان کی شہرۂ آفاق تصنیفات میں 'بستی، ہندوستان سے آخری خط، آگے سمندر ہے، شہر افسوس، جنم کہانیاں اور وہ جو کھو گئے شامل ہیں۔ افسانہ نگاری کے علاوہ وہ مختلف انگریزی اور اردو اخبارات کے ساتھ بطور کالم نویس وابستہ رہے۔ روزنامہ مشرق میں طویل عرصے تک چھپنے والے ان کے کالم لاہور نامہ کو بہت شہرت ملی۔ وہ ریڈیو کے لیے بھی کالم نگاری کرتے رہے۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'گلی کوچے' 1953 میں شائع ہوا تھا۔ انتظار حسین کے افسانوں کے آٹھ مجموعے، چار ناول، آپ بیتی کی دو جلدیں، ایک ناولٹ شائع ہوئے۔ وہ پہلے پاکستانی ہیں جو سنہ 2013 میں بین الاقوامی بکر پرائز ایوارڈ کے لیے شارٹ لسٹ ہوئے۔ انتظار حسین فیض احمد فیض، ابن انشا، احمد فراز، منیر نیازی، سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی، اے حمید سمیت دیگر مشاہیر کے ہم عصر ادیب ہیں۔ انھیں جدید اردو افسانہ نگاری کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ انتظار حسین کی ادبی خدمات پر انھیں 2012 میں لاہور لٹریری فیسٹول میں 'لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ' سے نوازا گیا، علاوہ ازیں 2014 میں ان کی خدمات کے اعتراف میں فرانس کی حکومت نے انھیں اعلیٰ ترین سول ایوارڈ سے بھی نوازا۔ انتظار حسین کے انتقال سے اردو ادب کا ایک روشن باب بند ہو گیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 3 فروری 2016

ندا فاضلی

ممبئی: اردو کے مشہور شاعر ندا فاضلی کا 78 سال کی عمر میں 8 فروری 2016 کو دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہوگیا۔ انھوں نے دن میں کوئی ساڑھے گیارہ بجے آخری سانس لی۔ 12 اکتوبر 1938 کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ندا فاضلی کا مکمل نام مقتدا حسن ندا فاضلی تھا۔ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ پدم شری ندا فاضلی کا بچپن اور جوانی گوالیار میں گزری جہاں سے انھوں نے اپنی تعلیم مکمل کی۔ 1957 میں گوالیار کالج سے گریجویٹ ہونے والے ندا نے چھوٹی عمر سے ہی لکھنا شروع کردیا تھا۔ انھوں نے اپنا قلمی نام ندا فاضلی رکھا تھا۔ ان کے اجداد کا تعلق کشمیر سے بتایا جاتا ہے جہاں سے آکر ان کے آبا دہلی میں بس گئے تھے۔ ان کے والد بھی اردو کے شاعر تھے۔ تقسیم ہند کے بعد ان کے والدین اور خاندان کے لوگ پاکستان چلے گئے، لیکن ندا فاضلی نے ہندوستان میں رہنے کو ترجیح دی۔ ندا فاضلی عوام اور خواص دونوں کے شاعر تھے۔ بچپن میں ندا ایک مندر سے بھجن کی آواز سن کر شاعری کی طرف مائل ہوئے۔ انسانیت کو انھوں نے اپنی شاعری کا محور بنایا۔ وہ مرزا اسداللہ خاں غالب اور میر تقی میر سے متاثر تھے، میرا اور کبیر سے بھی انھوں نے ذہنی استفادہ کیا۔ ایلیٹ، گوگول، اینٹن چیخوف (انتون چیخوف) اور ٹکاسا کی کو بھی خوب پڑھا اور اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کا اضافہ کیا۔

ابتدائی دنوں میں ندا فاضلی ملازمت کی تلاش میں ممبئی آئے اور جریدہ دھرم یگ اور بلٹز کے لیے کافی دنوں تک لکھتے رہے۔ انھوں نے اب تک 24 کتابیں لکھیں۔ مہاراشٹر حکومت کی جانب سے میر تقی ایوارڈ ملا۔ مختلف صوبائی حکومتوں کے ٹکسٹ بکس میں ان کی سوانح اور تخلیقات بھی ہیں۔ 'لفظوں کے پھول'، 'مور ناچ'، 'آنکھ اور خواب کے درمیان'، 'سفر میں دھوپ تو ہوگی'، 'کھویا ہوا سا کچھ'، 'دنیا ایک کھلونا ہے' مرحوم کی شاعری کے مقبول مجموعے ہیں۔ 2003 میں ندا فاضلی اسٹار اسکرین ایوارڈ برائے بہترین نغمہ نگاری (فلم سر) اور اسی سال بالی ووڈ مووی ایوارڈ (فلم 'سر') سے نوازے گئے۔ ان کی موت سے اردو دنیا میں غم کی لہر دوڑ گئی۔ وزیر اعظم مودی، سونیا سمیت متعدد سیاسی و ملکی سرکردہ شخصیات نے انھیں ہندوستانی ادب کا اہم ستارہ قرار دیتے ہوئے خراج عقیدت پیش کیے۔

روزنامہ تعمیر نیوز، دہلی، 9 فروری 2016

پروفیسر ایم عقیل الرحمن خاں

شاہجہاں پور: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر ایم عقیل الرحمن خاں کا طویل علالت کے بعد 24 جنوری 2016 کو انتقال ہوگیا۔ وہ 84 برس کے تھے۔ شہر کے محلہ بازوزئی اول واقع کوٹھی حسان باغ میں رہنے والے پروفیسر عقیل الرحمان نے 24 جنوری کو آخری سانس لی۔

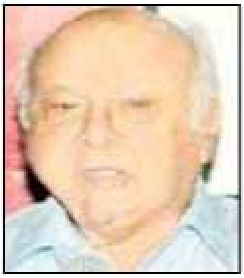

پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ ایک بیٹا عمیم رحمان خاں دو دو بیٹیاں پروفیسر راجہ خان و آسیہ خان ہیں۔ ملک کے سابق صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین کے داماد تھے۔ عقیل الرحمن اے ایم یو میں شعبہ سوئل کے پروفیسر تھے اور بعد میں کچھ مدت کے لیے ان کو اے ایم یو کے وائس چانسلر کے عہدہ پر فائز کیا گیا۔ وہ 1994 میں عہدہ سے سبکدوش ہوئے اور اپنے آبائی وطن آکر رہنے لگے۔ وہ اکثر علمی کانفرنسوں میں مدعو کیے جاتے تھے۔ اپنی منفرد سوچ اور انداز کے لیے وہ پہچانے جاتے تھے۔ پروفیسر عقیل الرحمن خاں کے انتقال پر پرمود چند سیٹھ، کشن ایل ڈی شکلا، پروفیسر شاہد حسن خاں، ڈاکٹر عقیل احمد، ڈاکٹر انور مسعود، ڈاکٹر یحییٰ ناصر، سید زبیر عبدالقادر، شاکر علی خاں، ڈاکٹر جی اے قادری، پروفیسر سید محمد نعمان نے پروفیسر خاں کی رحلت پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا۔

روزنامہ انقلاب، دہلی، 25 جنوری 2015

عابد سہیل

ممبئی: ممتاز افسانہ نگار اور صحافی عابد سہیل کا 26 جنوری 2016 کو ممبئی میں انتقال ہوگیا۔ ان کے جسد خاکی کو لکھنو لایا گیا۔ ان کی تدفین کپور تھلہ میں کی گئی۔ ان کے انتقال کی خبر سنتے ہی ادبی اور صحافتی دنیا میں غم کی لہر دوڑ گئی۔ ان کے انتقال سے اردو ایک اور مخلص جانثار سے محروم ہوگئی۔ عابد سہیل کی پیدائش 27 اکتوبر 1932 کو اورئی جالون میں ہوئی۔ انھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے فلاسفی میں ایم اے کیا۔ انھوں نے اپنا کریئر انگریزی روزنامہ نیشنل ہیرالڈ سے شروع کیا۔ ان کی اردو کی 15 کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں، جن میں کئی افسانوی مجموعے، ناول اور تنقیدی کتابیں شامل ہیں۔ ان میں ان کے مشہور ناول 'غلام گردش' اور 'سب سے چھوٹا غم' شامل ہیں۔ دہلی اردو اکادمی ان کو سوانح لکھنے کے لیے فیلوشپ بھی دے چکی ہے۔ اس کے علاوہ انھیں اردو اکادمی، میر اکادمی اور ہندوستان کے مختلف اردو اداروں سے اعزازات سے نوازا جاچکا ہے۔ یوپی جرنلسٹ ایسوسی ایشن کے علاوہ ترقی پسند ادیبوں کی ایسوسی ایشن کے وہ یوپی کے صدر رہ چکے ہیں۔

روزنامہ راشٹریہ سہارا، دہلی، 27 جنوری 2016

رویندر کالیا

نئی دہلی: ہندی کے معروف کہانی کار اور ہندوستانی گیان پیٹھ کے سابق ڈائرکٹر رویندر کالیا کا 9 جنوری 2016 گنگا رام سٹی اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ وہ 77 برس کے تھے۔ پسماندگان میں ان کی اہلیہ اور ہندی کی مشہور مصنفہ ممتا کالیا کے علاوہ دو بیٹے بھی ہیں۔ مسٹر کالیا کی آخری رسوم لودھی روڈ پر واقع کریمیٹوریم میں ادا کی گئی۔ 11 نومبر 1938 کو پنجاب کے جالندھر

میں پیدا ہوئے۔ مسٹر رویندر کالیا الہ آباد کو اپنا مسکن بنالیا تھا اور 60 کی دہائی میں دھرم یگ میگزین میں مشہور مصنف دھرم ویر بھارتی کے معاون بھی تھے۔ وہ کولکاتا سے شائع ہونے والے جریدے 'واگرتھ' کے مدیر بھی تھے۔ بعد میں وہ دہلی ہندوستانی گیان پیٹھ کے ڈائرکٹر اور گیانودے جریدے کے مدیر بن کر دہلی چلے آئے اور تب سے وہ یہیں رہنے لگے تھے۔ غریبی ہٹاؤ، غالب چھٹی شراب، کالا جنتر، نو سال چھوٹی پتنی، 17 رانڈے روڈ، اے بی سی ڈی وغیرہ ان کی مقبول تخلیقات تھیں۔ انھوں نے امرکانت اور موہن راکیش کی کہانیوں کے مجموعے بھی تیار کیے تھے۔ انھیں اترپردیش ہندی سنستھان کا ساہتیہ بھوشن اور لوہیا سمان اور پنجاب حکومت کا شرومنی سمان بھی ملا تھا۔ ہندوستانی گیان پیٹھ کے ڈائرکٹر لیلا دھر منڈلوئی، وبھوتی نارائن رائے، چتر ا مدگل، گیان رنجن، چترا مدگل، سدھا ارورا، اکھلیش سمیت کئی مصنفین نے ان کے انتقال پر گہرے دکھ کا اظہار کیا ہے۔

روزنامہ ہندوستان ایکسپریس، دہلی، 10 جنوری 2016

پدم شری سید حسن

کشن گنج: کشن گنج کی معروف عصری تعلیم گاہ انسان اسکول کے بانی و پدم شری اعزاز یافتہ سید حسن کا 25 جنوری 2016 کو کشن گنج میں انتقال ہوگیا۔ ان کی وفات پر تعزیت کا اظہار کرتے ہوئے معروف عالم دین اور کشن گنج کے ممبر پارلیمنٹ مولانا اسرارالحق قاسمی نے کہا کہ سید حسن صاحب نے کشن گنج میں تعلیم کو فروغ دینے کے لیے قابل قدر کوششیں کیں اور اس علاقے پر ان کے بڑے احسانات ہیں جنھیں فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ مولانا نے کہا کہ انسان اسکول کے ذریعے مرحوم سید حسن صاحب نے کشن گنج کے خطے میں ایک تعلیمی انقلاب برپا کیا اور اس کے ذریعے سے یہاں کے مسلمانوں کو تعلیمی میدان میں آگے بڑھنے کا سنہرا موقع حاصل ہوا۔ انھوں نے مزید کہا کہ وہ ایک مخلص، متواضع اور بااخلاق انسان بھی تھے۔ مختلف معاملوں میں ہم نے ایک دوسرے سے تبادلۂ خیال اور مشورے کیے اور ہم نے انھیں ہمیشہ کشن گنج کے علاقے کے پسماندہ مسلمانوں کی تعلیمی و سماجی ترقی کے لیے بہت ہی مخلص پایا۔ انھوں نے کہا کہ ان کی وفات سے کشن گنج ایک مخلص تعلیمی رہنما سے محروم ہوگیا ہے اور یہ خطہ بھر کے لیے ایک عظیم خسارہ ہے۔ واضح رہے کہ انسان اسکول کے بانی سربراہ پدم شری جناب سید حسن کی عمر 91 سال تھی، پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ تین بیٹے اور ایک بیٹی ہیں۔

روزنامہ تعمیر نیوز دہلی، 26 جنوری 2016

عثمان علی خاں شوق اثری

رامپور: دبستان رامپور کی ادبی وراثت کے امین اور روہیلہ روایات کے علمبردار ڈاکٹر عثمان علی خاں شوق اثری مختصر علالت کے بعد اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ 84 سالہ زندگی میں ڈاکٹر شوق اثری بحیثیت انسان عجز و انکسار کا پیکر تھے۔ ان کے حسن سلوک اور اخلاق و اخلاص کی لوگ مثالیں دیا کرتے تھے۔ مرحوم شوق اثری علامہ ابراحسنی گنوری کے شاگرد تھے۔ انھوں نے تقریباً 70 سال تک عروس غزل کے گیسو سنوارنے کی ادبی خدمات انجام دیں۔ ہندوستان اور برصغیر کے دیگر ممالک میں ان کے سیکڑوں شاگرد ہیں۔ مرحوم شوق اثری کی غزلوں، نظموں، قطعات و رباعیات اور مضامین پر مشتمل متعدد مجموعات شائع ہو چکے ہیں جن میں فاصلے، زاویے نحو، بازگشت، تصویریں، بولتے لمحے، سخی صدیاں اور مختر کہ

قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے سنجیدہ شاعری کے علاوہ طنز و ظرافت سے بھرپور نظمیں اور قطعات بھی لکھے۔ ان کے انتقال سے ادبی دنیا کو ناقابل تلافی خسارہ ہوا ہے۔ نماز جنازہ میں دنیائے شعر و ادب کے ارباب کے علاوہ ہر مکتبہ فکر کے ہزاروں لوگ شریک تھے۔ خراج عقیدت پیش کرنے والوں میں غیر مسلموں کی تعداد بھی کافی تھی۔

روزنامہ جدید خبر دہلی، 6 جنوری 2016

شرف رحمانی گنوری

گنور: اردو کے کہنہ مشق اور بزرگ شاعر شرف رحمانی گنوری مختصر علالت کے بعد 10 جنوری 2016 رحلت فرما گئے۔ مرحوم یکم جولائی 1916 کو گنور، ضلع بدایوں میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام عبدالحلیم تھا۔ چودہ سال کی عمر میں شاعری شروع کی۔ اپنے عہد کے مشہور استاد اور خاندان داغ دہلوی سے تعلق رکھنے والے شاعر علامہ ابراحسنی گنوری سے اصلاح لینی شروع

کی۔ گھر کے ادبی ماحول نے جلا بخشی۔ معروف شاعر اور ناقد ڈاکٹر سیفی پریمی ان کے بھائی تھے۔ دہلی میں مقیم مشہور شاعرہ مسعود حیات ان کی چھوٹی بہن تھیں۔ نوے کی دہائی تک شرف رحمانی مسلسل مشاعروں میں اپنے ترنم سے سامعین کو محظوظ کرتے رہے۔ وہ گنور کے اسلامیہ اردو میڈیم پرائمری اسکول میں درس و تدریس سے وابستہ رہے جہاں متعدد طلبا نے ان سے استفادہ کیا، جن میں نامور ادیب اور شاعر پروفیسر ابن کنول، ڈاکٹر اسلم حنیف، ڈاکٹر الیاس نوید، پروفیسر عبدالعلیم قابل ذکر ہیں۔

روزنامہ انقلاب دہلی، 11 جنوری 2016

سید عبدالعظیم

حیدرآباد: معارف شاعر، وکی پیڈیا کے انڈیا ہیڈ جناب نثار احمد صاحب پونے کے والد محترم اردو کے کہنہ مشق اور بزرگ شاعر سید عبدالعظیم ولد حضرت عبدالرؤف کا مختصر علالت کے بعد 11 جنوری 2016 کو انتقال ہوگیا، مرحوم 85 برس کے تھے۔ معارف شاعر سید عبدالعظیم کے انتقال کی خبر ملتے ہی پورے علاقے میں غم کی لہر دوڑ گئی۔ سید عبدالعظیم انتہائی منکسر المزاج اور زندہ دل انسان

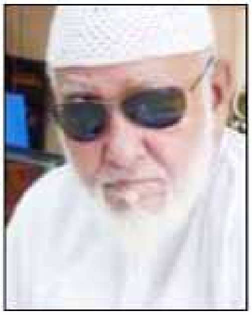

تھے۔ اور ہر خاص و عام سے انتہائی خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے۔ یکم ستمبر 1930 میں ضلع چتور کے مرپالا گاؤں میں پیدائش ہوئی۔ والد محترم حضرت عبدالرؤف، ایک دانشور، مذہبی اور ادبی شخصیت مانے جاتے تھے۔ عبدالعظیم صاحب کی تعلیم گرمکنڈہ، مدراس، کرنول، اور تروپتی میں ہوئی۔ سید عبدالعظیم صاحب بحیثیت اردو مدرس ضلع چتور میں ان کے معاصرین میں جانے پہچانے جاتے ہیں۔ انھیں کی کاوشوں سے ضلع کے مختلف علاقوں میں اردو ادب کا ماحول پھلا پھولا۔ ان کے کئی مضامین اور شاعری ہندوستان کے مختلف رسائل، جرائد اور اخبارات میں شائع ہو چکی ہیں۔

اس موقعے پر دہلی کے معارف شاعر جناب احمد علی برقی اعظمی نے سید عبدالعظیم کی موت پر گہرے دکھ کا اظہار کیا اور کہا کہ مرحوم صوم و صلوٰۃ کے انتہائی پابند اور تلاوت کلام اللہ سے بے حد شغف رکھنے والے دیندار اور نیک سیرت انسان تھے۔ اور معارف شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ ان کی لکھی دو کتابیں، 'ضلع چتور کی اسلامی تاریخ' اور 'اسرار عظیم' مجموعہ شاعری کا حال ہی میں اجرا عمل میں آیا تھا۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر محمد رؤف ڈیلی حیدرآباد، 12 جنوری 2016

خراج عقیدت:

انتظار حسین کے سانحہ ارتحال پر خراج عقیدت

نئی دہلی: عظیم فکشن نگار انتظار حسین کے انتقال پر ملال پر پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اظہار تعزیت کرتے ہوئے کہا کہ انتظار حسین کا انتقال ایک معمولی واقعہ نہیں۔ وہ شہاب ثاقب کی طرح اردو ادب کے آسمان پر ایک اَن مٹ روشن لکیر چھوڑ گئے۔ اب جیسا ہمہ جہت ادیب اور فکشن نگار صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ انھوں نے کوثر و تسنیم اور گنگا جمنا میں دُھلی ہوئی اردو سے ایک ایسی تخلیقی اور تمثیلی زبان وضع کی اور داستانی اسلوب کی بازیافت کرکے ایک ایسا تخلیقی محاورہ خلق کیا جس سے ان کا انفراد ہمیشہ کے لیے قائم ہوگیا۔ اردو کے ممتاز نقاد پروفیسر نارنگ نے یہ بھی کہا کہ بیسویں صدی کا نصف دوم بیدی،

منٹو، کرشن چندر اور عصمت چغتائی کے گزر جانے کے بعد جس طرح ہندوستان میں قرۃ العین حیدر سے منسوب کیا جاسکتا ہے اسی طرح پاکستان میں انتظار حسین نے تاریخ و تہذیب کے نشیب و فراز سے ایک نہایت مشکل عہد کی ترجمانی کی جس کا عکس بیسویں صدی پر محیط ہے۔ انتظار حسین کے پائے کا کوئی دوسرا ادیب فکشن میں دور دور تک نظر نہیں آتا۔ فیض، ناصر کاظمی اور منیر نیازی کے بعد تاریخ پر انھوں نے جو روشن نشان چھوڑے ہیں ان کو فکشن کے ایک ایسے منفرد عہد سے تعبیر کیا جاسکتا ہے جس کی ہمسری کوئی دوسرا مشکل ہی سے کرسکے گا۔ پروفیسر نارنگ نے کہا کہ انتظار حسین کو ساہتیہ اکادمی نے پریم چند صدی کے موقعے پر 'پریم چند فیلوشپ' عطا کیا تھا، سے ان کا ہمیشہ گہرا رشتہ رہا ہے۔ وہ بلند پایہ ادیب کے ساتھ ایک عظیم انسان بھی تھے اور برصغیر کی تہذیب و ثقافت کے امین بھی۔ ان کا انتقال اردو کے لیے ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔

روزنامہ صحافت' دہلی، 4 فروری 2016

سید ظہیر زیدی

نئی دہلی: حسن آرا ٹرسٹ کے صدر سید ظہیر زیدی کے انتقال پر غالب اکادمی بستی حضرت نظام الدین اولیا میں تعزیتی مجلس 'یاد میں ظہیر زیدی' برائے ایصال ثواب کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر ادیب و دانشور، سیاست داں، صحافی اور علمائے کرام نے ان کی خدمات پر روشنی ڈالی۔ پروگرام کا باضابطہ آغاز تلاوت کلام پاک سے سلیم امروہوی نے کیا، مرثیہ سفیر مرزا امیر حسن عامر نے پیش کیے۔ سابق وزیر اعلیٰ شیلا دکشت نے کہا کہ وہ ادب اور ثقافت کے پارکھ تھے، ان کے اندر انسانیت کا درد تھا جو انھیں ہر دم بے چین رکھتا تھا۔ دہلی کے سابق گورنر نجیب جنگ نے کہا کہ وہ صوفی کردار کے حامل تھے۔ پرسار بھارتی کے جوائنٹ ڈائرکٹر مسٹر گھری نے کہا کہ ان کے جانے سے ادب و ثقافت کا بہت بڑا خسارہ ہوا ہے۔ پروفیسر اختر الواسع نے بھی اس موقعے پر خراج عقیدت پیش کیا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر سید رضا حیدر نے کہا کہ ظہیر زیدی انسانیت کو توڑنے کے دور میں انھوں نے انسانیت کو جوڑنے کا کام کیا تھا جو اہمیت کی بات ہے۔ حسن آرا ٹرسٹ کے اکیڈمک کمیٹی کے چیئرمین سید ناصر علی نے کہا کہ انھوں نے ملک سے لے کر مذہب کے مفاد کی بات کی کسی بھی پہلو میں انھوں نے کبھی بھی تفریق نہیں کی تھی۔ سید حیدر کمال نے کہا کہ حسن آرا ٹرسٹ کے پہلے صدر علی سردار جعفری، دوسرے ریئس مرزا اور تیسرے سید ظہیر زیدی یہ تینوں شخصیات ادب و ثقافت کی پارکھ تھیں جس سے حسن آرا ٹرسٹ کو بہت زیادہ فائدہ ہوا۔ اخیر میں مولانا غلام حسین رضوی ہاوری نے مجلس پڑھی جنھوں نے اپنے خطاب میں پیغمبر اسلام اور ائمہ کرام کے اقوال پیش کرتے ہوئے کہ موت اللہ اور بندے کے درمیان سے پردہ اٹھ جانے کا نام ہے۔ ہمیں کسی بھی پریشانی پر آبدیدہ اور غم زدہ نہیں ہونا چاہیے۔ اس موقعے پر بڑی تعداد میں گورنمنٹ کے افسران، مختلف مسالک کے علما اور دانشور موجود تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 25 جنوری 2016

ساغر برنی کے انتقال پر تعزیتی نشست

میرٹھ: شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کے پریم چند سیمینار ہال میں معروف ناقد و افسانہ نگار پروفیسر ساغر برنی کی یاد میں ایک تعزیتی جلسے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے

کی۔ جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر آصف علی نے انجام دیا۔ نشست کا آغاز مولانا جبرئیل کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ فرح ناز نے نعت، محمد صادق نے اپنی خوبصورت آواز میں ایک مرثیہ پیش کیا۔ بعد ازاں مقررین نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر شاداب علیم نے پروفیسر ساغر برنی کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر ساغر برنی اردو فکشن و ادب کا ایک بہت بڑا نام ہے۔ آپ کے بہت اچھے تنقیدی مضامین مختلف رسائل و جرائد کی زینت بن چکے ہیں۔ ڈاکٹر آصف علی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر ساغر برنی اپنی انسان دوستی اور اپنے ادبی کارناموں سے ایک طویل عرصے تک نوجوان نسل کے دلوں میں زندہ رہیں گے۔ یوں تو انھوں نے بہت سے مضامین لکھے ہیں لیکن خاص طور پر ان کی پی ایچ ڈی کا مقالہ 'جدید اردو افسانوی تجزیے' قابل تعریف ہے۔

اس موقعے پر پروفیسر ساغر برنی کی صاحب زادی ہاشمی خانم (دہلی) نے اپنے والد کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ میرے والد اچھے ادیب و ناقد ہونے کے ساتھ ساتھ بہت ہی اچھے، سچے اور زندہ دل انسان تھے۔ وہ میرے آئیڈیل اور ہیرو تھے۔ اپنے صدارتی خطبے میں ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ پروفیسر ساغر برنی اردو فکشن کے اچھے ناقد تھے۔ انھوں نے افسانے اور ناول پر معیاری تنقید کی۔ ان کے مضامین متعدد رسائل و جرائد میں شائع ہوئے۔ وہ جمشید پور کے ادبی منظرنامے کا ایک اہم نام تھے۔ انھوں نے 'ادبی چوپال' کے صدر کی حیثیت سے بڑی خدمات انجام دیں۔ اس موقعے پر ڈاکٹر نعیم صدیقی، بھارت بھوشن شرما، اہل شرما، ذیشان خان، آفاق خان، سلیم سیفی، جاوید اختر، شبستان پروین، فرح ناز، روزی، فرحانہ سمیت دیگر طلبا و طالبات نے شرکت کی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، یکم فروری 2016

خواجہ تسنیم منصور

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ سنی دینیات کی سابق سربراہ ڈاکٹر تسنیم منصور کے سانحۂ ارتحال پر دینیات فیکلٹی میں منعقدہ تعزیتی نشست میں دینیات فیکلٹی کے ڈین اور شیعہ دینیات شعبہ کے سربراہ پروفیسر علی نقوی، شعبۂ سنی دینیات کے سربراہ پروفیسر مسعود عالم قاسمی، فیکلٹی کے جملہ اساتذہ، طلبا و طالبات اور غیر تدریسی عملہ نے شرکت کرکے مرحومہ کے انتقال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرنے کے ساتھ ان کی مغفرت کے لیے دعا کی۔ تعزیتی نشست کا آغاز ریسرچ اسکالر محمد ساجد کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ شعبۂ سنی دینیات کے پروفیسر توقیر عالم فلاحی نے مرحومہ کے اخلاق حسنہ پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ وہ ہمیشہ غریبوں اور ضرورت مند طلبا کی مالی امداد کیا کرتی تھیں اور شعبہ کی سربراہ کی حیثیت سے انھوں نے اپنے فرائض کو بحسن و خوبی انجام دیا۔ ناظم سنی دینیات مولانا حبیب اللہ نے مرحومہ کے محاسن اور خوبیوں کا تذکرہ کیا۔ ڈاکٹر محمد سلیم نے مرحومہ کے حسن اخلاق کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ ان حقوق العباد کے تئیں ان کا رویہ نہایت قابل تعریف تھا وہ طلبا اور ضرورت مندوں کی ہمیشہ مدد کیا کرتی تھیں۔ پروفیسر عبدالخالق نے بھی مرحومہ کو خراج عقیدت پیش کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 23 جنوری 2016

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

تذکرۂ شورش

مصنف: غلام حسین شورش
مرتب: ڈاکٹر محمود الٰہی
مترجم: محمد عاصم اعظمی
صفحات: 450، قیمت: 198 روپے

تاریخ شاہجہاں

مصنف: بنارسی پرشاد سکسینہ
صفحات: 466
قیمت: 197 روپے

مولانا ابوالکلام آزاد: ایک مطالعہ

مرتب: پروفیسر عبدالستار دلوی
صفحات: 474
قیمت: 216 روپے

اردو کی کہانی

مصنف: سید احتشام حسین
صفحات: 104
قیمت: 125 روپے

نورتن کی کہانیاں

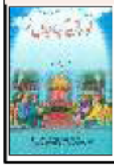

انتخاب: شمیم احمد
صفحات: 155
قیمت: -/37 روپے

اردو میں لسانی تحقیق

مصنف: پروفیسر عبدالستار دلوی
صفحات: 433
قیمت: -/193 روپے

ترقی پسند اور ان کے معاصر پینٹر

مصنف: زبیر رضوی
صفحات: 247
قیمت: -/126 روپے

اسالیب

مصنف: عتیق اللہ
صفحات: 376
قیمت: -/166 روپے

کمالِ داغ (مع مقدمہ تنقیدی)

مصنف: حامد حسن قادری
صفحات: 230
قیمت: -/117 روپے

مغلیہ سلطنت کا عروج و زوال

مصنف: آر پی ترپاٹھی
مترجم: ریاض احمد خاں شروانی
صفحات: 543
قیمت: 242 روپے

ہمارا طرزِ زندگی اور بیماریاں

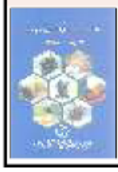

مصنف: ڈاکٹر جاوید احمد سعیدی کامٹوی
صفحات: 69
قیمت: -/42 روپے

معالجات (جلد اول، دوم، سوم چہارم)

مصنف: وسیم احمد اعظمی
صفحات: 2273 (مکمل سیٹ)
قیمت: 613 روپے (مکمل سیٹ)

انیس کے سلام

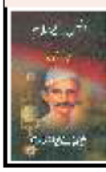

مرتب: علی جواد زیدی
صفحات: 307
قیمت: 113 روپے

ہند کی مایۂ ناز ہستیاں و دیگر مضامین

مصنف: بی شیخ علی
صفحات: 176
قیمت: -/35 روپے

شرارِ جستجو

مصنف: قیصر ضحیٰ عالم
صفحات: 125
قیمت: -/80 روپے

کاشف الحقائق

مصنفہ: سید امداد امام اثر
مرتبہ: ڈاکٹر وہاب اشرفی
صفحات: 740
قیمت: 305 روپے

فضائی آلودگی

مصنف: ڈاکٹر رفیع الدین ناصر
صفحات: 179
قیمت: -/108 روپے

پیسے کی کہانی

مصنف: غلام حیدر
صفحات: 80
قیمت: -/22 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

URDU DUNIYA Monthly, March-2016, Vol.18, Issue:03
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2014-16
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication24/02/2016
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

عالمی اردو کانفرنس کی تصویری جھلکیاں

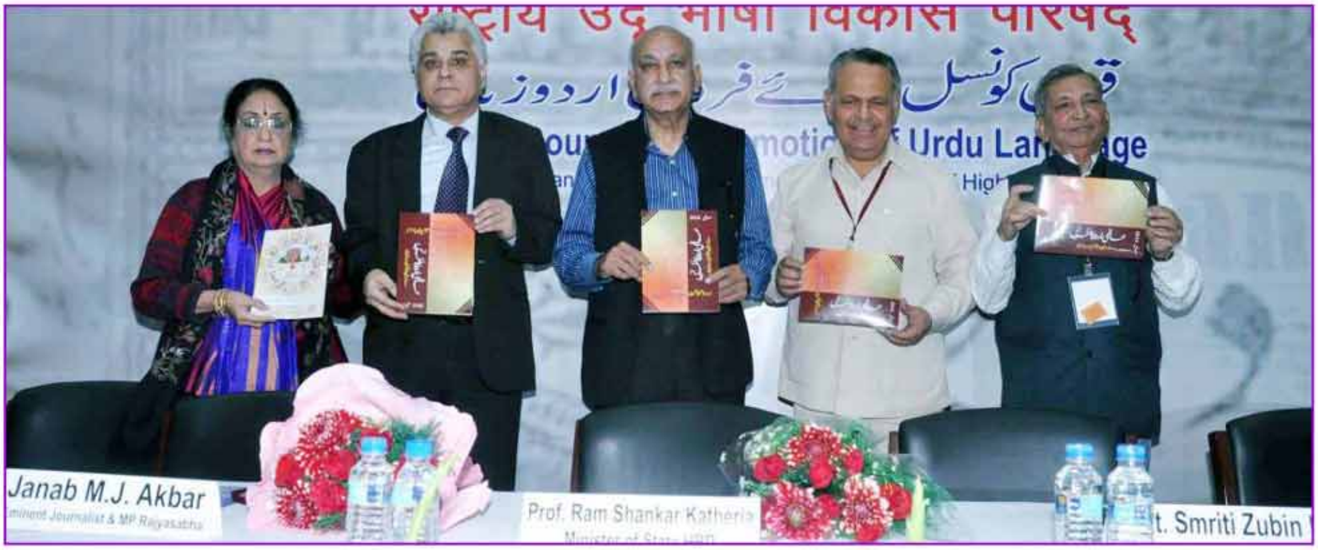

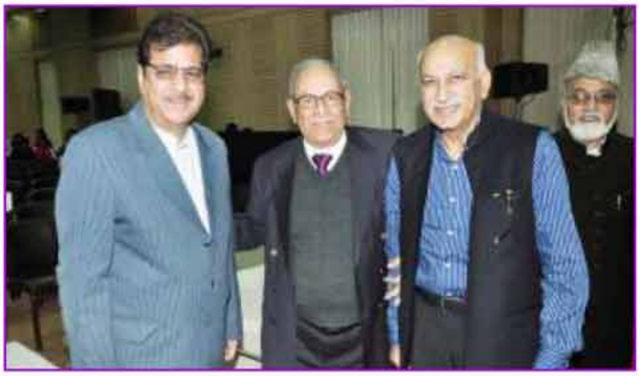

Printed and Published by Prof. Syed Ali Karim, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025